c/o
The Musavvir weekly
new Nagpada Bombay 8.

نوادراتِ منٹو

مرتب
محمد سعید

نوادراتِ منٹو

(سعادت حسن منٹو کی غیر مدوّن تحریریں)

مرتب: محمد سعید

معاونین: شمشیر حیدر۔ محمد نوید

ادارہ فروغِ مطالعہ، لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر ا
مئی ۲۰۰۹ء

نام کتاب: نوادرات منٹو
مصنف: سعادت حسن منٹو
مرتب: محمد سعید
سرورق: رضا زیدی
ناشر: ادارہ فروغ مطالعہ
اہتمام: محمد نعیم، محمد ہارون عثمانی
مطبع: طیب اقبال پرنٹرز، ۱۷-بی رائل پارک، لاہور
تعداد اشاعت: ۵۰۰
صفحات: ۳۹۰
قیمت: ۴۰۰ روپے

برائے رابطہ:

اداہ فروغ مطالعہ
۸۳۵-بلاک جے-ٹو-محمد علی جوہر ٹاؤن، لاہور، پاکستان
فون: ۰۴۲-۵۳۱۵۲۷۹
ای میل: haroonusmani@gmail.com

انتساب

نصرت منٹو

(محمد سعید)

سرمد صہبائی

(شمشیر حیدر)

اور

اصغر ندیم سیّد

(محمد نوید)

کے

نام

فہرست مُندرجات

منٹو کی غیر مدوّن طبع زاد تحریریں

ا۔ خودنوشت

ب۔ افسانے

ج۔ مضامین

() پاکستانی ادب:

0 روسی ادب:

() فرانسیسی ادب:

منٹو کے غیر مدوّن تراجم

ا۔ افسانے

مقدمہ

بیسویں صدی اُردو تحقیق و تدوین کے آغاز و ارتقا کی صدی ہے۔ اِن سو برسوں میں اُردو تحقیق کی ایک مضبوط روایت اکیسویں صدی کو ورثے میں ملی لیکن اس پچھلی صدی کی تحقیق نے زیادہ تر اپنے سے پچھلی صدیوں کو نوازا ہے۔ اس دوران میں ہونے والی تحقیقی فتوحات کا دائرہ کار اُردو زبان اور اس کا کلاسیکی ادب رہا ہے۔ اس طرح ادبی تحقیق و تدوین کے حوالے سے خود بیسویں صدی نے اپنے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہی رہی ہے کہ ہمارے ہاں تحقیق کو تو کسی قدر فروغ ملا لیکن تحقیقی مزاج ترقی نہیں پا سکا۔ ہم ابھی تک اہم اور غیر اہم کے پھیر سے نہیں نکل سکے یا نہیں نکلنا چاہتے۔ حالانکہ تحقیق تو ایک معروضی اندازِ نظر ہے۔ اس کا جو بھی موضوع ہو، اہمیت و وقعت سے قطع نظر اس پر یکساں اور سائنٹیفک طریقے سے دادِ تحقیق دینی چاہیے۔ جب کسی کم اہم موضوع کو اس قابل سمجھا جا رہا ہے کہ اس پر تحقیق کی جائے تو اس تحقیق میں پیش کش کا وہ انداز اور معیار برقرار رکھنے میں کیا قباحت ہے جو کسی اہم موضوع یا شخصیت کے بارے میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اہم موضوع پر معلومات چوں کہ پہلے سے موجود ہوتی ہیں تو ان سے اپنے تحقیقی مقالے کا پیٹ بھر لیا جاتا ہے لیکن جس موضوع پر معلومات نہیں ملتیں اور اُسے موضوعِ تحقیق بھی بنایا جا چکا ہے تو اس کے بارے میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ موضوع اتنا اہم نہیں تھا کہ اس پر اس قدر محنت کی جاتی۔ محنت و ریاضت سے گریز پائی کے علاوہ اس روّیے کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔

دوسری قابلِ رحم صورت تنقید کی ہے کہ نقاد حضرات کسی موضوع یا شخص کی منتخب اور نمائندہ تحریروں کو

بنیاد بنا کر تنقید کی عمارت تعمیر کر ڈالتے ہیں۔ اس کوشش کو معیوب اور کارِ بے کار سمجھا جاتا ہے کہ پہلے اپنے موضوع سے متعلق جملہ مواد فراہم کیا جائے۔ بیسویں صدی کی بڑی سے بڑی ادبی شخصیت کے بارے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی جملہ مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تحریریں صحتِ متن کے ساتھ ان کے کلیات کی زینت بن چکی ہیں۔ اس عدم توجہی کا بڑا سبب یقیناً وسائل کی عدم موجودگی بھی ہے لیکن مجموعی طور پر معاشرے کا تحقیقی مزاج کا حامل نہ ہونا بھی اس بے نیازی کا ایک بڑا محرک ہے۔

سعادت حسن منٹو اُردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں لیکن ابھی تک انہیں سنجیدگی سے تحقیق کا موضوع نہیں بنایا گیا۔ کہنے کو تو پاک و ہند کے کئی اداروں نے منٹو کے کلیات یا کلیاتی مجموعے بھی چھاپ دیے ہیں لیکن ابھی تک اِن کی متعدد غیر مدوّن تحریریں معاصر اخبارات و رسائل کے اوراق میں دفن ہیں۔ ابھی پچھلے برس ادارہ نگارشات نے ''باقیاتِ منٹو'' کے نام سے ایک ''شاہکار'' شائع کیا ہے جس کے سرورق پر یہ جملہ درج ہے ''غیر مطبوعہ افسانے جو پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔'' اس کے مرتب خالد ارمان ''منٹو کے ذہنی سفر'' کو بیان کرتے ہوئے کتاب کے شروع میں ان تحریروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کے پہلے حصے میں سعادت حسن منٹو کے ۹ ایسے گرانقدر اور نایاب افسانے شامل ہیں، جن سے اردو ادب کے قارئین آج تک محروم رہے ہیں۔ یہ افسانے پہلی بار اس کتاب کے ذریعے اردو زبان کے مطبوعہ افسانوی ادب کا حصہ بن رہے ہیں۔۔۔۔۔ آئندہ صفحات اس بات کی ضمانت ہیں کہ ہم منٹو کے بلند پایہ افسانوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد کو دریافت کر کے ہمیشہ کے لیے اس کتاب کی صورت میں محفوظ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔'' (ص: ۱۵۔۱۶)

مرتب یا پبلشر کی یہ رائے اس کتاب میں تقریباً دس بار دہرائی گئی ہے۔ جیسے خود انہیں یقین نہیں کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ یہ تمام افسانے سنگِ میل کے شائع کردہ مجموعوں میں شامل ہیں اور کم از کم آٹھ دس برسوں سے تو ہر خاص و عام ان کو پڑھ رہا ہے۔ خیر اس بات پر حیرت ہے نہ افسوس کہ منٹو کے ساتھ بارہا ایسا ہو چکا ہے۔ ہم اس کتاب پر وقت ضائع کیے بغیر آگے بڑھتے ہیں۔

منٹو کی تحریروں کو کلیات کی صورت میں پہلے پہل ۱۹۹۰ء میں لاہور کے ایک اشاعتی ادارے سنگِ میل نے ضخیم جلدوں میں شائع کرنا شروع کیا جو بالترتیب منٹو نامہ، منٹو راما، منٹو نما، منٹو کہانیاں، اور منٹو

ڈرامے کے نام سے شائع ہوئیں۔ چھٹی جلد کے طور پر اس ادارے نے ۱۹۹۸ء میں ''منٹو باقیات'' بھی چھاپ ڈالی۔ یہ مجموعے بجائے خود تو تحقیق و تنقید کا موضوع بن سکتے ہیں لیکن ان میں پیش کردہ متن کی بنیاد پر منٹو کے بارے میں کسی بھی طرح کی تحقیق و تنقید معتبر نہیں ہو سکتی۔ اسے تحقیقی متن نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں ترتیب و تدوین کا کوئی بھی مناسب طریق نہیں اپنایا گیا اور نہ صحت متن پر ہی توجہ دی گئی ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر صرف تحقیقی و تنقیدی گمراہیوں کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ ان چھے مجموعوں کی جمع و ترتیب کے لیے اس اشاعتی ادارے نے کسی ریسرچ اسکالر پر بھروسا کرنا گوارا نہیں کیا۔ اس کے باوجود ادارہ سنگِ میل کو یہ اعزاز ضرور حاصل ہے کہ اس نے پہلی بار منٹو کی زیادہ سے زیادہ تحریروں کو کلیات کی صورت میں شائع کر کے منٹو کے قارئین کے حلقے کو وسیع کیا۔

منٹو کی وفات کے پچاسویں برس لاہور ہی سے ایک اور اشاعتی ادارے نے بھی سنگِ میل کی اشاعتوں کو دہرا دیا ہے۔ ان کے علاوہ منٹو کی پچاسویں برسی کی مناسبت سے ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے مرتب کردہ ''کلیات منٹو'' کی چھے جلدیں ۲۰۰۵ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئیں۔ پہلی تین جلدوں میں افسانے ہیں۔ باقی تین میں، ڈرامے، مضامین اور خاکے، الگ الگ جلد کے طور پر ہیں۔ افسانوں کی تینوں جلدوں کے شروع میں پروفیسر وہاب اشرفی کا منٹو کے افسانوں پر تنقیدی مضمون بطور ''مقدمہ'' شامل ہے۔ پھر کلیات کے مرتب ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا پیش لفظ اور منٹو کے کوائف و کتابیات پر مشتمل مرتب ہی کا تیار کردہ ''منٹو نامہ'' ہے۔ تینوں جلدوں میں ان تینوں تحریروں کا ایک ہی متن دہرایا گیا ہے۔ ڈرامے، مضامین اور خاکے، کی جلدوں میں موضوع کی مناسبت سے الگ الگ مرتب کا مقدمہ ہے اور منٹو کے خاکوں کی جلد کے شروع میں مرتب کے مقدمے سے پہلے پروفیسر وہاب اشرفی کی دو صفحات کی ''تقریب'' بھی ہے۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے کلیات منٹو کی ترتیب میں یہ اہتمام کیا ہے کہ ہر نوع کی تحریروں کو الگ الگ جلد میں الفبائی ترتیب سے شامل کیا ہے اور ہر جلد کے آخر میں (افسانوں میں ہر حرف کے تحت آنے والی تحریریں ختم ہونے پر) ہر تحریر کے ماخذ کی فہرست مع سنین بھی درج کی ہے۔ اسی فہرست میں نام بدل کر شائع ہونے والی بعض تحریروں کی نشاندہی بھی ساتھ ساتھ کر دی گئی ہے۔

کسی تخلیق کار کی تحریروں پر مشتمل کلیات کو الفبائی ترتیب سے مرتب کرنا بھی ایک منفرد طریقِ ترتیب ہو سکتا ہے لیکن معنوی لحاظ سے یہ کچھ اہمیت نہیں رکھا۔ پھر یہ کہ منٹو کی ''سیاہ حاشیے'' کو بھی انہوں

نے ٹکرے ٹکرے کر کے اپنی مجوزہ ترتیب کے مطابق افسانوں کی تین جلدوں میں بکھیر دیا ہے۔ اس طرح منٹو کی کتاب ''سیاہ حاشیے'' ان کلیات میں گم ہو کر رہ گئی ہے اور اس کا وہ معنوی تاثر اور موضوعی تخصیص بالکل ختم ہو گئی ہے جو لکھتے وقت منٹو کے پیش نظر تھی۔ کلیاتِ منٹو کی ترتیب میں، منٹو کی زندگی میں چھپنے والے مجموعوں کی ترتیب سے انحراف کی صرف ایک احسن صورت ہو سکتی ہے کہ ہر صنف کی تحریروں کو زمانی ترتیب سے مرتب کیا جائے۔ اس میں بھی ''سیاہ حاشیے'' کو الگ نمائندگی دیتے ہوئے یک جا شائع کیا جائے۔ قارئین کی سہولت کے لیے آخر میں الفبائی ترتیب سے صنف وار تمام تحریروں کا اشاریہ دیا جا سکتا ہے۔ ایسے اشاریے پر مبنی چند صفحوں سے یہ معمولی مقصد حاصل ہو سکتا تھا جس کے لیے ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے کلیاتِ منٹو کو معنوی انتشار کا نمونہ بنا دیا ہے۔ ان کلیات میں پیش کردہ متن کے بارے میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا کہنا ہے کہ:

> ''سب سے پہلا کام میں نے متون کے موازنے کے سلسلے میں کیا یعنی اگر ایک ہی تخلیق کے کئی متون سامنے ہیں تو ان کی اختلافی صورتوں کی تفہیم کرتے ہوئے قابل ترجیح متن کو قابلِ اشاعت مناسب جانا۔ اس سلسلے میں زبان کی غلطیوں کی طرف بھی توجہ کی اور ضروری اغلاط کی نشاندہی کرنے میں کہیں تساہل سے کام نہیں لیا۔'' (ص: ۳۰)

اس کام کو ''سب سے پہلے'' کرنے کی بجائے اگر وہ سب سے آخر میں بھی کر لیتے تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن اگر وہ ایسا کر سکتے۔ تمام جلدوں میں منٹو کی کسی تحریر یا جملے یا لفظ پر کسی طرح کے اختلافِ متن یا زبان کی غلطیوں کی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ اگر انہوں نے اپنے طور پر قابلِ ترجیح متن کا تعین کر کے پیش کیا ہے تو اِسے تحقیقی متن نہیں کہا جا سکتا اور نہ یہ منٹو کے سنجیدہ قاری کے لیے کسی طرح کی افادیت یا اہمیت رکھتا ہے۔ تاہم ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی منٹو سے محبت اور ان کی نیک نیتی پر شک نہ کرنا چاہیے، ممکن ہے انہوں نے اپنے اصل مسودات میں یہ قابل قدر کوشش کی ہو لیکن اشاعت کے وقت ایسے اختلافات یا اغلاط کی نشاندہی پر مبنی حواشی کو انہیں حذف کرنا پڑا ہو۔ اُردو تحقیق و تدوین میں اور بھی ایسی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں کہ مرتب بے چارا بڑی جانکاہی سے کسی متن پر مفید حواشی لکھتا ہے مگر وہ پبلشرز کی اشاعتی پالیسیوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے مختلف لائبریریوں کے اراکین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

''خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، گورنمنٹ اُردو لائبریری پٹنہ، اور نیشنل لائبریری کلکتہ

کے اراکین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے منٹو کی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تحریروں کی فراہمی میں تعاون دیا (کیا)''۔ (ص:۳۷)

منٹو کی تحریروں کو، اب تک وہ چھے جلدوں میں لے آئے ہیں۔ ان سب کے آخر میں مختلف تحریروں کے مآخذ پر مشتمل ''ببلیو گرافی'' میں کسی غیر مطبوعہ تحریر کا حوالہ نہیں ہے۔ افسانوں کی جلد میں اگر لکھا ہے کہ انھیں غیر مطبوعہ تحریریں (افسانے) فراہم ہوئیں تو ان تحریروں کو ان جلدوں میں آ جانا چاہیے تھا لیکن یہاں ایک بھی ایسا افسانہ نہیں جسے غیر مطبوعہ کہا جا سکے۔ البتہ ادارہ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور کے شائع کردہ منٹو کے کلیات کی نسبت ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے مرتبہ کلیاتِ منٹو میں، منٹو کے چار افسانے، پھوجا حرام دا، سرمہ، مہتاب خاں اور بیگم صاحبہ، اضافی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی غیر مطبوعہ کی ذیل میں نہیں آتا۔

قومی ادارہ برائے فروغِ زبانِ اُردو، نئی دہلی کے تحت ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے بھی ''کلیات منٹو'' مرتب کر کے شائع کرنا شروع کیے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی جلد ۲۰۰۶ء میں چھپی ہے۔ اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ منٹو کی زندگی میں چھپنے والے مجموعوں کی بنیاد پر زمانی ترتیب سے (مجموعے کی حیثیت اور اس کے مشمولات کی ترتیب کو برقرار رکھتے ہوئے) کلیات منٹو مرتب کر رہے ہیں۔ ان کی مرتب کردہ پہلی جلد میں منٹو کے پہلے تین افسانوی مجموعے آئے ہیں۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے ایک قابلِ ستائش کام یہ بھی کیا ہے کہ جو افسانے عنوان کی تبدیلی سے کسی مجموعے سے پہلے یا بعد میں کہیں چھپے ہیں تو ان کی وضاحت مکمل حوالے کے ساتھ حاشیے میں کر دی ہے۔

یوں تو ہر ادیب شاعر کی کل تخلیقات کو تحقیق و تدوین کے بعد کلیات کی صورت میں مرتب اور شائع کرنے کی روایت کو پختہ ہونا چاہیے لیکن منٹو جیسے شاندار اور جاندار افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، خاکہ نگار اور نقاد کے کلیات کو ترجیحی بنیادوں پر مرتب ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ''کلیات'' کے مفہوم اور تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے شعرا ادبا کے کلیات مرتب کر دیے جاتے ہیں۔ کلیاتِ منٹو بھی ابھی تک اسی بے نیازی سے مرتب ہوئے اور ہو رہے ہیں جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے تو منٹو کی تمام تحریروں کو جمع کیا جائے، اس کے بعد تحقیقی حواشی کے ساتھ انہیں زمانی ترتیب سے اور صحتِ متن کے ساتھ مرتب کیا جائے۔ زیرِ نظر تالیف ''نوادراتِ منٹو'' اس سلسلے کی ابتدائی کوشش ہے۔

منٹو اور محمد حسن عسکری کی ادارت میں نکلنے والے دو ماہی رسالے ''اُردو ادب'' پر ایک مضمون لکھنے کی غرض سے ۲۰۰۴ء میں جب میں مختلف پرانے رسائل دیکھ رہا تھا تو بعض جگہ منٹو کی چند ایسی تحریریں مثلاً نسبت، تماشاگاہِ نفس، سنگ تراش کا روز نامچہ اور گلاب کا پھول وغیرہ، نظر سے گزریں جو میرے لیے نئی تھیں۔ اپنے اطمینان کے لیے ادارہ سنگِ میل کے شائع کردہ منٹو کے مجموعوں میں انھیں ڈھونڈا تو واقعی وہ اِن میں شامل نہیں تھیں۔ اس سے یہ خیال پیدا ہو کہ منٹو کی ایسی غیر مدوّن، مزید تحریریں بھی ہو سکتی ہیں جو اُن کے مجموعوں میں نہیں آسکیں تو کیوں نہ ان سب کو تلاش کر کے ایک مجموعہ مرتّب کر دیا جائے۔ میں نے عزیزی شجر اور نوید کو ساتھ لے کر جب اس کام کو شروع کیا تو بہت سے اخبارات اور رسائل و جرائد نے اپنے درواکر دیے اور بڑی خوشی سے خوش آمدید کہا۔ منٹو کی تحریریں جو اوراق کے بوسیدہ کفن اوڑھے، دم سادھے دُبکی بیٹھی تھیں چیخ چیخ کر اپنی داستانِ الم سنانے لگیں۔ بعض نے معذرت خواہانہ انداز سے کہا کہ ہم سے تو یہ قیدِ تنہائی برداشت نہ ہوتی تھی لہٰذا ہم نام بدل کر ظاہر ہو چکی ہیں۔ اب ہم سے ملنا ہو تو فلاں نام سے فلاں مکان پر تشریف لائیے لیکن دستک دے کر۔ ہم نے بڑے ادب سے انھیں بھی منٹو کا سلام پیش کیا اور ساتھ چلنے کی درخواست کی جو انھوں نے قدرے تامّل کے بعد قبول کر لی۔ اس کے بعد منٹو شناسی کے ماہرین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کُرید کُرید کر پوچھا لیکن انھیں مسلسل خاموش پایا۔ بعض تو ٹس سے مس نہ ہوئے گویا منٹو سے ناراض ہو چکے ہیں البتہ دو ایک نے ہمت بندھائی۔ ڈاکٹر برج پریمی نے رسالہ ''ہمایوں'' کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر اور ''عالمگیر'' کے روسی ادب نمبر کا تفصیلی تعارف کروایا لیکن ملوایا نہیں۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے بھی منٹو کی چند تحریروں کا پتا بتایا۔

پاکستان میں منٹو پر پہلی پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کا اعزاز ڈاکٹر علی ثنا بخاری کو حاصل ہے۔ انھوں نے ایک پختہ کار اور سچے محقق کی طرح منٹو کی سوانح اور کتابیات پر دوسرے تمام منٹو شناسوں کی نسبت مفصّل اور معتبر تحقیق کی ہے۔ ان کا یہ مقالہ ۱۹۸۴ء میں مکمل ہوا اب ۲۰۰۶ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس کے ''حرفِ اوّل'' میں وہ لکھتے ہیں:

> ''مقالے کو کتابی شکل دیتے ہوئے میں بوجوہ اسے جوں کا توں شائع کر رہا ہوں۔ فی الحال مصلحت اسی میں تھی کہ میں اسے کسی اضافے کے بغیر شائع کرتا''۔ (ص:۵)

گویا اس مطبوعہ مقالے میں ۱۹۸۴ء تک کی معلومات موجود ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۸۶ء میں ان کا مرتّب کردہ ایک کتابچہ ''سعادت حسن منٹو (کتابیات)'' کے عنوان سے مقتدرہ قومی زبان نے شائع

کیا۔ یہ کتابچہ بعض تراميم اور اضافوں کے ساتھ ''منٹو کتابیات'' کے عنوان سے ماہنامہ ''انگارے'' کے ''منٹو سیمینار نمبر'' میں دسمبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ ''انگارے''، میں شامل ''منٹو کتابیات'' اب تک اس سلسلے کی اُن کی آخری کاوش ہے جس میں منٹو کی کتابیات یا ان کی غیر مدوّن تحریروں کے بارے میں ۲۰۰۵ء تک کی اُن کی معلومات درج اور شامل ہیں۔

زیرِ نظر تالیف ''نودراتِ منٹو'' میں منٹو کی ساٹھ تحریریں شامل ہیں۔ ان میں سے صرف چار تحریریں ایسی ہیں جن کا حوالہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری کی مذکورہ صدر کتب میں بھی آیا ہے۔ ''انگارے'' کے مذکورہ نمبر میں شامل ''منٹو کتابیات'' کے دو ذیلی عنوانات، ''متفرق افسانے'' اور ''متفرق مضامین'' کے تحت بخاری صاحب نے منٹو کی جن تحریروں کے نام دیے ہیں اُن میں سے دو افسانے ''کالی کلی'' اور ''سرمہ'' اور ایک مضمون ''پانچواں مقدمہ (۲)'' منٹو کی غیر مدوّن تحریروں کی ذیل میں آتے ہیں۔ منٹو کے ترجمہ شدہ ایک ڈرامے ''ریچھ'' کا حوالہ بخاری صاحب کے مقالے میں ''کتابیات'' کے تحت آیا ہے۔ گویا ان چار تحریروں کے علاوہ منٹو کی کوئی غیر مدوّن تحریر بخاری صاحب کے علم میں بھی نہ تھی، ورنہ ''انگارے'' کے مذکورہ شمارے کے اضافہ شدہ متعلقہ حصّے میں اس کا بھی اندراج ہو جاتا۔ اُن کے تحقیقی مقالے میں البتہ ''ہمایوں'' کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر اور ''عالمگیر'' کے روسی ادب نمبر کا ذکر ضرور آیا ہے لیکن ان میں شامل منٹو کے تراجم کی تفصیل نہیں دی گئی گویا یہ بھی ان کی دسترس میں نہ رہے ہوں گے ورنہ جہاں منٹو کے دیگر تراجم وغیرہ کا ذکر ہے وہاں ان کو بھی ضرور زیرِ بحث لاتے یا پھر ۲۰۰۵ء میں مرتّب کردہ ''منٹو کتابیات'' ہی میں اِن کی نشاندہی کر دیتے۔

ڈاکٹر علی ثنا بخاری کا موضوع منٹو کی تحقیقی سوانح مرتّب کرنا اور اُن کی تصانیف کا تحقیقی تعارف و تجزیہ تھا، وہ کوئی پچھلی ربع صدی سے منٹو کو تحقیق کا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ اُن کی مرتّب کردہ ''منٹو کتابیات'' کا تقاضا تو یہی تھا کہ جہاں منٹو کی دوسری مطبوعہ، غیر مدوّن اور غیر مطبوعہ تحریروں کی فہرست ہے وہاں دیگر اخبارات و رسائل سے بھی منٹو کی غیر مدوّن تحریروں کو تلاش کر کے اس میں شامل کیا جاتا لیکن شاید ان تمام تحریروں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی یا پھر انہوں نے تحقیق و تلاش کے اس کارِ دشوار کو اپنے موضوع کا حِصّہ نہیں سمجھا۔

ڈاکٹر برج پریمی کے دو مضامین ''سعادت حسن منٹو اور روسی ادب'' اور ''سعادت حسن منٹو اور فرانسیسی ادب'' سے ''ہمایوں'' اور ''عالمگیر'' کے مذکورہ خاص نمبروں میں شامل منٹو کے تراجم وغیرہ کی

تفصیل تو مل جاتی ہے لیکن ان کے علاوہ منٹو کے جو تراجم ہیں ان کے حوالے دو ایک کے علاوہ ان کے مذکورہ مضامین میں بھی نہیں آئے۔ یہ بات تو محض اس نوعیت کے اہم حوالے مل جانے کی تھی لیکن جب منٹو کی ان تحریروں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ''ہمایوں'' اور ''عالمگیر'' کے ان خاص نمبروں کی تلاش شروع کی تو قریب قریب ہر لائبریری کو اس سلسلے میں تہی دامن پایا بلکہ ان رسائل کے دیگر ایسے شمارے جن میں منٹو کی ابتدائی تحریریں اور تراجم کے حوالے ملتے ہیں ان کو بھی لائبریریوں سے غیر حاضر پایا۔ پنجاب پبلک لائبریری، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، دیال سنگھ لائبریری اور دارالسلام لائبریری میں ''ہمایوں'' کے بیشتر شمارے مل جاتے ہیں لیکن اتفاق کہ ان میں سے جن میں منٹو کی تحریریں شامل تھیں صرف وہی شمارے غائب تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی سرکاری افسر نے اپنے اختیارات کی دھونس جماتے ہوئے سرکاری لائبریریوں کو منٹو سے پاک کرنے کے لیے ''مشکوک'' رسالے اُٹھوا کر ''سرکار بُرد'' کر دیے ہیں یا پھر منٹو کے کسی ''عاشق صادق'' اور ''سچے محقق'' نے جاگیر منٹو پر قبضہ کیا ہے کہ کوئی ''غیر'' منٹو کی جاگیر کو ''نقصان'' نہ پہنچائے۔

''ہمایوں'' اور ''عالمگیر'' کے مذکورہ خاص نمبر واقعی عرصے سے کم یاب تھے اور ہیں۔ منٹو کے ایک سچے عاشق اور دیوانے پروفیسر سجاد شیخ نے ۷۔ مارچ ۱۹۷۹ء کو مولانا حامد علی خان کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

> ''ہمایوں کے ابتدائی زمانے کے کچھ شمارے ہمارے ہاں دستیاب نہیں۔ مجھے خاص طور پر فرانسیسی نمبر کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یہ کہیں سے بھی دستیاب نہیں ہو سکا۔ کیا آپ کے پاس ہے؟ اور عاریتاً مل سکتا ہے؟''

(مولانا حامد علی خان کے نام مشاہیر کے مکاتیب، ص: ۲۳۹۔۲۴۰)

یہ انھیں کبھی نہ ملا۔ ہمیں ''ہمایوں'' کے زیر بحث دونوں خاص نمبروں کی فوٹو کاپی عزیز گرامی طاہر عباس نے بیدل لائبریری کراچی سے لا کر دی لیکن یہ نقل اچھی اور صاف نہیں تھی بلکہ مجلد شماروں سے فوٹو کاپی بنواتے ہوئے، جس طرح صفحات ایک طرف سے سیاہ ہو جاتے ہیں، ان شماروں کی نقل کی یہی صورت رہی جس وجہ سے بیشتر صفحات کی ایک طرف سے متن پڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا کام رُک گیا۔ مزید تلاش پر پتا چلا کہ مولانا حامد علی خاں کے صاحبزادے زاہد علی خاں صاحب کے پاس مولانا کے زمانے کے ''ہمایوں'' کا پورا فائل موجود ہے۔ میں اور عزیزی نوید الحسن جب اُن کی خدمت میں حاضر

ہوئے تو انہوں نے کمال مہربانی سے ''ہمایوں'' کے مطلوبہ شماروں سے استفادے کی سہولت فراہم کی۔ اس کے بعد عزیزی شمشیر حیدر شجر اور میں اپنی اور پروفیسر سجاد شیخ کی طلب کے تبادلے کے لیے ان کے درِ دولت پر حاضر ہوئے کہ وہ ''ہمایوں'' کا اپنا مطلوبہ فرانسیسی ادب نمبر لے لیں اور ہمیں ''عالمگیر'' کا روسی ادب نمبر عنایت فرمائیں۔ مہینوں بعد اگلی نشت میں ان سے ''عالمگیر'' کی جو فوٹو کاپی ملی اس کے آخری بیس صفحے موجود نہیں تھے۔ کام پھر رُک گیا۔ بہت کوشش اور تلاش و جستجو کے بعد جاوید طفیل صاحب نے مسعود منہاس صاحب سے ''عالمگیر'' کا روسی ادب نمبر منگوا کر دیا تو ایک بڑی مشکل حل ہوگئی۔

منٹو نے پہلے ''ہمایوں'' کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر کی ترتیب میں مولانا حامد علی خاں کی معاونت کی، بعدازں ''عالمگیر'' کا روسی ادب نمبر مرتّب کیا۔ ڈاکٹر برج پریمی کے علاوہ ان دو رسالوں کے تین خاص نمبروں کے لیے، منٹو کی محنت و کاوش کے بارے میں مفصّل کسی نے نہیں لکھا جس سے شواہد کے ساتھ ثابت ہو کہ واقعی یہ خاص نمبر منٹو نے مرتّب کیے تھے۔ ذیل میں ان رسائل کے مدیران کے ایسے اعترافات کو درج کیا جاتا ہے جو منٹو کی علمی خدمت کا ثبوت ہیں۔

''ہمایوں'' کے روسی ادب نمبر کے آخری صفحات پر ''خاتمہ'' کے تحت لکھا ہے:

''چیخوف کی تصویر کے لیے ہم مسٹر سعادت حسن صاحب منٹو کے ممنون ہیں۔ مسٹر سعادت حسن نے روسی نمبر کے لیے مضامین لکھنے اور فراہم کرنے میں جو کام کیا ہے وہ اُن کی غیر معمولی اولوالعزمی اور محنت کشی کا شاہد ہے اور ہم اس کے لیے اُن کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے ہیں۔'' (ص:۴۳۳)

اس کے بعد اگلے منصوبے فرانسیسی ادب نمبر کے بارے میں لکھا ہے:

''ہمارا ارادہ ہے کہ عنقریب فرانسیسی ادب کے متعلق بھی ایک ایسا ہی خاص نمبر شائع کریں۔ سعادت حسن صاحب اس کے لیے مضامین فراہم کر رہے ہیں۔''

(ص:۴۳۳)

فرانسیسی ادب نمبر کے شروع میں ''بزم ہمایوں'' کے تحت یہ اعتراف ملتا ہے۔

''مسٹر سعادت حسن کے بالخصوص ممنون ہیں جنہوں نے اس پرچے کی ترتیب میں بہت دلچسپی لی اور اس کے لیے مضامین لکھے اور فراہم کرنے میں ہمیں قابل قدر مدد دی''۔

(ص:۶۵۵)

اسی طرح ''عالمگیر'' کے روسی ادب نمبر کی ترتیب میں بھی منٹو پیش پیش تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''ہمایوں'' کے نمبر مرتب کرنے میں اگر منٹو نے ایڈیٹر کی معاونت کی تو ''عالمگیر'' کا روسی نمبر خود منٹو نے مرتب کر کے دیا۔

روسی ادب سے منٹو کی دلچسپی اور تراجم کا ذکر کرنے کے بعد مظفر حسین شمیم ''عالمگیر'' کے روسی ادب نمبر کے ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں:

''ماہنامہ ہمایوں کے روسی ادب نمبر کی ترتیب و تدوین میں رسالہء مذکورہ کے لائق ایڈیٹر میرے عزیز دوست مولوی حامد علی خاں صاحب کا سب سے زیادہ مسٹر سعادت حسن منٹو ہی نے ہاتھ بٹایا تھا اور اب انہوں نے ''عالمگیر'' کا ایک روسی نمبر مرتب کیا ہے۔'' (ص:۳)

ایڈیٹر کی بجائے اس نمبر کو منٹو کا مرتب کرنا اس بات سے بھی ثابت ہے کہ اس کے صفحہ ۸۷ اور ۸۸ کے درمیان پورے صفحے پر منٹو کی خوبصورت تصویر ہے اور اس کے نیچے درج ذیل عبارت ہے:

''سعادت حسن منٹو: مصنف، آتش پارے۔ مترجم سرگزشتِ اسیر، روسی افسانے ترے وغیرہ مرتب روسی نمبر''

رسالے کے سرورق پر ایسے واضح اعتراف سے چونکہ مدیر کی حیثیت پر حرف آتا تھا اس لیے اندرونی صفحے پر یہ ذکر آیا ہے جو غنیمت ہے۔

ماہنامہ ''عالمگیر'' کے روسی ادب نمبر پر تاریخ اشاعت، جلد یا شمارہ نمبر درج نہیں لیکن اس کے داخلی شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مارچ، اپریل ۱۹۳۶ء کا شمارہ ہوگا۔ اس کے صفحہ ۱۱۳ پر عالمگیر بکڈپو کی ایک کتاب ''روزنامچہ'' کا اشتہار ہے جس کے متعلقہ حصے کی عبارت کچھ اس طرح ہے:

''خاص نمبر ۳۶ء میں اس دلچسپ کتاب کا صرف ایک باب 'شوہر کا روزنامچہ' کے عنوان سے شائع ہوا جو بے حد پسند کیا گیا۔ پوری کتاب وسط اپریل تک شائع ہو جائے گی۔''

یہ ''خاص نمبر ۳۶ء'' جنوری میں چھپنے والا سالنامہ ہو سکتا ہے جس میں ''شوہر کا روزنامچہ'' شامل تھا۔ اس کے بعد مارچ یا اپریل ۱۹۳۶ء میں یہ روسی ادب نمبر چھپا۔ اس نوع کے مزید داخلی شواہد بھی اس میں موجود ہیں جن سے یہی تاریخِ اشاعت قرار پاتی ہے۔

رسائل کے مذکورہ تینوں خاص نمبر اہم دستاویزات ہیں لیکن ان میں موجود منٹو کی صرف ان تحریروں کا ذکر یہاں آئے گا جو غیر مدوّن کی ذیل میں آتی ہیں۔

''نوادراتِ منٹو'' میں پیش کردہ تمام تحریروں کو ان کی اصناف کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ تمام دو حصّوں میں منقسم ہیں۔ پہلے حصّے کے طور پر منٹو کی طبع زاد تحریریں ہیں اور دوسرے حصّے میں روسی اور فرانسیسی سے کیے گئے تراجم شامل ہیں۔ ان میں سے ہر حصّے کی تحریروں کو اصناف وار اور پھر، ہر صنف کی تحریروں کو زمانی ترتیب سے پیش کیا جارہا ہے۔ ''نوادراتِ منٹو'' میں آنے والی تمام تحریروں کی فہرست مکمل حوالوں کے ساتھ ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

منٹو کی طبع زاد غیر مدوّن تحریروں میں درج ذیل چار خودنوشت کی نوعیت کی ہیں۔ ان میں سے پہلی دو کی نسبت آخر الذکر دونوں چونکہ جزواً سوانح کی ذیل میں آتی ہیں اس لیے اُنھیں زمانی ترتیب کے برعکس بعد میں رکھا ہے۔

☆ منٹو کی ایک اہم نو دریافت خودنوشت سوانحی تحریر (۱۹۴۳ء) دریافت (شمارہ: چار) اسلام آباد، ستمبر، 2005ء، ص: ۲۸۔ ۳۷

o ایضاً، سہ ماہی ''اُردو ادب''، نئی دہلی، دسمبر 2005ء، ص: ۱۳۱۔ ۱۳۷

☆ منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں، افکار (منٹو نمبر) کراچی، مارچ، اپریل ۱۹۵۵ء، ص: ۸۵۔ ۸۷ اور ۱۰۶

o بہ عنوان: منٹو، نقوش (آپ بیتی نمبر: حصّہ دوم) لاہور، جون ۱۹۶۴ء، ص: ۱۳۹۰۔

☆ پانچواں مقدمہ، نقوش (پنج سالہ نمبر) لاہور، فروری مارچ ۱۹۵۳ء ص: ۲۵۹۔ ۲۶۱

☆ میں کیوں لکھتا ہوں، ''سویرا''، شمارہ: ۱۵۔ ۱۶، لاہور، مئی ۱۹۵۴ء، ص: ۲۹۸۔ ۲۹۹

ذیل کے تمام طبع زاد افسانے غیر مدوّن ہیں اور یہاں پہلی بار جمع ہو رہے ہیں۔ بعض افسانوں کے آخر میں تاریخِ تحریر بھی درج تھی، اسے افسانے کے نام کے فوراً بعد قوسین میں رکھ دیا ہے تاکہ زمانی ترتیب کو تاریخِ تحریر کے مطابق کیا جاسکے۔ جن کے آخر میں تاریخ درج نہ تھی ان کو مجبوراً تاریخِ اشاعت کے مطابق رکھنا پڑا لیکن اس سے زمانی ترتیب میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا کیونکہ منٹو ادھر لکھتے اُدھر چھپ جاتے تھے۔ البتہ کسی مدیر نے خاص مقصد کے لیے ان کی تحریروں کو جمع کرلیا ہو تو الگ بات ہے جیسے ''شعور'' ان کی وفات کے دو برس بعد جاری ہوا لیکن یہ تحریریں ۱۹۵۴ء کی ہوسکتی ہیں اس لیے انھیں ''سرمہ'' اور ''کالی کلی'' سے پہلے رکھا ہے۔

☆ خودکشی کا اقدام، ''ہمایوں''، لاہور، جلد: ۳۴، نمبر ا، جولائی ۱۹۳۸ء، ص: ۵۴۸۔ ۵۵۲

☆ پھوجا حرامدا، ''ادب لطیف''، لاہور، اپریل ۱۹۵۴ء

''ساقی'' (جوبلی نمبر) کراچی، جلد: ۵۱، شمارہ: ۶، ۱۹۵۵ء، ص: ۴۷۰-۴۷۲

☆ مہتاب خان، ''ادب لطیف''، لاہور، جلد: ۳۸، شمارہ: ۲، جون ۱۹۵۴ء، ص: ۴۷-۵۰

☆ ڈائرکٹر کرپلانی، ''نیا دور''، کراچی، شمارہ: ا، ص: ۸۱-۸۶

☆ ملبے کا ڈھیر، ''شعور''، کراچی، شمارہ: تیسرا، کراچی، انیس سوستاون عیسوی، ص: پندرہ تا بیس

☆ شراب، ''شعور''، کراچی، شمارہ: پانچواں، انیس سوانسٹھ عیسوی، ص: سولہ تا بائیس

☆ سُرمہ (۱۱۔دسمبر ۱۹۵۴ء) ''نقوش'' (سالنامہ: حصّہ دوم) لاہور، شمارہ: ۱۰۵، اپریل جون ۱۹۶۶ء ص: ۴۷۳-۴۷۶

☆ کالی کلی (۴ جنوری ۱۹۵۵ء) ''نقوش'' (افسانہ نمبر) لاہور، شمارہ: ۷۶-۷۸، نومبر ۱۹۶۰ء، ص: ۷۷-۸۰

منٹو کی طبع زاد تحریروں میں درج ذیل چند مضامین بھی شامل ہیں جن میں سے کوئی بھی ان کے کسی مجموعہ یا کلیات میں شامل نہیں ہے۔ ان مضامین کو موضوع کے لحاظ سے پاکستانی ادب، روسی ادب اور فرانسیسی ادب، کے تین ذیلی عنوانات کے تحت یہاں رکھا ہے۔

ا۔ پاکستانی ادب

☆ پاکستان کے فلم، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۵۔ اگست ۱۹۴۸ء

☆ ڈاڑھی مُونچھ، برقع اَن لمیٹڈ، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۳۰۔ اگست ۱۹۴۸ء

☆ ہمارا جھنڈا، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۴۔ ستمبر ۱۹۴۸ء

☆ قتل، قاتل اور مقتول، روزنامہ ''آفاق''، لاہور، ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

☆ مجذوب کی بڑ، روزنامہ ''آفاق''، لاہور، ۱۸۔ فروری ۱۹۵۲ء

☆ شاعرِ کشمیر —— مہجور کاشمیری، ہفت روزہ، ''نصرت'' (کشمیر نمبر) لاہور، شمارہ: ۱۲-۱۳-۱۴، ۲۸۔ فروری ۱۹۶۰ء

ب۔ روسی ادب

☆ روسی ادب پر ایک طائرانہ نظر، ''ہمایوں'' (روسی ادب نمبر) لاہور، مئی ۱۹۳۵ء، ص:

۳۶۷_۳۵۸

☆ روسی ادبا کا تعارف، ''عالمگیر'' (روسی نمبر)، لاہور، (۱۹۳۶ء) ص:۹_۳۱

☆ پشکن، ''ہمایوں'' (روسی نمبر) لاہور، مئی ۱۹۳۵ء، ص:۴۱۹_۴۲۲

☆ تورگنیف کی موت، ''ساقی''، دہلی، دسمبر ۱۹۳۵ء، ص:۵۹_۶۱

☆ دوستوفسکی ۔۔۔ پیدائش سے موت تک، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۷ مارچ ۱۹۴۸ء

ج۔ فرانسیسی ادب:

☆ اُنیسویں صدی کے مشہور فرانسیسی انشا پرداز، ''ہمایوں'' (فرانسیسی ادب نمبر) ستمبر ۱۹۳۵ء، ص:۶۶۸_۶۷۵

☆ والٹیئر، ''ہمایوں'' (فرانسیسی ادب نمبر) ستمبر ۱۹۳۵ء، ص:۲۷۶_۲۷۷

☆ موپساں اور ٹالسٹائی کا نظریہء فنونِ لطیفہ، ''ہمایوں'' (فرانسیسی ادب نمبر) ستمبر ۱۹۳۵ء، ص:۷۰۰_۷۰۵

وکٹر ہیوگو اور مسئلہ سزائے موت، ''ہمایوں'' (فرانسیسی ادب نمبر)، ستمبر ۱۹۳۵ء، ص:۷۱۱_۷۱۵

''نوادراتِ منٹو'' کا دوسرا حِصّہ منٹو کے غیر مدوّن تراجم پر مشتمل ہے۔ روسی اور فرانسیسی سے ایسے تراجم میں آٹھ افسانے، تین ڈرامے اور بائیس نظمیں شامل ہیں۔ فرانسیسی سے صرف گیارہ نظمیں ہیں باقی تمام تحریریں روسی سے ترجمہ شدہ ہیں اور مختلف رسائل میں چھپی ہیں۔

☆ شراب اور شیطان (ٹالسٹائی) ''ہمایوں'' (سالگرہ نمبر) لاہور، جنوری ۱۹۳۴ء، ص:۱۴۰_۱۴۲

☆ ماں (الفیم ذوذلیا) ہمایوں (روسی ادب نمبر) مئی ۱۹۳۵ء، ص:۳۸۹_۳۹۳

☆ زار اور اس کے وزراء کے نام کھلی چٹھی (ٹالسٹائی) ہمایوں (روسی ادب نمبر) مئی ۱۹۳۵ء، ص:۳۹۹_۴۰۴

☆ خدا کی مرضی (ماخوذ: رشین فوک لور) ہمایوں (روسی ادب نمبر) مئی ۱۹۳۵ء، ص:۴۰۵_۴۰۷

☆ علاج (ماخوذ رشین فوک لور) ہمایوں (روسی ادب نمبر) مئی ۱۹۳۵ء، ص:۴۰۷_۴۰۸

☆ مسحور شہزادہ (ماخوذ رشین فوک لور) ہمایوں (روسی ادب نمبر) مئی ۱۹۳۵ء، ص:

۴۰۸-۴۱۰

☆ سویٹ کا سند باد جہازی (الیا الف اور ایفگنی پطروف) شاہکار، لاہور، اگست ۱۹۳۵ء، ص: ۵۹-۶۱

☆ کتا، (تورگنیف) عالمگیر (روسی نمبر) لاہور (۱۹۳۶ء) ص: ۹۸-۱۰۷

☆ تسکین دہ خواب (سلوگب) عالمگیر (روسی نمبر) لاہور، (۱۹۳۶ء) ص: ۱۷۸-۱۸۰

☆ چکر (سلوگب) عالمگیر (روسی نمبر) لاہور، (۱۹۳۶ء) ص: ۱۸۶-۱۸۸

منٹو کے ترجمہ شدہ درج ذیل تین ڈراموں میں سے پہلے دو چیخوف کے ہیں۔ یہ دونوں ''دو ڈرامے'' کے نام سے حسن خیال کمپنی امرتسر سے کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ ۸۶ صفحات کی اس کتاب پر تاریخ اشاعت درج نہیں تھی لیکن اغلب ہے کہ یہ ۱۹۳۶ء کے شروع تک کتابی صورت میں چھپ چکی تھی۔ سہ ماہی ''علی گڑھ میگزین'' کے اپریل ۱۹۳۶ء کے شمارے میں جاں نثار اختر اس کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔ موجودہ کتاب چیخوف کے ایک ایک ایکٹ کے دو ڈراموں کا ترجمہ ہے''۔ (ص: ۱۶۷)

ماہنامہ ''عالمگیر'' کا روسی ادب نمبر جو مارچ اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے صفحہ ۴۲ پر بھی اس کتاب کی اشاعت کا اشتہار ملتا ہے۔ فی الوقت یہ کتاب دسترس میں نہیں اس لیے ان دونوں ڈراموں کا متن ''ہمایوں'' کی اشاعتوں کے مطابق ہے۔

☆ ریچھ (چیخوف) ہمایوں، لاہور، جنوری ۱۹۳۵ء، ص: ۶۰-۷۲

☆ نسبت (چیخوف) ہمایوں (روسی ادب نمبر) لاہور، مئی ۱۹۳۵ء، ص: ۳۶۹-۳۸۱

☆ تماشا گاہِ نفس (ایوری نوف)، ہمایوں، لاہور، فروری ۱۹۳۶ء۔ ص: ۱۷۸-۱۸۹

○۔ فنون، لاہور، اپریل ۱۹۶۳ء، ص: ۱۹۹-۲۰۸

''تماشا گاہ نفس'' تو باقاعدہ ترجمہ ہے لیکن اس کی اشاعت کے بعد اس سے استفادہ کرتے ہوئے اسی مرکزی خیال پر مبنی منٹو نے ریڈیو کے لیے ''روح کا ناٹک'' دوبارہ لکھا۔ جو ان کے مجموعے ''کروٹ'' میں شامل ہے۔ اس کے مکالمے بیشتر وہی ہیں لیکن بعض کی ترتیب بدل دی ہے شروع کے تفصیلی تعارف اور بعض ناموں کی تبدیلی سے منٹو نے اسے مشرقی مزاج میں ڈھال کر اسے طبعِ نو بنا لیا ہے۔ یہاں

باقاعدہ ترجمے کی وہ پہلی صورت ''ہمایوں'' کی اشاعت کے مطابق درج کی جارہی ہے۔

منٹو کی ترجمہ شدہ نظموں کی ترتیب رسائل میں اشاعتوں کی نسبت ذرا مختلف ہوگئی ہے جس کی وضاحت آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔ یہاں روسی اور فرانسیسی سے گیارہ گیارہ ترجمہ شدہ نظموں کو دو حصّوں میں رکھا گیا ہے۔

روسی نظمیں:

☆ پیاری ہے مجھے (ویلری برسوف) ہمایوں (روسی ادب نمبر) مئی ۱۹۳۵ء، ص: ۳۶۸

☆ بوسے سے انکار (میکوف) ہمایوں (روسی ادب نمبر) مئی ۱۹۳۵ء، ص: ۳۸۲

☆ طلوع (میکوف) ہمایوں (روسی ادب نمبر) مئی ۱۹۳۵ء، ص: ۴۳۲

☆ حقیقت (ٹالسٹائی) ہمایوں (روسی ادب نمبر) مئی ۱۹۳۵ء، ص: ۳۹۴

☆ راہبہ (لیفلیف) ہمایوں (روسی ادب نمبر) لاہور، مئی ۱۹۳۵ء، ص: ۳۸۹

☆ آزادی (طومانسکی) ہمایوں (روسی ادب نمبر) لاہور مئی ۱۹۳۵ء، ص: ۴۳۲

☆ تمنا (سرمنطوف) ساقی، دہلی، ستمبر ۱۹۳۵ء

☆ قیدی (لیئرمنطوف) عالمگیر (روسی نمبر) لاہور، (مارچ اپریل ۱۹۳۶ء) ص: ۵۱

☆ خنجر (لیئرمنطوف) عالمگیر (روسی نمبر) لاہور (مارچ اپریل ۱۹۳۶ء) ص: ۱۵۲

☆ تمنا (پشکن) عالمگیر (روسی نمبر) لاہور (مارچ اپریل ۱۹۳۶ء) ص: ۱۴۴

☆ تمنا (کریمیلیف) عالمگیر (روسی نمبر) لاہور (مارچ اپریل ۱۹۳۶ء) ص: ۱۸۳

فرانسیسی نظمیں:

☆ ہیوگو کے اشعار، ''عالمگیر'' (عیدقربان نمبر) لاہور، ۱۹۳۵ء، ص: ۶۵۔۶۸

(جلاوطنوں کا بحری گیت) (جلاوطنوں کی دُعا)

(گیت) (خداپر بھروسہ رکھو)

☆ وکٹر ہیوگو کی چند نظمیں ہمایوں (فرانسیسی ادب نمبر) ستمبر ۱۹۳۵ء، ص: ۷۱۶۔۷۲۱

(اگر میرے اشعار کے پر ہوتے) (محبت)

(لوری) (نقاب کشائی) (عوام کا تحمل)

☆ آنسو (پال ورلین) ہمایوں (فرانسیسی ادب نمبر) ستمبر ۱۹۳۵ء، ص: ۷۱۰

☆ ایک گیت (گوئٹے) ہمایوں (فرانسیسی ادب نمبر) ستمبر ۱۹۳۵ء، ص: ۲۳-۷

زیرِ نظر تالیف میں شامل، منٹو کی تمام تحریروں کے مکمل حوالے اور مآخذ و مراجع لکھ دیے ہیں تا کہ کوئی دوسرا ان کو اپنے حوالے بنا کر پیش کرنا چاہے تو اسے آسانی رہے اور ''نوادراتِ منٹو'' سے حوالہ دینے پر وہ مجبور یا اس کا محتاج نہ رہے۔ عمومی روّیے کے مطابق، ہمارے لائبریریوں کی خاک چھاننے اور پھانکنے کو نظر انداز کر کے، اب ہر شخص آسانی سے منٹو شناسی کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تحریریں تو پہلے سے اُس کی نظر میں تھیں۔ ہمیں تو اس نامحمود روّیے پر زیادہ گلہ نہ ہوگا لیکن کوئی دوسرا انصاف پسند ایسے ''مدعی'' سے یہ ضرور پوچھ سکتا ہے کہ حضرت! اگر یہ تحریریں آپ کے علم میں تھیں تو آپ نے انھیں جمع و مرتب کیوں نہ کر دیا یا اس سے پہلے کہیں ان کا ذکر کرنا کیوں گوارا نہ کیا۔

O

''نوادراتِ منٹو'' میں شامل منٹو کی تحریروں کے تنقیدی جائزے کی یہاں ضرورت ہے نہ گنجائش۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جسے کسی اگلی فرصت یا منٹو کے ناقدین پر اٹھا رکھتے ہیں لیکن ان میں سے بعض تحریروں کے بارے میں کچھ امور وضاحت طلب ہیں۔ سو اس نوعیت کے کچھ معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

منٹو کی ان تحریروں میں سے تین ایسی ہیں جو ہماری تحقیق و ترتیب کے دوران میں شائع ہو چکی ہیں۔ ''منٹو کی ایک اہم نو دریافت خودنوشت سوانحی تحریر'' تو ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کی دریافت ہے جسے انھوں نے اپنے تحقیقی تعارف کے ساتھ متعارف کروایا اور یہ مجلّہ ''دریافت'' (اسلام آباد) میں شائع ہوئی۔ ایک دوسری تحریر ''سویٹ کا سندباد جہازی'' سیدہ مصباح رضوی کی دریافت ہے جو شمشیر حیدر شجر اور نوید الحسن کی مرتبہ کتاب ''سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)'' میں ان کے تعارف کے ساتھ شامل ہے۔ منٹو کے ایک افسانے ''پھوجا حرام دا'' کی جستجو اور طلب ایم خالد فیاض کو ہوئی۔ میں نے ''ساقی'' کے جوبلی نمبر (۱۹۵۵ء) میں شامل اس افسانے کی نقل انھیں بھجوا دی۔ انھوں نے اپنے تنقیدی تعارف کے ساتھ جون ۲۰۰۶ء کے ''انگارے'' (ملتان) میں اسے شائع کروایا۔ ڈاکٹر شگفتہ حسین نے ''انگارے'' جولائی ۲۰۰۶ء میں اس افسانے کی اشاعت ''ادبِ لطیف'' اپریل ۵۴ء میں بھی بتائی ہے

لیکن ہمارا متن ''ساقی'' کے مطابق ہے۔

''نوادراتِ منٹو'' کے مزید دو افسانے ''سرمہ'' اور ''مہتاب خاں'' بھی اسی دوران میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے مرتبہ ''کلیاتِ منٹو'' میں آ گئے ہیں۔ اس کے باوجود انھیں یہاں اس لیے شامل رکھا جا رہا کہ ایک تو یہ اصل مآخذ کے ساتھ پہلے سے ہمارے پیشِ نظر تھے دوسرا یہ کہ ''نوادراتِ منٹو'' میں وہ تحریریں جمع کرنا مقصود ہے جو سنگِ میل کے شائع کردہ مجموعوں میں شامل نہیں ہو سکیں۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے مُرتبہ کلیات میں ایک افسانہ ''بیگم صاحبہ'' بھی ہے۔ اس کا ماخذ انہوں نے منٹو کا افسانوی مجموعہ ''شیطان'' (۱۹۵۵ء) بتایا ہے۔ یہ افسانہ بھی سنگِ میل کے شائع کردہ کلیات میں نہیں ہے لیکن اسے یہاں ''نوادراتِ منٹو'' میں بھی فی الحال شامل نہیں کیا جا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا بنیادی ماخذ ہماری دسترس میں نہیں آ سکا۔ اسے ہمایوں اشرف کے کلیات سے اس وجہ سے نہیں لیا گیا کہ وہاں اس کا متن درست نہیں ہے بلکہ پڑھتے ہوئے ایک جگہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ درمیان میں سے ایک یا ایک سے زائد پیراگراف خذف ہیں گویا وہ کمپوزر، پروف ریڈر یا مرتب میں سے کسی کی نظر میں نہیں آ سکے۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے ''منٹو کی ایک اہم نو دریافت خودنوشت سوانحی تحریر'' کا اصل مسودہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری کو دے دیا تھا۔ اب معین صاحب کے انتقال کے بعد، ان کے مضمون میں شامل اس تحریر کے بارے میں بخاری صاحب لکھتے ہیں:

> ''منٹو سے منسوب اس مضمون میں جس تحریر کا ذکر ہے وہ منٹو کی نہیں (یہ تحریر راقم کی تحویل میں ہے اور یہ مضمون ڈاکٹر معین الرحمٰن مرحوم کی رحلت کے بعد شائع ہوا) صحیح صورت حالات کی اشاعت کے لیے مفصل مضمون زیرِ ترتیب ہے جو جلد ہی شائع ہو جائے گا۔''
>
> (''انگارے''، دسمبر ۲۰۰۵ء، ص: ۱۸۳)

اس بات کو دو برس ہونے کو آئے۔ بخاری صاحب شاید اس طرف توجہ نہیں دے پائے ہیں۔ ـ نے منٹو کی بعض دوسری قلمی تحریروں سے اس زیرِ بحث قلمی تحریر کے عکس کو ملا کر دیکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس قلمی تحریر کا خط اور سوادِ خط منٹو کے خط سے کم میل کھاتا ہے لیکن کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ منٹو نے کسی دوسرے کو اپنے بارے میں یہ تحریر لکھوا دی ہو یا اس کے لکھنے میں ان کی اجازت شامل ہو۔ جیسا کہ ۱۹۴۳ء میں فلمی دنیا کی مصروفیتوں کا ذکر خود اس تحریر میں بھی آیا ہے۔ دوسرا یہ کہ ۱۹۴۳ء میں جب خود منٹو موجود ہیں اور شہرت و مقبولیت کی بلندیوں پر ہیں تو کسی دوسرے کو کیا ضرورت اور جرات کہ براہ راست

اُن سے لکھوا لینے کے بجائے، پہلے منٹو کے حالات اور افکار و نظریات سے آگاہی حاصل کرے پھر ان کے اسلوب یا الفاظ کو اپنا کر انہی کے خط میں اُن کے نام سے جعلی تحریر گھڑنے کی کھکھیڑ اٹھائے اور وہ بھی فکری نہیں سوانحی نوعیت کی بے ضرر تحریر کے لیے۔ ظاہر ہے یہ تحریر چھپنے یا چھپوانے کے لیے تھی تو پھر اس ''جعل'' کرنے والے کو یہ احساس یا اخلاقی خوف کیوں نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے چھپنے پر منٹو کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ پھر یہ کہ انجمن ترقی اُردو نئی دہلی کے رسالہ ''اردو ادب'' نے بھی دسمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں اسے شائع کر دیا ہے۔ لہٰذا اس تحریر کو منٹو کی dictation یا اُن کی اجازت سے لکھی جانے والی تحریر مان لینے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیے۔

''نوادراتِ منٹو'' میں شامل منٹو کے طبع زاد افسانوں میں ''کالی کلی'' سب سے اہم اور فکری و فنی حوالے سے بہت بلند سطح کا حامل ہے۔ میری خبر و نظر کی حد تک اس اہم افسانے کے بارے میں آج تک ڈاکٹر سلیم اختر کے علاوہ کسی نقاد نے ایک سطر بھی نہیں لکھی کیونکہ یہ تقریباً پردۂ اخفا ہی میں رہا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی دلچسپ رائے ملاحظہ کیجیے۔ وہ ''نقوش'' میں چھپنے والے مختلف افسانوں کو موضوع بناتے ہوئے ''کالی کلی'' کے بارے میں اپنی کتاب ''افسانہ اور افسانہ نگار: تنقیدی مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ افسانہ منٹو کے اصل فن کا نمائندہ بننے کے برعکس اس کے ذہنی انتشار کا غماز قرار پاتا ہے۔۔۔۔۔ 'کالی کلی' کسی مرتکز ذہن کے برعکس منتشر ذہن کی ضمنی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ پانچویں دہائی میں نہ تو تجریدی افسانے کا آغاز ہوا تھا اور نہ ہی خود منٹو نے اس نوع کے تجربات سے کسی طرح کی دلچسپی کا اظہار کیا۔'' (ص: ۸۰۔۸۱)

اگر پانچویں دہائی میں تجریدی افسانے کا آغاز نہیں ہوا تھا تو کیا ضرور ہے کہ کوئی دوسرا آغاز کرتا تو تب ہی منٹو اس کی پیروی میں تجریدی افسانے لکھتے۔ اگر اس افسانے میں تجریدیت کے آثار ملتے ہیں تو کیا منٹو کو اردو میں تجریدی افسانے کا آغاز کرنے والا نہیں مانا جا سکتا۔

''کالی کلی'' منٹو کے آخری عمر کے ان چند افسانوں میں شمار ہوتا ہے جن کی بنیاد پر منٹو کو جدید اُردو افسانے کا بانی اور معمار کہا گیا ہے۔ ''پھندنے'' اور ''بارده شمالی'' کی ٹکر کے اس افسانے میں اُسی سطح کے علامتی انداز سے جنسی قتل اور انا کے قتل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ افسانہ اپنی تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے نقادوں کو ضرور متوجہ کرے گا اور منٹو کے فکر و فن کے ایک نئے زاویے کو سامنے لائے گا۔ عجیب اتفاق کہ اس کے آخر میں منٹو کے قلم سے دستخطوں کے نیچے ۴۔ جنوری ۱۹۵۶ء کی تاریخ درج ہے۔ یہ منٹو کا سہو

قلم ہے۔ وہ ۵۵ء کی بجائے ۵۶ء لکھ گئے۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں شامل منٹو کے طبع زاد افسانوں میں سے ''خودکشی کا اقدام''، ''پھوجا حرام دا''، ''سرمہ'' اور ''کالی کلی''، منٹو کے خاص فکر و فن اور اسلوب کے حامل اعلیٰ درجے کے افسانوں میں جگہ پائے جانے کے قابل ہیں۔ وارث علوی نے اپنی کتاب ''منٹو ایک مطالعہ'' میں ''منٹو کے افسانوں میں عورت'' کے تحت ''سرمہ'' کی جو تنقیدی تعبیر و تفہیم کی ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔

منٹو نے اپنے ایک مضمون ''زحمتِ مہرِ درخشاں'' میں لاہور آنے کے بعد کی اپنی ذہنی کیفیت اور پھر لکھنے کی طرف خود کو متوجہ کر لینے کے بارے میں لکھا ہے:

''سوچ سوچ کر میں عاجز آ گیا تھا۔ چنانچہ آوارہ گردی شروع کر دی۔۔۔۔۔ اس آوارہ گردی سے یہ فائدہ ہوا کہ میرے دماغ میں جو گرد و غبار اڑ رہا تھا آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور میں نے سوچا کہ ہلکے پھلکے مضامین لکھنا چاہییں۔ چنانچہ میں نے ''ناک کی قسمیں''، ''دیواروں پر لکھنا'' جیسے فکاہیہ مضامین ''امروز'' کے لیے لکھے جو پسند کیے گئے۔

آہستہ آہستہ مزاج خود بخود طنزیہ رنگ اختیار کر گیا۔۔۔۔۔ میں نے زور و شور سے لکھنا شروع کر دیا۔ مضامین کا یہ مجموعہ بعد میں ''تلخ ترش اور شیریں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔''

روز نامہ ''امروز'' (لاہور) میں لکھے جانے والے منٹو کے تمام مضامین صرف ''تلخ ترش اور شیریں'' میں نہیں ہیں بلکہ بعض ان کے ایک دوسرے مجموعے ''اوپر نیچے اور درمیان'' میں بھی شامل ہیں۔ اس کے باوجود ''امروز'' میں چھپنے والے چار مضامین ایسے ہیں جو مذکورہ دونوں مجموعوں یا ان کے علاوہ کسی اور مجموعے میں شامل نہیں ہو سکے اور اب ''نوادراتِ منٹو'' میں پہلی بار یک جا صورت میں آ رہے ہیں۔ یہ مضامین بس منٹو کی نظر سے رہ گئے ہوں گے نہ کہ نظرِ انتخاب سے کیونکہ یہ بالکل اسی انداز و معیار کے ہیں جو منٹو کے مذکورہ مجموعوں میں آ چکے ہیں۔

منٹو کا ایک مضمون ''قتل، قاتل اور مقتول'' لیاقت علی خاں کے قتل سے متعلق کسی ادیب کے قلم سے پہلا مضمون ہے۔ اس وقت کی عام اخباری خبروں اور افواہوں سے ہٹ کر اس میں منٹو بڑے تفتیشی انداز سے لیاقت علی خاں کے قتل کو زیرِ بحث لائے ہیں جو ان کے گہرے سیاسی، سماجی اور تنقیدی شعور کا غماز ہے۔ اس مضمون میں منٹو کا قلم وہ آنکھ بن گیا ہے جو قتل سے پہلے، موقع واردات، اور چند دن بعد کی

حکومتی سرگرمیوں کے بڑے واضح مناظر دیکھا اور دکھا رہا ہے۔ وہ زبان بن گیا ہے جو اس قتل سے متعلق ہر شخص خصوصاً حکومتی عہدیداران سے سوال کرتا ہے۔ منٹو کا ایک اور مضمون ''شاعرِ کشمیر'' مہجور کاشمیری کی شاعری کے بارے میں ہے جو ۱۹۵۲ء کی تحریر ہے۔ ۱۹۶۰ء کے ماہنامہ ''نصرت'' (کشمیر نمبر) میں جہاں یہ مضمون ہے اس کے فوراً بعد مہجور کی چند نظموں کے اُردو تراجم ہیں جو نصیر انور نے کیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ نصیر انور کی ترجمہ شدہ، مہجور کی نظموں پر دیباچے کے طور پر منٹو نے لکھا۔

منٹو کے روسی اور فرانسیسی ادب کے مطالعات بھی تاحال مکمل اور یک جا صورت میں شائع نہیں ہو سکے۔ ایسی تحریروں میں ایک تو باقاعدہ تراجم یا ماخوذ ہیں اور دوسرا روسی یا فرانسیسی ادب اور شخصیات کے بارے میں منٹو کی تحقیق و تنقید اور تجزیات و مشاہدات ہیں۔ ''نوادراتِ منٹو'' میں ان دو طرح کی تحریروں کو دو حصّوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ جو تحریریں منٹو کی تحقیق و تنقید کی ذیل میں آتی ہیں انھیں طبع زاد مضامین کے حصّے میں رکھا ہے۔ تراجم میں افسانوں، ڈراموں اور نظموں کو بھی الگ الگ رکھا ہے۔ ''زارِ روس اور اس کے وزرا کے نام کھلی چھٹی'' ان معنوں میں افسانہ تو نہیں ہے لیکن اس کے لیے الگ سیکشن کی گنجائش نہ تھی اس لیے فی الحال اسے ترجمہ شدہ افسانوں ہی میں رکھ لیا ہے۔

یہاں منٹو کے مضامین کو بالترتیب تین حِصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ''پاکستانی ادب''، ''روسی ادب''، اور ''فرانسیسی ادب''۔ مضامین کی زمانی ترتیب کو دیکھا جائے تو ''پاکستانی ادب'' کے تحت آنے والے مضامین کو آخر میں آنا چاہیے کہ یہ تمام قیامِ پاکستان کے بعد کے ہیں۔ ترتیب میں انھیں شروع میں رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے حصّے کے بیشتر افسانے اور یہ مضامین ایک ہی فضا اور کلچر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح روسی اور فرانسیسی ادب اور شخصیات سے متعلق مضامین کو ان کے بعد اس لیے رکھا ہے کہ پھر ان کے بعد تراجم پر مشتمل دوسرا حِصّہ ہے اور یہ مضامین ان تراجم کی تفہیم کے لیے پس منظر کا کام دیں گے۔ صنف یا ہیئت کے لحاظ سے تو ان تمام تحریروں کو ''طبع زاد'' اور ''تراجم'' کے تحت دو حِصّوں میں تقسیم کیا ہے لیکن موضوعات کے لحاظ سے پہلا حِصّہ ''پاکستانی ادب'' پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا حِصّہ ''روسی ادب'' سے شروع ہوتا ہے۔ اس طرح موضوعات کے لحاظ سے اِن دونوں میں ایک معنوی ربط اور تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔ ان تمام نوادرات میں تراجم کو تقدمِ زمانی حاصل ہے لیکن ''طبع زاد'' کی اہمیت کے پیشِ نظر انھیں پہلے حصّے کے طور پر رکھا ہے اور پھر ہر ہیئت اور صنف کی تحریروں کی اندرونی ترتیب، زمانی رکھی ہے۔

روسی اور فرانسیسی سے ترجمہ شدہ منٹو کی بائیس نظمیں، فی الوقت دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان میں سب

سے پہلے ''ہمایوں'' کے روسی ادب نمبر (مئی ۱۹۳۵ء) میں درج ذیل چھ نظمیں چھپی تھیں: پیاری ہے مجھے (ویلری برسوف)، بوسے سے انکار (میکوف)، حقیقت (ٹالسٹائی)، راہبہ (لیفلیف)، طلوع (میکوف)، اور آزادی (طومانسکی)۔ اس کے بعد ''ساقی'' ستمبر ۱۹۳۵ء کے شمارے میں ''شراب روس کے تین جام'' کے عنوان سے پشکن، سر منطوف اور اناطول کریمیلیف کی ''تمنا'' کے نام سے ایک ایک نظم شائع ہوئی۔ ان میں سے پشکن اور کریمیلیف کی نظمیں بعد میں ''عالمگیر'' کے روسی ادب نمبر (۱۹۳۶ء) میں بھی شائع ہوئیں۔ ''عالمگیر'' میں شامل پشکن کی نظم میں دو جگہ ترمیم بھی عمل میں آئی ہے۔ اسی نمبر میں لئیر منطوف کی دو نظمیں ''قیدی'' اور ''خنجر'' بھی شامل ہیں۔ اس طرح روسی شعرا کی ترجمہ شدہ کل گیارہ نظمیں ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوئیں۔

فرانسیسی سے بھی منٹو کی ترجمہ شدہ نظمیں گیارہ ہی ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ''ہیوگو کے اشعار'' کے عنوان سے ''عالمگیر'' کے عید قربان نمبر (۱۹۳۵ء) میں درج ذیل چھ نظمیں شائع ہوئیں: جلاوطنوں کا بحری گیت، جلاوطنوں کی دُعا، نقاب کشائی، گیت، خدا پر بھروسہ رکھو اور عوام کا تحمل۔ اس کے بعد ''وکٹر ہیوگو کی چند نظمیں'' کے عنوان سے ''ہمایوں'' کے فرانسیسی ادب نمبر (ستمبر ۱۹۳۵ء) میں درج ذیل پانچ نظمیں شائع ہوئیں: اگر میرے اشعار کے پر ہوتے، لوری، محبت، نقاب کشائی اور عوام کا تحمل۔ ان میں سے آخری دو وہی ہیں جو اس سے پہلے ''عالمگیر'' میں ''ہیوگو کے اشعار'' کے تحت چھپیں لیکن یہاں ''ہمایوں'' میں یہ دونوں بہت سی مثبت ترامیم اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی ہیں اس لیے ان کو ''ہیوگو کے اشعار'' کے تحت سے نکال دیا ہے اور متن کو اس آخری اشاعت کے مطابق رکھا ہے۔ ''ہمایوں'' کے فرانسیسی ادب نمبر ہی میں پال ورلین کی ''آنسو'' اور گوئٹے کی ''ایک گیت'' بھی شامل ہے۔ ان میں سے ''ہیوگو کے اشعار'' اور ''وکٹر ہیوگو کی چند نظمیں'' کے ساتھ منٹو کے تعارفی اور تنقیدی نوٹ بھی تھے جنہیں یہاں بھی شامل رہنے دیا ہے۔

''نوادراتِ منٹو'' میں سعادت حسن منٹو کی چھوٹی بڑی باسٹھ تحریریں ہیں۔ ان کے ذریعے سے منٹو کے فکری، فنی اور ذہنی عمل وارتقا کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے کیونکہ یہ تحریریں منٹو کی پوری ادبی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ منٹو نے ۱۹۳۳ء میں لکھنے اور چھپنے کا آغاز کیا اور آخر دم تک لکھتے رہے۔ ''نوادراتِ منٹو'' میں ۱۹۳۴ء سے لے کر ان کی وفات (جنوری ۱۹۵۵ء) تک کی تحریریں شامل ہیں۔ ان میں زیادہ تر یا تو ابتدائی چند برسوں کی ہیں یا پھر آخری چند برسوں کی۔ اس طرح ان تحریروں کے ذریعے

سے منٹو کے ابتدائی اور آخری دور کے افکار و نظریات اور معیار و مزاج کا تقابل کرنے میں بھی بے حد مدد ملتی ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک نے اپنی کتاب ''سعادت حسن منٹو: ایک نئی تعبیر'' کے ذریعے جس ترقی پسند پاکستانی منٹو کو تلاش کیا اور ان کے جس نظریاتی پہلو پر زور دیا تھا، اہلِ نظر میں وہ زیرِ بحث ضرور رہا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کی تائید یا تردید میں چند اچھے مضامین بھی سامنے آئے۔ ''نوادراتِ منٹو'' اس سلسلے میں مزید مواد فراہم کرے گی کیونکہ ان میں سے کوئی بھی تحریر فتح محمد ملک یا اس سلسلے کے کسی دوسرے اہلِ قلم کے پیشِ نظر نہیں رہی۔ اس لحاظ سے ان نوادرات کے ذریعے سے ہر دو مکتبہ فکر کے صاحبانِ علم کے منٹو کے بارے میں بعض نظریات کو مزید تقویت ملے گی اور بعض کے بارے میں انھیں نظرِ ثانی یا رجوع کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ ان تحریروں میں نام نہاد ترقی پسندوں سے بھی پہلے، منٹو کے ترقی پسند نظریات کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ اسی طرح ''پاکستانی ادب'' کے تحت جو مضامین ہیں وہ پاکستانی کلچر اور سیاست کے بھرپور تجزیے ہیں۔

''نوادراتِ منٹو'' میں شامل تمام تحریریں یک جا صورت میں منٹو کے کسی مجموعے میں ہیں نہ سنگِ میل کے کلیاتی مجموعوں میں۔ رسائل میں بکھری منٹو کی ان تحریروں کی جمع و ترتیب کا مقصد یہی تھا کہ کلیاتِ منٹو کی ترتیب و تدوین کی تکمیل کے لیے پہلا قدم اٹھایا جائے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے منٹو کی ہر چھوٹی بڑی تحریر اہم ہے اور اس کی جمع آوری اور اشاعت یا بازیافت منٹو سے محبت کرنے والوں کے لیے خوش گوار فریضہ ہونی چاہیے۔ ایسے نوادرات جمع ہو جانے کے بعد کلیاتِ منٹو کی ترتیب کی منزل آئے گی۔ منٹو کی کچھ اور غیر مدوّن اور غیر مطبوعہ تحریریں بھی ہمارے سامنے ہیں لیکن انھیں اگلے مجموعے میں پیش کیا جائے گا۔ اس لیے کہ منٹو کی اُن غیر مدوّن تحریروں میں کچھ ایسی ہیں کہ رسالے یا اخبار کے صفحات کی بوسیدگی اور خستگی ان کی خواندگی میں آڑے آ رہی ہے۔ کچھ قسط وار تحریریں ہیں جن کی ایک قسط ملی ہے تو دوسری کی تلاش ہے۔ کچھ کے حوالے نامکمل یا غیر معتبر ہیں اور کچھ کے ابھی تک صرف حوالے ملے ہیں۔ منٹو کے سنجیدہ قارئین اور قدر دان، اہلِ علم و قلم کی خدمت میں منٹو کی پچانویں سالگرہ پر ''نوادراتِ منٹو'' کا نادر تحفہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس خصوصی استدعا کے ساتھ کہ وہ ''نوادراتِ منٹو'' کی کوتاہیوں کی نشاندہی فرمائیں اور اس سلسلے کے مزید حوالوں سے بھی آگاہی فرمائیں۔ ہم ان کے عملی تعاون کے منتظر اور اعترافِ علمی کے آرزومند ہیں۔

منٹو کے ان نوادرات کی جمع آوری میں مدد و معاونت، مشاورت، اور حوصلہ افزائی کرنے والے اساتذہ، احباب اور اعزہ کی ایک لمبی فہرست ہے جو دل پر نقش ہے۔ ان کی شکر گزاری کے لیے یہ زبان و قلم تڑپ رہے ہیں۔ ہر نام نوکِ قلم پر پہلے آنا چاہتا ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ اس عمل میں کوئی نام سبقتِ قلم کی نذر نہ ہو جائے۔ سپاس گزاری کے یہ جذبات دل ہی میں موجزن رہیں تو بہتر ہے کہ کاغذ پر آنے سے دل خالی نہ ہو جائے۔ دوسری صورت یہی ہے کہ دل ہی نکال کے یہاں رکھ دیا جائے۔

عزیزان گرامی شمشیر حیدر شجر اور نوید الحسن کی منٹو سے محبت میرے لیے رشک کا باعث بنی رہی کہ انہوں نے منٹو کے یہ نوادرات جمع کرنے میں مجھ سے بھی زیادہ متحرک اور باعمل ہونے کا ثبوت دیا۔ ان کی بھرپور معاونت شاملِ حال نہ ہوتی تو ''نوادراتِ منٹو'' اس طرح صورت پذیر نہ ہو پاتی۔ خدا ان کو خوش و خرم اور شاد و شادمان رکھے اور عملی زندگی میں توفیقاتِ مزید سے نوازے۔

مئی ۲۰۰۷ء

محمد سعید
شعبۂ اُردو
جی سی یونیورسٹی، لاہور

اعتذار:

پچھلے دو برس میں نے اور ''نوادراتِ منٹو'' نے لاہور کے بعض سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اشاعتی اداروں کے در کھٹکھٹانے میں گزارے ہیں چونکہ اتفاق سے ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح سرکار سے جا بنتا ہے جس سے منٹو کی ساری عمر نہیں بن آئی اس لیے ''نوادراتِ منٹو'' کی اشاعت میں تعویق ہوتی رہتی۔ اب برادرِ مکرّم محمد ہارون عثمانی کے نومولود ادارے نے یہ پہلا بیڑا اٹھایا ہے چونکہ یہ ادارہ ابھی کسی سرکار کا مرہونِ منت نہیں اس لیے اُمید ہے کہ اب یہ مجموعہ جلد چھپ جائے گا۔ محمد ہارون عثمانی کے شکریے کے ساتھ ان کے ادارہ فروغِ مطالعہ کے فروغ کے لیے دعا ہائے خراواں۔ (مرتب)

خودنوشت

۱۔ منٹو کی ایک اہم، نو دریافت خودنوشت سوانحی تحریر

۲۔ منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں

۳۔ پانچواں مقدمہ

۴۔ میں کیوں لکھتا ہوں

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

منٹو کی ایک اہم نو دریافت خود نوشت سوانحی تحریر

پچھلے برس ۲۰۰۴ء میں ترقی پسند ادب کے ترجمان ''انگارے'' کے مرتب عزیز مکرّم ڈاکٹر سیّد عامر سہیل نے، منٹو کی پچاس ویں برسی کی مناسبت سے ''انگارے'' کے مجوزہ ''سعادت حسن منٹو نمبر'' کے لیے مجھ سے منٹو کی کسی قلمی تحریر وغیرہ کے بارے میں استفسار کیا، نوادر کے میرے ذخیرے میں منٹو کی کوئی قلمی تحریر نہیں تھی، یہ فرمائش پوری نہ کر سکا، مجھے سہیل صاحب کو، ڈاکٹر علی ثنا بخاری سے متعارف کرانے کی مسرت ضرور حاصل ہوئی، جو عہدِ موجودہ میں منٹو کے ایک بہت سیریس اسکالر ہیں اور جنھوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے سعادت حسن منٹو پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ۔ ڈی کی سندِ فضیلت پائی۔

منٹو کی کسی قلمی تحریر کے اپنے ذخیرے میں ناموجود ہونے پر بے اختیار، دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی ''کاش! کہ مجھے ان کی کوئی تحریر مل سکے۔'' اللہ کے کرم ہائے بے حساب، اور اللہ کے بندوں کی مجھ پر عنایاتِ بے شمار کی کوئی حد ہے، نہ اور چھور کہ مجھے سال جاریہ (۲۰۰۵ء) میں منجملہ سعادت حسن منٹو، بہت سے اکابرِ ادب کی اہم قلمی تحریریں ملیں۔ یہاں ایسے چند منتخب اسماء کا ذکر کرتا ہوں جن کی قلمی تحریریں میرے ذخیرۂ نوادر کا تازہ اضافہ ہیں:

''سر شیخ عبدالقادر، پطرس بخاری، برجموہن دتاتریہ کیفی، صغرا بیگم ہمایوں، مولانا غلام رسول مہر، فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، حسن نظامی، ن۔م۔ راشد، تلوک چند محروم، معین

احسن جذبی، احمد فراز، محسن احسان، خاطر غزنوی، رضا ہمدانی، فارغ بخاری، شوکت واسطی، سید آلِ رضا، ساغر نظامی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ محمد شفیع دہلوی، خمار بارہ بنکوی، ملاّ رموزی، احسان دانش، اختر انصاری (علیگ)، کوثر چاند پوری، بیگم سلمیٰ تصدق حسین، محی الدین قادری زور، جوش ملیح آبادی، میاں بشیر احمد، بیگم زاہدہ خلیق الزمان، ڈاکٹر رشید جہاں، فراق گورکھپوری، محمد حسین عرشی امرتسری، نسیم انہونوی، الیاس برنی، صفی لکھنوی، میرزا ثاقب لکھنوی، مرزا فدا علی خنجر، یاس یگانہ چنگیزی، سید حسن امام، انصار ناصری، یوسف ظفر، میکش اکبر آبادی، ارشد تھانوی، شوکت تھانوی، نواب محمد اصطفا خان، فیاض علی (ایڈووکیٹ) امین سلونوی، سلام مچھلی شہری، ماہر القادری، حامد اللہ افسر، علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، شیر محمد اختر، نہال سیوہاروی، عباد اللہ اختر، محمد منیر الدین چغتائی، رشید اختر ندوی، پروفیسر احمد علی، ایم۔ ڈی تاثیر، کنہیا لال کپور، سلطان حید جوش، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، شفیق الرحمٰن، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو۔''

شعر و ادب کے ان اکابر کی اصل تحریریں میرے ذخیرہ نوادر کا قیمتی اضافہ ہیں۔ یہاں سعادت حسن منٹو کی ایک اہم خود نوشت سوانحی تحریر کا تعارف مقصود ہے جو منٹو کے احوال کے ضمن میں ایک بیش قیمت اور نو دریافت ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ادارہ فیروز سنز (لاہور) کے ڈاکٹر عبدالوحید[۱] نے اپنے معروف طباعتی و اشاعتی ادارے فیروز سنز لمیٹڈ کی جانب سے شائع ہونے والے نثر نگاروں اور شاعروں کے ایک انتخاب کے لیے متعدد صاحب طرز اہلِ قلم سے اپنے خیالات لکھ بھیجنے، نیز اپنی تصویر عطا کیے جانے کی تحریک کی تھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالوحید کا ایک عمومی مکتوب (تحریر ستمبر ۱۹۴۳ء) میرے پیشِ نظر ہے۔

عبدالوحید خاں صاحب کی اس فرمائش کی تائید اور پیروی میں شوکت تھانوی نے بھی اپنے بعض احباب کو توجہ دلائی اور انہیں تصویر نیز اپنے حالات لکھ بھیجنے پر آمادہ کیا۔ اس سلسلے کے ایک دو اصل دستخطی خط بھی میرے ذخیرے میں ہیں۔ ۱۵ نومبر ۱۹۴۳ء کے شوکت تھانوی کے ایک خط کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

''......... میں یہ خط لکھ کر آپ کو ایک خاص تکلیف دینا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اوّل تو

ادبِ اردو کے لیے ورنہ شوکت کے لیے آپ یہ تکلیف ضرور گوارا کریں گے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ ہندوستان کا مشہور ادارہ فیروز سنز لاہور ادبائے اردو کا ایک ایسا مبسوط اور مصور تذکرہ مرتب کر رہا ہے جس میں انیسویں اور بیسویں صدی کے فاضل اور صاحبِ طرز ادیبوں اور شاعروں کے حالات کے علاوہ ان کا نمونہ انشا یا نمونہ کلام بھی پیش کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں آپ کی ذمہ داری میں نے لی ہے کہ آپ کے حالات، آپ کا فوٹو اور آپ کے کلامِ نظم ونثر کا نمونہ میں منگوائے دیتا ہوں۔ میری اس ذمہ داری کی لاج رکھتے ہوئے آپ اپنی بہترین تصویر اور اپنے حالات جن میں سنہ ولادت، مولد، وطن، تعلیم، موجودہ شغل اور اپنی تصانیف کا حوالہ ضرور ہو بہ واپسی بھیج دیجیے ....

[نیاز کیش شوکت تھانوی، ۱۵- نومبر، ۱۹۴۳ء]

منٹو نے ''سعادت حسن منٹو'' کے عنوان سے اپنے مختصر سوانح ڈاکٹر عبدالوحید کو لکھ بھیجے۔ حالات کے اختتام پر وحید صاحب کے نام منٹو کا چند سطری خط بھی ہے۔ میرے علم اور نظر کی حد تک یہ خودنوشت حالات، ادارہ فیروز سنز لاہور سے چھپنے والے کسی انتخاب یا تذکرے میں جگہ نہیں پا سکے۔

اپنے سوانحی حالات کے لیے منٹو نے ۲/۱،۹x۲/۱،۶ انچ سائز کی دو سلپس (Slips) استعمال کی ہیں۔ پہلی سلپ کے دونوں اطراف لکھا گیا ہے۔ دوسری سلپ کا صرف ایک حصہ استعمال میں آیا ہے۔ پشت کا صفحہ (حصہ) خالی ہے۔ منٹو کی اس قلمی تحریر پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن اسے عبدالوحید صاحب کے عمومی مکتوب (تحریر ستمبر ۱۹۴۳ء) اور شوکت تھانوی کے متذکرہ بالا خط مورخہ ۱۴[کذا] نومبر ۱۹۴۳ء کی روشنی میں سال ۱۹۴۳ء کے اواخر کی تحریر خیال کرنا چاہیے۔

اس قیاس کی تائید میں ایک داخلی شہادت منٹو کی اس سوانحی تحریر سے بھی ملتی ہے اس میں منٹو نے اپنا سال ولادت ۱۹۱۲ء بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''.......... میں نے تا حال اپنی زندگی کی اکتیس بہاریں دیکھی ہیں.......... '' اس سے بھی منٹو کی اس تحریر کا سال ۱۹۴۳ء ہی ہاتھ آتا ہے۔

سعادت حسن منٹو کی یہ نادر قلمی نگارش، ڈاکٹر عبدالوحید کی مرتب کردہ کسی کتاب، یا انتخاب، یا تذکرے کا حصہ نہیں بن پائی اور منٹو کی پچاسویں برسی کے سال اور لکھے جانے کے باسٹھ (۶۲) سال بعد اب پہلی بار ڈاکٹر رشید امجد کی قدر دانی کے طفیل ''دریافت'' کے ذریعے منظر عام پر آ رہی ہے۔

سعادت حسن منٹو کی یہ نادر قلمی نگارش (متعدد دوسری یادگار تحریروں کے بشمول) مجھے حضرت امیر مینائی کے معروف علمی خانوادے میں ان کے عزیزوں کے ہاں سے ملی۔ ذیل میں اس خودنوشت سوانح کا متن اور مابعد اس تحریر کی عکسی نقل محفوظ کی جاتی ہے:

سوانح حیات: سعادت حسن منٹو

دوستو۔ تم یہ سن کر شاید حیران ہو گے کہ میں نے تا حال اپنی زندگی میں اکتیس بہاریں دیکھی ہیں۔

میری پیدائش، پنجاب کے تجارتی مرکز امرتسر میں ۱۱۔ مئی ۱۹۱۲ء کو ہوئی۔

کھاتے پیتے گھر میں بچوں کی تربیت بہت خوب ہو جاتی ہے لیکن میں اپنے گھریلو معاملات کی پیچیدگیوں میں کچھ اس (بُری) طرح سے گھرا ہوا تھا کہ امرتسر میں بمشکل انٹرنس کا امتحان پاس کر سکا۔

میرا ابتدائی دور اگرچہ خوش اثر تھا لیکن قبلہ ام والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد خاندانی حالات کے مدِ نظر چند دشواریاں آ گئیں جن سے بخوبی عہدہ برآ ہونا مجھ ایسے صغرسن کے لیے حد سے زیادہ مشکل تھا۔ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ طبیعت میں آوارگی کی نمود ہو چکی تھی لیکن سایہء پدری کا سر سے اٹھ جانا مجھے اپنی حیثیت جانچنے کا داعی ہوا۔

والدہ محترمہ سے اجازت حاصل کرے (کرکے) اکنافِ کشمیر میں بغرضِ بحالئ صحت گیا۔ بنوت میں کچھ مدّت قیام کیا۔ طبیعت میں رنگینیوں نے جھلک دکھائی۔ دل کو مضبوط کیا کہ کسی قیمت پر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دنیا اور دنیا والوں کو اپنی طرف جھکاؤں گا۔

گھر لوٹا تو والدہ ماجدہ سے حصول تعلیم کا ارادہ بیان کیا چنانچہ علی گڑھ میں بغرضِ استفادہ بھیجا گیا۔ چند بچپن کی آزادیٔ طبع، کچھ آب و ہوا کی ناموافقت نے بستر علالت پر لٹا دیا۔ چار و ناچار تعلیم پانے سے اجتناب کیا۔

امرتسر واپس آنے پر کتاب بینی کا شوق بدستور بڑھتا گیا۔ چنانچہ یہ بات کہہ دینے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں نے روسی ادب میں زیادہ دل چسپی لینا شروع کر دی۔

اسی اثنا میں مجھے اکثر اردو اخبارات میں خدمتِ زبان، سرانجام دینے کا اتفاق ہوا۔ بسا اوقات میرے مضامین کو سراہا گیا بلکہ بعض احباب (نے) میری حوصلہ بندی کے لیے تعریفی جملے بھی کہے جن سے میری خواہشِ انشاء پردازی میں معتد بہ اضافہ ہوا۔

میں آج ان مضامین کو نیم جان محسوس کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ صاحب نظر احباب نے میری حوصلہ افزائی کے لیے میرے مضامین کو سراہا......... مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اپنی تحاریر کے ساتھ کسی دوسرے شغل سے بھی مطمئن نہیں اور اگر اسے مبالغے پر محمول نہ کیا جائے تو آج بھی اپنی کسی کوشش پر مطمئن نہیں ہوں۔ بقول مصداق ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اس میں کوئی کلام نہیں کہ میں نے ہر اس پرزۂ کاغذ تک سے فائدہ اٹھایا جس میں کسی بنئے نے بیکار دیکھ کر سودا باندھ کر مجھے دیا۔

میں نے (مجھے) مغربی اور مشرقی ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا لیکن کوئی ایسی کتاب دستیاب نہ ہو سکی جس سے میرے تشنہ مذاق کو طمانیت حاصل ہوتی۔

میں نے کئی ایک کتابیں خود لکھ دیں۔ کئی افسانے، کئی ڈرامے اور متعدد مضامین ریڈیو کے ذریعے سے نشر کیے گئے۔ اصحاب اور عوام کی طرف سے مجھے پے در پے خطوط موصول ہوئے۔ میری تعریفوں کے انبار لگا دیے گئے۔ بعض عقیدت مندوں نے تو مجھے اول صف کے ادیبوں میں لا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں آج بھی اپنے دل میں اطمینان نہیں پاتا۔

میرا خیال ہے کہ جس منزل کی مجھے تلاش ہے، ہنوز میری نظروں سے اوجھل ہے۔ میں یہاں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ میں نے اردو زبان سے اسکول کے زمانے میں بے اعتنائی سے کام لیا تھا۔ مجھے اس وقت اردو کی ان ہمہ گیریوں کا علم تک نہ تھا جو ایک ہی صحبت میں صاحب دلوں کو گرویدہ بنا لیتی ہیں۔

میں اردو زبان کی اس مٹھاس سے نا آشنا تھا جو ذائقے کو مدتوں اپنی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے اور میں اردو کی اس ہر دل عزیزی سے بھی کورا تھا جو (جس نے) اس ایک تھوڑی سی مدت میں دنیا بھر میں تیسرے (نمبر) درجے کی زبان بن کر عوام کو اپنی طرف متوجہ (کر لیا) تھا۔ ان سب کمزوریوں کے

باوصف میں نے اپنے مطالعے میں کوئی فروگزاشت نہ تھی (کی)۔

احباب نے مجھے بسڑی، چھچھورا اور ضدی تک کہنے سے گریز نہ کیا لیکن میں نے اپنے مذاق کی تکمیل میں دوستوں کی سُنی، ان سُنی کردی اور اس وقت تک کرمکِ کتابی بنا رہا جس وقت تک اپنی ڈور (دوڑ) دھوپ پر رائے زنی کر کے ندامت کا شکار ہونے سے بچ جانے کے قابل نہ ہوسکا۔

میرے ارادوں میں یہ بات داخل ہے کہ مجھے معراجِ ترقی کی طوالت ناپنے میں اپنی ساری زندگی صرف کرنا ہوگی۔ اور تاحینِ حیات، اس کوشش میں رہنا ہوگا کہ طمانیتِ قلب کے حصول کے لیے کوئی راستہ تلاش کرسکوں۔

o

بخدمت محترمی عبدالوحید صاحب:

علاوہ برایں معروضِ خدمت کہ فی الحال میرے پاکوئی فوٹو موجود نہیں ہے۔ میں آج کل بمبئی کے ایک فلمی ادارے ''فلمستان'' میں معقول مشاہرے پر ملازم ہوں اگرچہ دل کو اطمینان نصیب نہیں۔

مصروفیتوں کے مدنظر جلد تر تصویر نہ بھیج سکوں گا، لہٰذا فی الحال معذرت خواہ ہوں۔

نیاز مآل

سعادت حسن منٹو

سوانح حیات
سعادت حسن منٹو

دوستو۔ تم یہ سن کر شاید حیران ہو گے کہ میں
نے تا حال اپنی زندگانی میں اکتیس بہاریں دیکھی
ہیں۔ میری پیدائش پنجاب کے تجارتی مرکز
امرتسر میں ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو ہوئی۔ کہا جاتا ہے
گھر میں بچوں کی تربیت بہت خوب ہو جاتی ہے۔
لیکن میں اپنے گھریلو معاملات کی پیچیدگیوں میں
کچھ ایسی طرح سے گھرا تھا کہ امرتسر میں بمشکل
انٹرنس کا امتحان پاس کر سکا۔ میرا ابتدائی
دور اگرچہ خوش اثر تھا لیکن جب والد
صاحب کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد خاندانی

پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خیال بعد ازاں ذہن کو اپنی
طرف کھینچتا رہتا۔
گھر والوں نے والدہ صاحبہ سے عدم تعلیم کا ارادہ
بیان کیا۔ چنانچہ علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ بھیجا
گیا۔ چند مہینوں کی آزادی طبع کہ جب دم آ گیا
ناموافقت نے بستر علالت پر لٹا دیا۔ چار و ناچار
تعلیم پانے سے اجتناب کیا۔ امرتسر میں آنے پر
کتاب بینی کا شوق بدستور رہا۔ چنانچہ یہ
بات کہ اپنے میں مجھے کوئی جھجک بھی نہیں رہی کہ
روسی ادب میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی
اس اثنا میں مجھے اکثر رسائل و اخبارات میں خدمت

حصول کے لئے کوئی راستہ تلاش کر سکوں۔

بخدمت محترمی عبدالوحید صاحب

علاوہ ازیں معروض خدمت ہے کہ فی الحال میرے پاس کوئی فوٹو موجود نہیں ہے۔ میں آج کل بمبئی کے ایک فلمی ادارے "فلمستان" میں مستقل مشاہرے پر ملازم ہوں اگرچہ دل کو اطمینان نصیب نہیں۔ مصروفیتوں کے باعث جلد تر تصویر نہ بھیج سکوں گا۔ بخیال فی الحال معذرت خواہ ہوں۔

نیاز مآل

سعادت حسن منٹو

منٹو کے اس قلمی خط کے نادرالوجود اور بیش قیمت ہونے کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے گوشۂ مخطوط میں مشاہیر ادب کے سوا دو لاکھ سے زائد خط موجود ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سعادت حسن منٹو کا کوئی خط تا حال انجمن کو فراہم نہیں ہو سکا ہے۔[۲]

سعادت حسن منٹو کی یہ اصل، قلمی تحریر ایک بیش قیمت سرمایہ ہے، جسے میں منٹو کے متخصص عزیز گرامی ڈاکٹر علی ثنا بخاری کی تحویل میں دے رہا ہوں۔ علی ثنا، اس تحریر کے غیر مطبوعہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

امید ہے اور یقین بھی کہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری، منٹو کی اس قلمی یادگار تحریر کی حفاظت کے بہتر کفیل ثابت ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ پروفیسر محمد اسلم (۱۹۳۲ء۔۱۹۹۸ء) نے اپنی تالیف ''خفتگانِ خاک لاہور'' (مطبوعہ، ادراہ تحقیقات پاکستان، لاہور مارچ ۱۹۹۳ء) میں ماہنامہ ''تعلیم وتربیت'' کے سابق مدیر ڈاکٹر عبدالوحید مرحوم کے لوحِ مزار پر درج عبارت پیش کی ہے جوان کے بارے میں ضروری کوائف تک رسائی کا موجب بنتی ہے۔ کتبے کے مطابق: ''آخری آرام گاہ ڈاکٹر عبدالوحید خلف الصدق الحاج مولوی فیروز الدین، بانی وچیئر مین فیروز سنز لیبارٹریز لمیٹڈ، سابق چیئر مین فیروز سنز لمیٹڈ، ٹرسٹی فیروز سنز ٹرسٹ وبانی فاطمہ میموریل ہسپتال، لاہور۔ تاریخ وصال ۹۔ اگست ۱۹۸۵ء بروز جمعہ المبارک بمطابق ۲۲۔ ذوالقعدہ ۱۴۰۵ ھجری''۔

۲۔ دیکھیے ہفتہ روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی، یکم تا ۷ مارچ ۲۰۰۲ء ص:۱

منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں

[انتقال سے چند ماہ پہلے منٹو نے یہ مضمون اپنے بارے میں لکھا تھا۔اس وقت اس کی نوعیت اور تھی۔لیکن اب یہ آواز دوسری دنیا سے آتی معلوم ہوتی ہے ''ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے۔لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعادت حسن مرجائے اور منٹو نہ مرے''۔سعادت حسن کا یہ خیال غلط نکلا، قیاس صحیح ثابت ہوا۔اکٹھے پیدا ہونے والے اکٹھے نہیں مرتے ہیں۔منٹو کا صرف ہمزاد اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔(ادارہ افکار)]

منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جاچکا ہے اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔یہ تحریریں اگر پیش نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحبِ عقل منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کرسکتا۔میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے اس لیے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے اور سچ پوچھیئے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے حقیقت سے بالاتر ہے۔بعض اسے شیطان کہتے ہیں، بعض گنجا فرشتہ ——— ذرا ٹھہریئے میں دیکھ لوں کہیں وہ کم بخت یہیں سن تو نہیں رہا ——— نہیں نہیں ٹھیک ہے۔مجھے یاد آگیا کہ یہ وہ وقت ہے جب وہ پیا کرتا ہے۔اس کو شام کے چھ بجے کے بعد کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعادت حسن

مر جائے اور منٹو نہ مرے اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔ اس لیے کہ میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نباہنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہوگئی۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے۔ مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی تثلیث نہیں ہوئی۔ یہ اشارے ایسے ہیں جو صرف بافہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی وقت ۱۱ مئی سنہ ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ خود کو کچھوا بنائے رکھے، جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپا لے تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں تو اس کا سراغ نہ ملے۔ لیکن میں بھی آخر اس کا ہمزاد ہوں میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجئے اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خرذات افسانہ نگار کیسے بنا؟ تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شوپن ہار، فرائڈ، ہیگل، نٹ شے، مارکس کے حوالے دیتے ہیں مگر حقیقت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا باعث ہے۔ اس کے والد خدا انہیں بخشے بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل میں باہر نکلا ہوگا، اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

اب میں اس کی اسکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں۔ بہت ذہین لڑکا تھا اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین فٹ ہوگا۔ وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ کی محبت تو میسر تھی لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے ان سے اس کو کبھی ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا، اس لیے کہ وہ سوتیلے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں، اس سے بڑے بھائیوں ایسا سلوک کریں۔ یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔

اچھا اب اُس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنیئے۔ وہ اوّل درجے کا فراڈ ہے۔ پہلا افسانہ اس نے

بعنوان ''تماشہ'' لکھا جو جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے سے متعلق تھا۔ یہ اُس نے اپنے نام سے نہ چھپوایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کی دست برد سے بچ گیا۔

اس کے بعد اُس کے متلوّن مزاج میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اس نے انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کیا، وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔ اور آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے میں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اُردو کا بہت بڑا ادیب ہے اور میں یہ سن کر ہنستا ہوں اس لیے کہ اردو اب بھی اسے نہیں آتی۔ وہ لفظوں کے پیچھے یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی جال والا شکاری تتلیوں کے پیچھے۔ وہ اس کے ہاتھ نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں خوبصورت الفاظ کی کمی ہے۔ وہ لٹھ مار ہے لیکن جتنے لٹھ اس کی گردن پر پڑے ہیں، اس نے بڑی خوشی سے برداشت کیے ہیں۔

اس کی لٹھ بازی عام محاورے کے مطابق جاٹوں کی لٹھ بازی نہیں ہے۔ وہ بنوٹ اور پھکیت ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا، بلکہ تنے ہوئے رسّے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا —— لیکن وہ کم بخت آج تک کبھی نہیں گرا —— شاید گر جائے، اوندھے منہ —— کہ پھر نہ اٹھے، لیکن میں جانتا ہوں کہ مرتے وقت وہ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسی لیے گرا تھا کہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہو جائے۔

میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اوّل درجے کا فراڈ ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ وہ افسانہ نہیں سوچتا خود افسانہ اسے سوچتا ہے۔ یہ بھی ایک فراڈ ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے جب کسی مرغی کو انڈا دینا ہوتا ہے لیکن وہ یہ انڈا چھپ کر نہیں دیتا۔ سب کے سامنے دیتا ہے۔ اس کے دوست یار بیٹھے ہوئے ہیں، اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیئے جاتا ہے، جو بعد میں چوں چوں کرتے افسانے بن جاتے ہیں۔ اس کی بیوی اس سے بہت نالاں ہے۔ وہ اس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو —— کوئی دکان کھول لو لیکن منٹو کے دماغ میں جو دکان کھلی ہے اس میں منیاری کے سامان سے کہیں زیادہ سامان موجود ہے۔ اس لیے وہ اکثر سوچا کرتا ہے اگر میں نے کبھی کوئی اسٹور کھول لیا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کولڈ اسٹوریج یعنی سرد خانہ بن جائے —— جہاں اس کے تمام خیالات اور افکار منجمد ہو جائیں۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ منٹو مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ اس کی ہر چیز برداشت کی جا سکتی ہے مگر خفگی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ خفگی کے عالم میں وہ بالکل شیطان بن جاتا ہے لیکن صرف چند منٹوں کے لیے اور وہ چند منٹ، اللہ کی پناہ ــــــ

افسانہ لکھنے کے معاملے میں وہ نخرے ضرور بگھارتا ہے لیکن میں جانتا ہوں، اس لیے ــــــ کہ اس کا ہمزاد ہوں ــــــ کہ وہ فراڈ کر رہا ہے ــــــ اس نے ایک دفعہ خود لکھا تھا کہ اس کی جیب میں بے شمار افسانے پڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جب اسے افسانہ لکھنا ہو گا تو وہ رات کو سوچے گا ــــــ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ صبح پانچ بجے اٹھے گا اور اخباروں سے کسی افسانے کا رس چوسنے کا خیال کرے گا ــــــ لیکن اسے ناکامی ہو گی۔ پھر وہ غسل خانے میں جائے گا۔ وہاں وہ اپنے شوریدہ سر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ سوچنے کے قابل ہو سکے لیکن ناکام رہے گا۔ پھر جھنجھلا کر اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع کر دے گا۔ یہاں سے بھی ناکامی ہو گی تو باہر پان لینے کے لیے چلا جائے گا۔ پان اس کی ٹیبل پر پڑا رہے گا لیکن افسانے کا موضوع اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آئے گا۔ آخر وہ انتقامی طور پر قلم یا پنسل ہاتھ میں لے گا اور ۷۸۶ لکھ کر جو پہلا فقرہ اس کے ذہن میں آئے گا، اس سے افسانے کا آغاز کر دے گا۔

بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہتک، ممی، موذیل، یہ سب افسانے اس نے اسی فراڈ طریقے سے لکھے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ لوگ اسے بڑا غیر مذہبی اور فحش انسان سمجھتے ہیں اور میرا بھی خیال ہے کہ وہ کسی حد تک اس درجہ میں آتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر اوقات وہ بڑے گہرے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور ایسے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے، جن پر اعتراض کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا پہلے صفحے کی پیشانی پر ۷۸۶ ضرور لکھا جس کا مطلب ہے۔ بسم اللہ ــــــ اور یہ شخص جو اکثر خدا سے منکر نظر آتا ہے کاغذ پر مومن بن جاتا ہے۔ یہ وہ کاغذی منٹو ہے، جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح صرف انگلیوں ہی میں توڑ سکتے ہیں، ورنہ وہ لوہے کے ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔

اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں۔ جو چند القاب ہیں بیان کیے دیتا ہوں۔ وہ چور ہے۔ جھوٹا ہے۔ دغاباز ہے اور مجمع گیر ہے۔

اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی سو روپے اُڑائے ہیں۔ ادھر آٹھ سو لا کے دیئے اور چور آنکھ سے دیکھتا رہا کہ اس نے کہاں رکھے ہیں اور دوسرے دن اس میں سے ایک سبزہ غائب کر دیا اور اس بے چاری کو جب اپنے اس نقصان کی خبر ہوئی تو اس نے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا——

یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے لیکن میں اس سے اتفاق کرنے کے لیے تیار نہیں وہ اوّل درجے کا جھوٹا ہے—— شروع شروع اس کا جھوٹ اس کے گھر چل جاتا تھا، اس لیے کہ اس میں منٹو کا ایک خاص ٹچ ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کی بیوی کو معلوم ہو گیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملے کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا، جھوٹ تھا۔

منٹو جھوٹ بقدرِ کفایت بولتا ہے لیکن اس کے گھر والے، مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس کی ہر بات جھوٹی ہے—— اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال پر سرمے سے بنا رکھا ہو۔

وہ اَن پڑھ ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے۔ ہیولک ایلس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ—— میرا مطلب ہے تنقید نگار، یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، منٹو کسی دوسرے شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہیے اس کو خود سمجھنا چاہیے۔

خود کو سمجھا سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔ میں آپ کو پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ منٹو، جس پر فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں، بہت طہارت پسند ہے لیکن میں یہ بھی کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پا انداز ہے جو خود کو جھاڑتا پھٹکتا رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

پانچواں مقدمہ

اپنے افسانوں کے سلسلے میں مجھ پر چار مقدمے چل چکے تھے۔ پانچواں اب چلا ہے، جس کی روداد میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

پہلے چار افسانے جن پر مقدمہ چلا، ان کے نام حسبِ ذیل ہیں:

(۱) کالی شلوار

(۲) دھواں

(۳) بُو

(۴) ٹھنڈا گوشت

اور پانچواں: ''اوپر، نیچے اور درمیان''

پہلے تین افسانوں میں تو میری خلاصی ہوگئی۔ ''کالی شلوار'' کے سلسلے میں مجھے دلّی سے دو تین بار لاہور آنا پڑا۔ ''دھواں'' اور ''بو'' نے مجھے بہت تنگ کیا، اس لیے کہ مجھے بمبئی سے لاہور آنا پڑتا تھا ——— لیکن ''ٹھنڈا گوشت'' کا مقدمہ سب سے بازی لے گیا۔ اس نے میرا بھُرکس نکال دیا۔

یہ مقدمہ گو یہاں پاکستان ہی میں ہوا، مگر عدالتوں کے چکّر کچھ ایسے تھے جو مجھ ایسا حساس آدمی برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن عدالت ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر توہین برداشت کرنا ہی پڑتی ہے۔

خدا کرے کسی کو، جس کا نام ''عدالت'' ہے، اس سے واسطہ نہ پڑے۔ ایسی عجیب جگہ میں نے کہیں بھی نہیں دیکھی۔

پولیس والوں ۔ مجھے نفرت ہے۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ ہمیشہ ایسا سلوک کیا ہے جو گھٹیا

قسم کے اخلاقی ملزموں سے کیا جاتا ہے۔

پچھلے دنوں جب کراچی کے ایک پرچے ''پیامِ مشرق'' نے میری اجازت کے بغیر میرا مضمون ''اوپر نیچے اور درمیان'' لاہور کے اخبار ''احسان'' سے نقل کیا تو کراچی کی حکومت نے میرا وارنٹ جاری کر دیا۔

میں گھر پر نہیں تھا۔ پولیس کے دو سب انسپکٹر، چار سپاہیوں کے ساتھ آئے اور میرے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ میری بیوی نے ان سے کہا کہ منٹو باہر گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اسے ابھی بلا لیتی ہوں۔ مگر وہ نہ مانے۔ وہ مُصر تھے کہ منٹو گھر ہی میں ہے اور میری بیوی جھوٹ بول رہی ہے۔

جب پولیس آئی تھی، میں اس وقت چوہدری نذیر احمد کی دکان ''نیا ادارہ'' میں، جو ''سویرا'' کا دفتر بھی ہے، بیٹھا تھا اور میں نے ایک افسانہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اس افسانے کی میں نے بمشکل دس سطریں لکھی ہوں گی کہ چوہدری رشید احمد صاحب جو چوہدری نذیر کے چھوٹے بھائی ہیں اور مکتبہ جدید کے مالک ہیں، تشریف لائے۔ انہوں نے کچھ توقف کے بعد پوچھا ''یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''ایک افسانہ شروع کیا ہے —— لیکن یہ بہت لمبا ہوگا''۔

چوہدری رشید صاحب نے بڑے تشویش ناک لہجے میں کہا: ''میں آپ کو ایک بہت بری خبر سنانے آیا ہوں۔''

ظاہر ہے کہ میرا ردِ عمل کیا ہوگا۔ چند منٹ تو میں سوچتا رہا کہ ''بہت بری خبر'' کیا ہو سکتی ہے۔ کئی خیال دماغ میں آئے۔ میں اُوپر، نیچے اور درمیان ہوتا رہا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

آخر میں نے چوہدری رشید سے پوچھا کہ بھائی، قصہ کیا ہے؟

انہوں نے کہا: ''قصہ یہ ہے کہ پولیس آپ کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑی ہے۔ وہ مُصر ہے کہ آپ گھر میں موجود ہیں، اس لیے وہ زبردستی اندر داخل ہونے کوشش کر رہی ہے۔''

میرے پاس احمد راہی اور حمید اختر بیٹھے تھے۔ جب اُن کو یہ خبر ملی تو وہ بہت مضطرب ہوئے۔ چنانچہ وہ بھی میرے ساتھ ہو لیے۔

ہم نے تانگہ لیا اور گھر روانہ ہوئے۔

جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ فلیٹ کے دروازے کے پاس پولیس کھڑی ہے۔

میرا بھانجا اور برادرِ نسبتی (حامد جلال اور ظہیر الدین) اپنی موٹروں کے پاس کھڑے پولیس والوں سے محوِ گفتگو تھے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ اگر آپ تلاشی لینا چاہتے ہیں تو لے سکتے ہیں۔ آپ یقین

مانئے کہ منٹو گھر میں نہیں ہے۔

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ میں، احمد راہی اور حمید اختر تانگے میں گھر پہنچ گئے۔ ہم نے راستے میں چوہدری رشید صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ مختلف اخباروں کو ٹیلی فون کر دیں تا کہ دوسرے روز، جو کچھ میرے ساتھ گزرا ہے، اخباروں میں چھپ جائے۔

میں، حمید اختر اور احمد راہی جب گھر پہنچے تو دیکھا کہ عبداللہ ملک کھڑا پولیس کے افسروں سے گفتگو میں مصروف ہے۔

عبداللہ ملک کیمونسٹ ہے۔ اس کی تحریر ہمیشہ ''سرخ'' ہوتی ہے حالانکہ میں نے اس میں کبھی وہ سرخی نہیں دیکھی جو اصل سرخی ہے۔ عبداللہ کیمونسٹ میرے مکان کے باہر کھڑا تھا اور سب انسپکٹروں اور سپاہیوں سے گفتگو کر رہا تھا—— میں، احمد راہی اور حمید اختر تانگے میں پہنچے۔

سب انسپکٹروں اور سپاہیوں نے میری بیوی اور میری بہن کو یہ دھمکی دی تھی کہ وہ تلاشی لینا چاہتے ہیں اور اگر دروازے نہ کھولے گئے تو وہ زبردستی اندر گھس آئیں گے۔

میں جب آیا اور باہر کمپونڈ میں ان پولیس افسروں سے ملاقات ہوئی تو میرا خیال ہے کہ انہیں بقدرِ کفایت ندامت ہوئی۔ میں نے انہیں اندر مکان میں تشریف لانے کے لیے کہا۔ یہ دعوت انہوں نے قبول فرمائی اور اندر تشریف لے آئے۔

دو افسر تھے، بڑے اکھڑ قسم کے—— میں نے ان سے ان کی ملاقات کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ کراچی سے وارنٹ آئے ہیں کہ آپ کی خانہ تلاشی لی جائے۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ میں کوئی خفیہ فروش نہیں ہوں۔ افیون نہیں بیچتا، شراب کا غیر قانونی کاروبار نہیں کرتا۔ میرے پاس کوکین بھی نہیں ہے، پھر یہ پولیس والے جو کراچی سے وارنٹ لے کر آئے ہیں، میری خانہ تلاشی کیوں لے رہے ہیں؟

پولیس افسر جب اندر تشریف لائے تو انہوں نے مجھ سے، پہلے یہ سوال کیا کہ تمہاری لائبریری کہاں ہے؟

اب میں ان سے کیا کہتا۔ میری لائبریری یہاں پاکستان میں چند کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں تین ڈکشنریاں یا لغت ہیں۔

میں نے اُن سے عرض کی: ''میری جتنی کتابیں تھیں، وہ تو بمبئی میں رہ گئیں۔ آپ کو اگر کسی پرچے یا

پرزے کی تلاش ہے تو آپ بمبئی تشریف لے جائیں۔ ایڈریس حاضر ہے۔''

وہ افسر کچھ ایسے با ذوق تھے کہ انہوں نے اس بذلہ سنجی کی داد نہ دی اور میری خانہ تلاشی شروع کر دی ــــ خانہ، میرا مے خانہ نہیں۔ البتہ بیئر کی آٹھ دس خالی بوتلیں ضرور تھیں لیکن پولیس افسروں نے ان کو دیکھنے کی زحمت نہ کی۔

الماریوں میں چینی کے پیالے تھے۔ میری ایک تپائی پر چھوٹا سا بکس تھا جس میں کچھ کاغذات تھے۔ پولیس افسروں نے اس کا ایک ایک پرزہ دیکھا۔ اخباروں کے چند تراشے تھے۔ وہ انہوں نے اپنے قبضے میں لے لیے۔

اس کے بعد میں نے ان افسروں سے کہا کہ اب براہ کرم تلاشی کے وارنٹ جو دارالحکومت کراچی سے آئے ہیں، دکھا دیجئے ــــ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

وارنٹ کا کاغذ ایک حوالدار کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے مجھے دور سے دکھاتے ہوئے کہا: ''یہ ہے ــــ'' میں نے اس سے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

اس نے جواب دیا کہ ''یہ وہی چیز ہے جس کے ذریعے سے ہم یہاں پہنچے ہیں۔''

جب میں نے اصرار کیا کہ میں یہ کاغذ دیکھے بغیر نہیں ٹلوں گا تو انہوں نے وارنٹ کا کاغذ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے رکھا اور کہنے لگے کہ آپ پڑھ لیجئے۔

میں نے سرسری طور پر پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ خانہ تلاشی کے علاوہ یہ کاغذ میری گرفتاری کا وارنٹ بھی ہے۔ اب ضمانت کا مرحلہ درپیش آیا۔

پولیس افسر کچھ اتنے خود سر تھے کہ انہوں نے کسی کی ضمانت قبول نہ کی ــــ میرا بھانجا تھا گزیٹڈ افسر، میرا برادرِ نسبتی، وہ بھی گزیٹڈ افسر، مگر پولیس والوں نے ان کی ضمانت قبول نہیں کی۔ ان سے یہ کہا کہ آپ حکومت کے ملازم ہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کل برطرف کر دیے جائیں۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ میں نے دو مرتبہ اپنی علالت کے باعث کراچی کی عدالت کو معذرت نامہ مع ڈاکٹری سرٹیفیکیٹ پیش کیا کہ میں حاضر عدالت نہیں ہو سکتا لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ مجھے بالآخر کراچی جانا ہی پڑا۔

یہ ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ یہاں جب آخری وارنٹ آئے تو ضمانت دینے کے لیے گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔

میں اپنے بہت سے دوستوں کے پاس گیا مگر ان میں سے کوئی بھی نہ ملا ــــ آخر محمد طفیل صاحب کے

پاس گیا۔ وہ بڑے شریف آدمی ہیں۔ وہ میرے ساتھ بادل ناخواستہ یا خواستہ ہو لیے۔ ضمانت ہوگئی، اس لیے کہ ان کا ایک ادبی ادارہ ہے (جو "نقوش" کے مالک بھی ہیں اور مدیر بھی) اور ان کی دکان میں جتنی کتابیں ہیں، وہ اس کی ضمانت ہیں کہ وہ پانچ ہزار روپے کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

ایک اور لطیفہ سنئے: طفیل صاحب نے ضمانت تو دے دی مگر انہیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ شاید میں تاریخ مقررہ پر حاضر عدالت نہیں ہوں گا۔

خدا گواہ ہے کہ میرے پاس زہر کھانے کو بھی ایک پیسہ نہیں تھا، مگر طفیل صاحب صبح پانچ بجے میرے غریب خانے پر تشریف لے آئے۔ ان کی جیب میں دو سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ تھے —— تانگے کا خرچ بھی انہوں نے دیا۔ اسٹیشن تک چھوڑنے گئے اور جب تک گاڑی کراچی روانہ نہ ہوئی، میرے ساتھ رہے —— میرے ساتھ انہوں نے میرا ایک دوست نصیر انور کر دیا تھا تاکہ میں کراچی یقینی طور پر پہنچ جاؤں۔

کراچی میں جو کچھ مجھ پر بیتی، اس کا حال آپ کو پھر کبھی سناؤں گا۔ اس لیے کہ سخت بیمار ہوں۔

☆☆☆☆☆

میں کیوں لکھتا ہوں؟

............میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ ایک ایسا ہی سوال ہے کہ میں کیوں کھاتا ہوں۔ میں کیوں پیتا ہوں لیکن اس لحاظ سے مختلف ہے کہ کھانے اور پینے پر مجھے روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور جب لکھتا ہوں تو مجھے نقدی کی صورت میں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ پر جب گہرائی میں جاتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ اس لیے کہ میں روپے کے بل بوتے ہی پر لکھتا ہوں۔

اگر مجھے کھانا پینا نہ ملے تو ظاہر ہے کہ میرے قویٰ اس حالت میں نہیں ہوں گے کہ میں قلم ہاتھ میں پکڑ سکوں۔ ہوسکتا ہے فاقہ کشی کی حالت میں دماغ چلتا رہے، مگر ہاتھ کا چلنا تو ضروری ہے۔ ہاتھ نہ چلے تو زبان ہی چلنی چاہیے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ انسان کھائے پئے بغیر کچھ بھی نہیں کرسکتا۔

لوگ فن کو اتنا اونچا رتبہ دیتے ہیں اس کے ڈانڈے ساتویں آسمان سے ملادیتے ہیں۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ ارفع و اعلیٰ شے ایک سوکھی روٹی کی محتاج ہے۔

میں لکھتا ہوں، اسلیے کہ مجھے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں لکھتا ہوں، اس لیے کہ میں کچھ کما سکوں، تا کہ میں کچھ کہنے کے قابل ہوسکوں۔

روٹی اور فن کا رشتہ بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ خداوند تعالیٰ کو یہی منظور ہے۔ وہ خود کو ہر چیز سے بے نیاز کہتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ وہ بے نیاز اور بے احتیاج ہرگز نہیں ہے۔ اس کو عبادت چاہئے اور عبادت بڑی ہی نرم و نازک روٹی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ چپڑی ہوئی روٹی ہے، جس سے وہ اپنا پیٹ بھرتا ہے

سعادت حسن منٹو لکھتا ہے، اس لیے کہ وہ خدا جتنا بڑا افسانہ ساز اور شاعر نہیں۔ یہ اس کا عجز ہے جو اس سے لکھواتا ہے۔

☆☆☆☆☆

افسانے

۱۔ خودکشی کا اقدام

۲۔ پھوجا حرامدا

۳۔ مہتاب خاں

۴۔ ڈائرکٹر کرپلانی

۵۔ ملبے کا ڈھیر

۶۔ شراب

۷۔ سُرمہ

۸۔ کالی کلی

خودکشی کا اقدام

اقبال کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس نے اپنی جان کو اپنے ہاتھوں ہلاک کرنے کی کوشش کی، گو وہ اس میں ناکام رہا۔ جب وہ عدالت میں پہلی مرتبہ پیش کیا گیا تو اُس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت سے مڈبھیڑ ہوتے وقت اس کی رگوں میں تمام خون خشک ہو کر رہ گیا ہے، جس کی وجہ سے اس کی تمام طاقت سلب ہو گئی ہے۔

اقبال کی عمر بیس بائیس برس کے قریب ہو گی، مگر مرجھائے ہوئے چہرے پر کھنڈی ہوئی زردی نے اس کی عمر میں دس سال کا اضافہ کر دیا تھا اور جب وہ اپنی کمر کے پیچھے ہاتھ رکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ واقعی بوڑھا ہے۔ سنا گیا ہے کہ جب شباب کے ایوان میں غربت داخل ہوتی ہے تو تازگی بھاگ جایا کرتی ہے۔ اس کے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں سے یہ عیاں تھا کہ وہ غربت کا شکار ہے اور غالباً حد سے بڑھی ہوئی مفلسی ہی نے اسے اپنی پیاری جان کو ہلاک کرنے پر مجبور کیا تھا۔

اس کا قد کافی لمبا تھا جو کاندھوں پر ذرا آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اِس جھکاؤ میں اُس کے وزنی سر کو بھی دخل تھا جس پر سخت اور موٹے بال، جیل خانے کے سیاہ اور کھردرے کمبل کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جو بہت گہری اور اتھاہ معلوم ہوتی تھیں۔ جھکی ہوئی نگاہوں سے یہ پتا چلتا تھا کہ وہ عدالت کے سنگیں فرش کی موجودگی کو غیر یقینی سمجھ رہا ہے اور یہ ماننے سے انکار کر رہا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ ناک پتلی اور تیکھی، اس کے ماتھے پر تھوڑا سا چکنا میل جما ہوا تھا جس کو دیکھ کر زنگ آلود تلوار کا تصور آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ پتلے پتلے ہونٹ جو کناروں پر ایک لکیر بن کر رہ گئے تھے، آپس میں سلے

ہوئے معلوم ہوتے تھے۔شاید اُس نے ان کو اس لیے بھینچ رکھا تھا کہ وہ اپنے سینے کی آگ اور دھوئیں کو باہر نکالنا نہیں چاہتا تھا۔

میلے پائجامے میں اس کی سوکھی ہوئی ٹانگیں اوپر کے دھڑ کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا دو خشک لکڑیاں تنور کے منہ میں ٹھنسی ہوئی ہیں۔سینہ چوڑا چکلا تھا مگر ہڈیوں کے ڈھانچے پر، جس کی پسلیاں پھٹے ہوئے گریبان میں سے جھانک رہی تھیں، گوشت سانولے رنگ کی جھلی معلوم ہوتا تھا۔سانس کی آمد وشد سے یہ جھلی بار بار پھولتی اور دبتی تھی۔

پیروں میں کپڑے کا جاپانی جوتا تھا جو جگہ جگہ سے بے حد میلا ہو رہا تھا۔دونوں جوتے انگوٹھوں کے مقام پر سے پھٹے ہوئے تھے۔ان سوراخوں میں سے اُس کے انگوٹھوں کے بڑھے ہوئے ناخن نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔وہ کوٹ پہنے ہوئے تھا جو اس کے بدن پر بہت ڈھیلا تھا۔اس میلے اور سال خوردہ کوٹ کی خالی پھٹی ہوئی جیبیں بے جان مردوں کی طرح منہ کھولے ہوئے تھیں۔

وہ کٹہرے کے ڈنڈے پر ہاتھ رکھے اور سر جھکائے جج کے سامنے بالکل خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

''تم نے ۲۰ جون کو ہفتے کے دن مانانوالہ اسٹیشن کے قریب ریل کی پٹڑی پر لیٹ کر اپنی جان ہلاک کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک شدید جرم کے مرتکب ہوئے۔'' جج نے ضمنی کاغذات پڑھتے ہوئے کہا ''بتاؤ، یہ جرم جو تم پر عائد کیا گیا ہے، کہاں تک درست ہے؟''

''جرم!'' اقبال اپنے گہرے خواب سے گویا چونک سا پڑا لیکن فوراً ہی اس کا وزنی سر جو ایک لمحے کے لیے اُٹھا تھا پھر بیل کی پتلی ٹہنی کے بوجھل پھل کی طرح لٹک گیا۔

''بتاؤ، یہ جرم جو تم پر عائد کیا گیا ہے کہاں تک درست ہے؟'' جج نے سکول کے استاد کی طرح وہی سوال دُہرایا جو وہ اس سے پہلے ہزار ہا لوگوں سے پوچھ چکا تھا۔

اقبال نے اپنا سر اُٹھایا اور جج کی طرف اپنی بے حس آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا، پھر تھوڑی دیر کے بعد دھیمے لہجے میں کہا ''میں نے آج تک کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔''

عدالت کے کمرے میں کامل سکوت طاری تھا، شاید اس کا باعث اقبال کا دہشت نما سراپا تھا، جس میں بلا کی ہیبت تھی۔جج اس کی نگاہوں کے خوفناک خلا سے خوف کھا رہا تھا۔کورٹ انسپکٹر نے جو جنگلے سے باہر بلند کرسی پر بیٹھا تھا، کمرے کے سکوت کے دہشت ناک اثر کو دور کرنے کے لیے یوں ہی دو تین مرتبہ

اپنا گلا صاف کیا، ریڈر نے جو پلیٹ فارم پر بچھے ہوئے تخت پر جو جج کے قریب بیٹھا تھا، مثلوں کے کاغذات اِدھر اُدھر رکھتے ہوئے اپنی پریشانی اور ڈر دور کرنے کی سعی کی۔

جج نے ریڈر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ریڈر نے کورٹ انسپکٹر کی طرف اور کورٹ انسپکٹر جواب میں اپنا حلق صاف کرنے کے لیے دو مرتبہ کھانسا۔ جب کمرے کا خوف آمیز سکون ٹوٹا تو جج نے میز پر کہنیاں ٹیک کر سامنے پڑے ہوئے قلم دان کے ایک خانے میں سے لوہے کی چمکتی ہوئی پن نکال کر اپنے دانتوں کی ریخ میں گاڑتے ہوئے اقبال سے کہا:۔

''کیا تم نے خودکشی کا اقدام کیا تھا؟''

''جی ہاں!'' یہ جواب اقبال نے ایسے لہجے میں دیا کہ اس کی آواز ایک لرزاں سرگوشی معلوم ہوئی۔

جج نے فوراً ہی کہا ''تو پھر اپنے جرم کا اقبال کرتے ہو؟''

''جرم!'' وہ پھر چونک پڑا اور تیز لہجے میں بولا '' آپ کس جرم کا ذکر کر رہے ہیں؟ اگر کوئی خدا ہے تو وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں ہمیشہ اس سے پاک رہا ہوں۔''

جج نے اپنے لبوں پر زور دے کر ایک بیمار مسکراہٹ پیدا کی ''تم نے خودکشی کا اقدام کیا اور یہ جرم ہے۔ اپنی یا کسی غیر کی جان لینے میں کوئی فرق نہیں، ہر صورت میں وار انسان پر ہوتا ہے۔''

اقبال نے جواب دیا ''اس جرم کی سزا کیا ہے؟ یہ کہتے ہوئے اس کے پتلے ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسم ناچ رہا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سان پر چاقو کی دھار تیز کرتے وقت چنگاریوں کی پھوار گر رہی ہے۔

جج نے جلدی سے کہا ''ایک، دو یا تین ماہ کی قید ——''

اقبال نے یہی لفظ تول تول کر دہرائے، گویا وہ اپنے پستول کے میگزین کی تمام گولیوں کو بڑے اطمینان سے ایک نشانے پر خالی کرنا چاہتا ہے۔ ''ایک، دو یا تین ماہ کی قید! ——'' یہ لفظ دہرانے کے بعد وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد تیز و تند لہجے میں بولا، '' آپ کا قانون صریحاً موت کو طویل بنانا چاہتا ہے۔ ایک آدمی جو چند لمحات کے اندر اپنی دکھ بھری زندگی کو موت کے سکون میں تبدیل کر سکتا ہے، آپ اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ کچھ عرصے تک اور دکھ کے تلخ جام پیتا رہے۔ جو آسمان سے گرتا ہے آپ اسے کھجور پر لٹکا دیتے ہیں، آگ سے نکال کر کڑاہی میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ کیا قانون اسی ستم ظریفی کا نام ہے؟''

جج نے بارعب لہجے میں جواب دیا ''عدالت ان فضول سوالات کا جواب نہیں دے سکتی۔''

''عدالت ان فضول سوالات کا جواب نہیں دے سکتی، تو بتایئے وہ کن متین اور سنجیدہ سوالوں کا جواب دے سکتی ہے؟'' اقبال کے ماتھے پر پسینے کے سرد قطرے لرزنے لگے'' کیا عدالت بتا سکتی ہے کہ عدالت کے معنی کیا ہیں؟۔ کیا عدالت بتا سکتی ہے کہ ججوں اور مسجد کے ملاؤں میں کیا فرق ہے جو مرنے والوں کے سرہانے رٹی ہوئی سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے ہیں؟ کیا عدالت بتا سکتی ہے کہ اس کے قوانین اور مٹی کے کھلونوں میں کیا فرق ہے؟—— عدالت اگر اُن فضول سوالوں کا جواب نہیں دے سکتی تو اس سے کہئے کہ وہ ان معقول سوالوں کا جواب دے؟''

جج کے تیوروں پر خفگی کے آثار نمودار ہوئے اور اُس نے تیزی سے کہا'' اس قسم کی بے باکانہ گفتگو عدالت کی توہین ہے جو ایک سنگین جرم ہے۔''

اقبال نے کہا'' تو گفتگو کا کوئی ایسا انداز بتایئے جس سے آپ کی نیک چلن عدالت کی توہین نہ ہو۔''

جج نے جھلا کر جواب دیا'' جو سوال تم سے کیا جائے صرف اسی کا جواب دو، عدالت تمہاری تقریر سننا نہیں چاہتی۔''

''پوچھیئے! آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' اقبال کے چہرے پر یاس کی دُھند چھا رہی تھی اور اس کی آواز اُس گجر کی ڈوبتی ہوئی گونج معلوم ہوتی تھی جو رات کی تاریکیوں میں لوگوں کو وقت سے باخبر رکھتا ہے۔

یہ سوال کچھ اس انداز سے کیا گیا تھا کہ جج کے چہرے پر گھبراہٹ سی پیدا ہوگئی اور اس نے ایسے ہی میز پر سے کاغذات اُٹھائے اور پھر وہیں کے وہیں رکھ دیئے اور دانت کی رنج میں سے پن نکال کر'' پن کشن'' میں گاڑتے ہوئے کہا۔'' تم نے اپنی جان لینے کی کوشش کی، اس لیے تم از روئے قانون مستوجب سزا ہو۔ کیا اپنی صفائی میں تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو؟''

اقبال کے بے جان اور نیلے ہونٹ فرطِ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس نے کہا'' بیان! آپ کس قسم کا بیان لینا چاہتے ہیں؟ کیا میں سراپا بیان نہیں ہوں؟—— کیا میرے گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ غربت کی دیمک میرے گوشت کو چاٹتی رہی ہے؟—— کیا میری بے نور آنکھیں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ میری زندگی کی بیشتر راتیں لکڑی اور تیل کے دھوئیں کے اندر گزری ہیں؟ کیا میرا سوکھا ہوا جسم یہ بیان نہیں دے رہا کہ اس نے کڑے سے کڑا دکھ برداشت کیا ہے؟—— کیا میری زرد بے جان اور کانپتی ہوئی انگلیاں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ وہ سازِ حیات کے

تاروں میں امید افزا نغمہ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں؟——بیان!....... بیان!——صفائی کا بیان!—— کس صفائی کا بیان؟—— میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا تھا، اس لیے کہ مجھے جینے کی خواہش نہ تھی اور جسے جینے کی خواہش نہ ہو، جو ہر جینے والے کو تعجب سے دیکھتا ہو، کیا آپ اس سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اس سنگین عمارت میں آ کر دو تین بوس کی قید سے بچنے کے لیے جھوٹ بولے؟——جج صاحب آپ اس سے بات کر رہے ہیں جس کی زندگی قید سے بدتر رہی ہے!''

جج پر زرد رو اقبال کی بے جوڑ جذباتی گفتگو کچھ اثر نہ کر سکی اور چار پانچ پیشیوں کی یک آہنگ سماعت کے بعد اُسے دو ماہ قید محض کا حکم سنا دیا گیا۔ سزا کا حکم مجرم نے بڑے اطمینان سے سنا، لیکن یکا یک اس کے استخوانی چہرے پر زہریلی طنز کے آثار نمودار ہوئے اور اُس کے باریک ہونٹوں کے سرے بھنچ گئے۔ مسکراتے ہوئے اس نے جج کو مخاطب کر کے کہا:

''آپ نے مقدمے کی تمام کارروائی میں بہت محنت کی ہے، جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مقدمہ کی روئداد کو آپ نے جس نفاست سے ان لمبے لمبے کاغذوں پر اپنے ہاتھوں سے ٹائپ کیا ہے، وہ بھی داد کے قابل ہے اور آپ نے بات بات میں تعزیرات کی بھاری بھرکم کتاب سے دفعات کا حوالہ جس پھرتی سے دیا ہے اس سے آپ کے حافظے کی خوبی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قانون، جہاں تک میں نے اندازہ کیا ہے، ایک پردہ نشین خاتون ہے جس کی عصمت کے تحفظ کے لیے آپ لوگ مقرر کیے گئے ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ آپ نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ ایک ایسی عورت کی حفاظت کر رہے ہیں جسے ہر چالاک آدمی اپنی داشتہ بنا کر رکھ سکتا۔''

''یہ لفظ عدالت کی توہین خیال کیے گئے اور اس جرم کے ارتکاب میں اقبال کی زندانی زندگی میں دو ماہ اور بڑھا دیئے گئے۔ یہ حکم سن کر اقبال کے پتلے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

اقبال نے زیر لب کہا ''پہلے دو ماہ تھے، اب چار ہو گئے'' اور پھر جج سے مخاطب ہو کر پوچھا ''آپ کو تعزیرات ہند کی تمام دفعات از بر یاد ہیں۔ کیا آپ مجھے کوئی اسی توہین کی قسم کا بے ضرر جرم بتا سکتے ہیں، جس کے ارتکاب سے آپ کی عدالت میری گردن جلاد کے حوالے کر سکے۔ میں اس دنیا میں زندہ نہیں رہنا چاہتا، جہاں غریبوں کو جینے کے لیے ہوا کے چند پاکیزہ جھونکے بھی نصیب نہیں ہوتے اور جس کے بنائے قانون میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ کیا آپ کا یہ قانون عجیب وغریب نہیں جس نے اس بات کی

تحقیق کیے بغیر کہ میں نے خودکشی کا اقدام کیوں کیا، مجھے جیل میں ٹھونس دیا ہے؟..... مگر ایسے سوال پوچھنے سے فائدہ ہی کیا؟ تعزیرات ہند میں غالباً ان کا کوئی جواب نہیں۔''

اقبال نے اپنے تھکے ہوئے مردہ کاندھوں کو ایک جنبش دی اور خاموش ہو گیا۔

عدالت نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

☆☆☆☆☆

پھوجا حرام دا

ٹی ہاؤس میں حرامیوں کی باتیں شروع ہوئیں تو یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ ہر ایک نے کم از کم ایک حرامی کے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے، جس سے اس کو اپنی زندگی میں واسطہ پڑ چکا تھا۔ کوئی جالندھر کا تھا۔ کوئی لدھیانے کا اور کوئی لاہور کا۔ مگر سب کے سب اسکول یا کالج کی زندگی کے متعلق تھے۔ مہر فیروز صاحب سب سے آخر میں بولے۔ آپ نے کہ —— امرت سر میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو پھوجے حرامدے کے نام سے ناواقف ہو۔ یوں تو اس شہر میں اور بھی کئی حرام زادے تھے مگر اس کے پلّے کے نہیں تھے۔ وہ نمبر ایک حرام زادہ تھا۔ اسکول میں اس نے تمام ماسٹروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر جس کو دیکھتے ہی بڑے بڑے شیطان لڑکوں کا پیشاب خطا ہو جاتا، پھوجے سے بہت گھبراتا تھا اس لئے کہ اس پر ان کے مشہور بید کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تنگ آ کر انہوں نے اس کو مارنا چھوڑ دیا تھا۔

یہ دسویں جماعت کی بات ہے۔ ایک دن یار لوگوں نے اس سے کہا، دیکھو پھوجے! اگر تم کپڑے اُتار کر ننگ دھڑنگ اسکول کا ایک چکر لگاؤ تو ہم تمہیں ایک روپیہ دیں گے۔ پھوجے نے روپیہ لے کر کان میں اڑسا۔ کپڑے اتار کر بستے میں باندھے اور سب کے سامنے چلنا شروع کر دیا۔ جس کلاس کے پاس سے گزرتا وہ زعفران زار بن جاتا۔ چلتے چلتے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے پاس پہنچ گیا۔ پِق اٹھائی اور غڑاپ سے اندر۔ معلوم نہیں کیا ہوا ہیڈ ماسٹر صاحب سخت بوکھلائے ہوئے باہر نکلے اور چپڑاسی کو بلا کر اس سے کہا۔ ''جاؤ۔ بھاگ کے جاؤ پھوجے حرامدے کے گھر۔ وہاں سے کپڑے لاؤ اس کے لیے۔

کہتا ہے میں مسجد کے سقادے میں نہار ہا تھا کہ میرے کپڑے کوئی چور اٹھا کر لے گیا''۔
دینیات کے ماسٹر مولوی پوٹیٹو تھے۔ معلوم نہیں انہیں پوٹیٹوکس رعایت سے کہتے تھے، کیونکہ آلوؤں کے تو ڈاڑھی نہیں ہوتی۔ ان سے پھوجا ذرا دبتا تھا۔ مگر ایک دن ایسا آیا کہ انجمن کے ممبروں کے سامنے مولوی صاحب نے غلطی سے اس سے ایک آیت کا ترجمہ پوچھ لیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ خاموش رہتا۔ مگر پھوجا حرامدا کیسے پہچانا جاتا۔ جومنہ میں آیا اول جلول بک دیا۔ مولوی پوٹیٹو کے پسینے چھوٹ گئے۔ ممبر باہر نکلے تو انہوں نے غصہ میں تھرتھر کانپتے ہوئے اپنا عصا اٹھایا اور پھوجے کو وہ چار چوٹ کی ماردی کہ بلبلا اٹھا۔ مگر بڑے ادب سے کہتا رہا کہ مولوی صاحب میرا قصور نہیں مجھے کلمہ ٹھیک سے نہیں آتا اور آپ نے ایک پوری آیت کا مطلب پوچھ لیا۔
مارنے سے بھی مولوی پوٹیٹو صاحب کا جی ہلکا نہ ہوا۔ چنانچہ وہ پھوجے کے باپ کے پاس گئے اور اس سے شکایت کی۔ پھوجے کے باپ نے ان کی سب باتیں سنیں اور بڑے رحم ناک لہجے میں کہا'' مولوی صاحب! میں خود اس سے عاجز آ گیا ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی اصلاح کیسے ہوسکتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے، میں پاخانے گیا تو اس نے باہر سے کنڈی چڑھادی میں بہت گرجا، بے شمار گالیاں دیں مگر اس نے کہا'' اٹھنی دینے کا وعدہ کرتے ہو تو دروازہ کھلے گا اور دیکھو اگر وعدہ کر کے پھر گئے تو دوسری مرتبہ کنڈی میں تالا بھی ہوگا'' ناچار اٹھنی دینی پڑی اب بتایئے میں ایسے نابکار لڑکے کا کیا کروں۔''

اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ اس کا کیا ہوگا۔ پڑھتا وڑھتا خاک بھی نہیں تھا انٹرنس کے امتحان ہوئے تو سب کو یقین تھا کہ بہت بری طرح فیل ہوگا مگر نتیجہ نکلا تو کلاس میں اس کے سب سے زیادہ نمبر تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کالج میں داخل ہو مگر باپ کی خواہش تھی کہ کوئی ہنر سیکھے، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دو برس تک آوارہ پھرتا رہا، اس دوران اس نے جو حرامزدگیاں کیں ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔ تنگ آ کر اس کے باپ نے بالا آخر اسے کالج میں داخل کروادیا۔ پہلے دن ہی اس نے یہ شرارت کی کہ میتھے میٹکس کے پروفیسر کی سائیکل اٹھا کر درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر لٹکا دی۔ سب حیران کہ سائیکل وہاں پہنچی کیونکر۔ مگر وہ لڑکے جو اسکول میں پھوجے کے ساتھ پڑھ چکے تھے۔ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ کارستانی اس کے سوا کسی کی نہیں ہوسکتی، چنانچہ اس ایک شرارت ہی سے اس کا پورے کالج سے تعارف ہوگیا۔ اسکول میں اس کی سرگرمیوں کا میدان محدود تھا۔ مگر کالج میں یہ بہت وسیع

ہو گیا۔ پڑھائی میں، کھیلوں میں، مشاعروں میں اور مباحثوں میں ہر جگہ پھوجے کا نام روشن تھا اور تھوڑی دیر میں اتنا روشن ہوا کہ شہر میں اس کے گنڈ پنے کی دھاک بیٹھ گئی۔ بڑے بڑے جگادری بدمعاشوں کے کان کاٹنے لگا۔ ناٹا قد مگر بدن کسرتی تھا۔ اس کی بھنیڈ ونگر بہت مشہور تھی۔ ایسے زور سے مدِ مقابل کے سینے میں یا پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر مارتا کہ اس کے سارے وجود میں زلزلہ سا آ جاتا۔

ایف۔اے۔ کے دوسرے سال میں اس نے تفریحاً پرنسپل کی نئی موٹر کے پٹرول ٹینک میں چار آنے کی شکر ڈال دی جس نے کاربن بن کر سارے انجن کو غارت کر دیا۔ پرنسپل کو کسی نہ کسی طریقے سے معلوم ہو گیا کہ یہ خطرناک شرارت پھوجے کی ہے مگر حیرت ہے کہ انہوں نے اس کو معاف کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پھوجے کو ان کے بہت سے راز معلوم تھے۔ ویسے وہ قسمیں کھاتا کہ اُس نے ان کو دھمکی وغیرہ بالکل نہیں دی تھی کہ انہوں نے سزا دی تو وہ انہیں فاش کر دے گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کا بہت زور تھا۔ انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا جلسے ہوتے تھے۔ حکومت کا تختہ الٹنے کی کئی ناکام سازشیں ہو چکی تھیں۔ گرفتاریوں کی بھرمار تھی۔ سب جیل باغیوں سے پُر تھے۔ آئے دن ریل کی پٹڑیاں اکھاڑی جاتی تھیں۔ خطوں کے بھکوں میں آتش گیر مادہ ڈالا جاتا تھا۔ بم بنائے جا رہے تھے۔ پستول برآمد ہوتے تھے۔ غرض کہ ایک ہنگامہ بپا تھا اور اس میں اسکول اور کالجوں کے طالب علم بھی شامل تھے۔ پھوجا سیاسی آدمی بالکل نہیں تھا۔ میرا خیال ہے اس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مہاتما گاندھی کون ہے۔ لیکن جب اچانک ایک روز اسے پولیس نے گرفتار کیا اور وہ بھی ایک سازش کے سلسلے میں تو سب کو بڑی حیرت ہوئی۔

اس سے پہلے کئی سازشیں پکڑی جا چکی تھیں۔ سانڈرس کے قتل کے سلسلے میں بھگت سنگھ اور دت کو پھانسی بھی ہو چکی تھی۔ اس لیے یہ نیا معاملہ بھی کچھ سنگین ہی معلوم ہوتا تھا۔ الزام یہ تھا کہ مختلف کالجوں کے لڑکوں نے مل کر ایک خفیہ جماعت بنائی تھی جس کا مقصد ملک معظم کی سلطنت کا تختہ الٹنا تھا۔

ان میں سے کچھ لڑکوں نے کالج کی لیبارٹری سے پکرک ایسڈ چرایا تھا جو بم بنانے کے کام آتا ہے۔ پھوجے کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ ان کا سرغنہ تھا اور اس کو تمام خفیہ باتوں کا علم تھا——!

اس کے ساتھ کالج کے دو اور لڑکے بھی پکڑے گئے تھے۔ ان میں ایک مشہور بیرسٹر کا لڑکا تھا اور دوسرا رئیس زادہ۔ ان کا ڈاکٹری معائنہ کرا لیا گیا تھا، اس لئے پولیس کی مار پیٹ سے بچ گئے مگر شامت غریب

پھوجے حرامدے کی آئی۔ تھانے میں اس کو اُلٹا لٹکا لٹکا کر پیٹا گیا۔ برف کی سلوں پر کھڑا کیا گیا۔ غرض کہ ہر قسم کی جسمانی اذیت اسے پہنچائی گئی کہ راز کی باتیں اگل دے مگر وہ بھی ایک کتے کی ہڈی تھا، ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ یہاں بھی کم بخت اپنی شراتوں سے باز نہ آیا۔ ایک مرتبہ جب وہ مار برداشت نہ کر سکا تو اس نے تھانے دار سے ہاتھ روک لینے کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ وہ سب کچھ بتا دے گا۔ بالکل نڈھال تھا اس لیے اس نے گرم گرم دودھ اور جلیبیاں مانگیں ——— طبیعت قدرے بحال ہوئی تو تھانیدار نے کاغذ قلم سنبھالا اور اس سے کہا لو بھئی اب بتاؤ ——— پھوجے نے اپنے مار کھائے ہوئے اعضاء کا جائزہ انگڑائی لے کر کیا اور جواب دیا ''اب کیا بتاؤں طاقت آ گئی ہے چڑھالو پھر مجھے اپنی ٹکٹکی پر''۔

ایسے اور بھی کئی قصے ہیں جو مجھے یاد نہیں رہے مگر یہ بہت پُر لطف تھے۔ ملک حفیظ ہمارا ہم جماعت تھا، اس کی زبان سے آپ سنتے تو اور ہی مزا آتا۔

ایک دن پولیس کے دو سپاہی پھوجے کو عدالت میں پیش کرنے کیلیے لے جا رہے تھے۔ ضلع کچہری میں اس کی نظر ملک حفیظ پر پڑی، جو معلوم نہیں کس کام سے وہاں آیا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی وہ پکارا۔ ''السلام علیکم ملک صاحب۔'' ملک صاحب چونکے۔ پھوجا ہتھکڑیوں میں ان کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا ——— ''ملک صاحب بہت اداس ہو گیا ہوں، جی چاہتا ہے آپ بھی آ جائیں میرے پاس۔ بس میرا نام لے دینا کافی ہے۔''

ملک حفیظ نے جب یہ سنا تو اس کی روح قبض ہو گئی۔ پھوجے نے اس کو ڈھارس دی۔ ''گھبراؤ نہیں ملک جی میں تو مذاق کر رہا ہوں۔ ویسے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔'' اب آپ ہی بتایئے کہ وہ کس لائق تھا۔ ملک حفیظ گھبرا رہا تھا۔ کنی کترا کے بھاگنے ہی والا تھا کہ پھوجے نے کہا'' بھئی اور تو ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا کہو تو تمہارے بدبودار کنویں کی گار نکلوا دیں۔''

ملک حفیظ ہی آپ کو بتا سکتا ہے کہ پھوجے کو اس کنویں سے کتنی نفرت تھی۔ اس کے پانی سے ایسی بساند آتی تھی جیسے مرے ہوئے چوہے سے۔ معلوم نہیں لوگ اسے صاف کیوں نہیں کراتے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد جیسا کہ ملک حفیظ کا بیان ہے وہ باہر نہانے کے لئے نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو تین ٹوبے کنویں کی گندگی نکالنے میں مصروف ہیں۔ بہت حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے۔ انہیں بلایا کس نے ہے؟ پڑوسیوں کا یہ خیال تھا کہ بڑے ملک صاحب کو بیٹھے بیٹھے خیال آ گیا ہوگا کہ چلو کنویں کی صفائی ہو جائے، یہ لوگ بھی کیا یاد رکھیں گے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ چھوٹے ملک کو اس بارے میں کچھ علم نہیں

اور یہ کہ بڑے تو شکار پر گئے ہوئے ہیں تو انہیں بھی حیرت ہوئی۔ پولیس کے بے وردی سپاہی دیکھے تو معلوم ہوا کہ پھوجے حرامدے کی نشان دہی پر وہ کنویں میں سے بم نکال رہے ہیں۔

بہت دیر تک گندگی نکلتی رہی۔ پانی صاف شفاف ہوگیا مگر بم کیا ایک چھوٹا سا پٹاخہ بھی برآمد نہ ہوا۔ پولیس بہت بھنّائی چنانچہ پھوجے سے باز پرس ہوئی۔ اس نے مسکرا کر تھانیدار سے کہا ''بھولے بادشاہو! ہمیں تو اپنے یار کا کنواں صاف کرانا تھا سو کرالیا۔''

بڑی معصوم سی شرارت تھی مگر پولیس نے اسے وہ مارا وہ مارا کہ مار مار کر ادھ موا کر دیا ـــــــ اور ایک دن یہ خبر آئی کہ پھوجا سلطانی گواہ بن گیا ہے اس نے وعدہ کرلیا ہے کہ سب کچھ بک دے گا۔

کہتے ہیں اس پر بڑی لعن طعن ہوئی۔ اس کے دوست ملک حفیظ نے بھی جو حکومت سے بہت ڈرتا تھا، اس کو بہت گالیاں دیں کہ حرام زادہ ڈر کے غدّار بن گیا ہے۔ معلوم نہیں اب کس کس کو پھنسائے گا۔

بات اصل میں یہ تھی کہ وہ مار کھا کھا کے تھک گیا۔ جیل میں اس سے کسی کو ملنے نہیں دیا جاتا تھا، مرغن غذائیں کھانے کو دی جاتی تھیں مگر سونے نہیں دیا جاتا تھا۔ کم بخت کو نیند بہت پیاری تھی اس لئے تنگ آکر اس نے سچے دل سے وعدہ کرلیا کہ بم بنانے کی سازش کے جملہ حالات بتا دے گا۔

یوں تو وہ جیل ہی میں تھا مگر اب اس پر کوئی سختی نہ تھی۔ کئی دن تو اس نے آرام کیا کہ اس کے بند بند ڈھیلے ہو چکے تھے۔ اچھی خوراک ملی، بدن پر مالشیں ہوئیں تو وہ بیان لکھوانے کے قابل ہوگیا۔

صبح لسّی کے دو گلاس پی کر وہ اپنی داستان شروع کر دیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ناشتا آتا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ پندرہ بیس منٹ آرام کرتا اور کڑی سے کڑی ملا کر اپنا بیان جاری رکھتا۔

آپ محمد حسین اسٹینوگرافر سے پوچھیے جس نے اس کا بیان ٹائپ کیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ پھوجے حرامدے نے پورا ایک مہینہ لیا اور وہ سارا جال کھول کے رکھ دیا جو سازشیوں نے ملک کے اس کونے سے اس کونے تک بچھایا تھا یا بچھانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس نے سینکڑوں آدمیوں کے نام لئے۔ ایسی ہزاروں جگہوں کا پتا بتایا جہاں سازشی لوگ چھپ کے ملتے تھے اور حکومت کا تختہ الٹنے کی ترکیبیں سوچتے تھے۔

یہ بیان، محمد حسین اسٹینوگرافر کہتا ہے، فل اسکیپ کے ڈھائی سو صفحوں پر پھیلا ہوا تھا۔ جب یہ ختم ہوا تھا تو پولیس نے اسے سامنے رکھ کر پلان بنایا۔ چنانچہ فوراً نئی گرفتاریاں عمل میں آئیں اور ایک بار پھر پھوجے کی ماں بہن پُنی جانے لگی۔

اخباروں نے بھی دبی زبان میں پھوجے کے خلاف کافی زہر اگلا۔اکثریت حکام کے خلاف تھی اس لئے اس کی غداری کی ہر جگہ مذمت ہوتی تھی۔وہ جیل میں تھا جہاں اس کی خوب خاطر تواضع ہو رہی تھی۔ بڑی طرّے والی کلف لگی پگڑی سر پر باندھے، دو گھوڑے بوسکی کی قمیض اور چالیس ہزار لٹھے کی گھیرے دار شلوار پہنے، وہ جیل میں یوں ٹہلتا تھا جیسے کوئی افسر معائنہ کر رہا ہے——

جب ساری گرفتاریاں عمل میں آگئیں اور پولیس نے اپنی کارروائی مکمل کر لی، تو سازش کا یہ معرکہ انگیز کیس عدالت میں پیش ہوا۔لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔

پولیس کی حفاظت میں جب پھوجا نمودار ہوا تو غصّے سے بھرے ہوئے نعرے بلند ہوئے۔

''پھوجا حرام دا مردہ باد—— پھوجا غدّار مردہ باد۔''

ہجوم بہت مشتعل تھا خطرہ تھا کہ پھوجے پر نہ ٹوٹ پڑے اس لئے پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا جس کے باعث کئی آدمی زخمی ہو گئے۔عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ پھوجے سے جب یہ پوچھا گیا کہ وہ اس بیان کے متعلق کیا کہنا چاہتا ہے، جو اس نے پولیس کو دیا تھا، تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

'' جناب میں نے کوئی بیان ویان نہیں دیا۔ان لوگوں نے ایک پلندہ سا تیار کیا تھا جس پر میرے دستخط کروا لیے تھے۔''

یہ سن کر انسپکٹر پولیس کی بقول پھوجے کے ''بھمبیری بھول گئی'' اور جب یہ خبر اخباروں میں چھپی تو سب چکرا گئے کہ پھوجے حرامدے نے یہ کیا نیا چکر چلایا ہے۔

چکر نیا ہی تھا کیونکہ عدالت میں اس نے ایک نیا بیان لکھوانا شروع کیا جو پہلے بیان سے بالکل مختلف تھا۔ یہ قریب قریب پندرہ دن جاری رہا، جب ختم ہو۔ تو فل اسکیپ کے ۱۵۸ صفحے کالے ہو چکے تھے۔ پھوجے کا کہنا ہے کہ اس بیان سے جو حالت پولیس والوں کی ہوئی نا قابل بیان ہے۔انہوں نے جو عمارت کھڑی کی تھی کم بخت نے اس کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ کے رکھ دی۔

سارا کیس چوپٹ ہو گیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ اس سازش میں جتنے گرفتار ہوئے تھے، ان میں سے اکثر بری ہو گئے۔دو تین کو تین تین برس کی اور چار پانچ کو چھ چھ مہینے کی سزائے قید ہوئی۔

جو سن رہے تھے ان میں سے ایک نے پوچھا۔''اور پھوجے کو؟'' مہر فیروز نے کہا۔'' پھوجے کو کیا ہونا تھا وہ تو وعدہ معاف یعنی سلطانی گواہ تھا۔''

سب نے پھوجے کی حیرت انگیز ذہانت کو سراہا کہ اس نے پولیس کو کس صفائی سے غچہ دیا۔ایک

نے ،جس کے دل و دماغ کو اس کی شخصیت نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا، مہر فیروز سے پوچھا'' آج کل کہاں ہوتا ہے؟''

''یہیں لاہور میں ــــــ آڑھت کی دکان کرتا ہے۔'' اتنے میں بیرہ بل لے کر آیا اور پلیٹ بھر فیروز کے سامنے رکھ دی، کیونکہ چائے وغیرہ کا آرڈر اسی نے دیا تھا۔ پھوجے کی شخصیت سے متاثر شدہ صاحب نے بل دیکھا اور ان کا آگے بڑھنے والا ہاتھ رک گیا کیونکہ رقم زیادہ تھی چنانچہ ایسے ہی مہر فیروز سے مخاطب ہوئے۔

''آپ کے اس پھوجے حرامدے سے کبھی ملنا چاہیے۔''

مہر فیروز اٹھا۔'' آپ اس سے مل چکے ہیں۔ یہ خاکسار ہی پھوجا حرامدا ہے۔ بل آپ ادا کر دیجئے گا۔ السلام علیکم'' ــــــ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆

مہتاب خاں

شام کو میں گھر بیٹھا اپنی بچیوں سے کھیل رہا تھا کہ میرے دوست طاہر صاحب بڑی افراتفری میں آئے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی آپ نے مینٹل پیس پر سے میرا فونٹین پن اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھمایا اور کہا کہ ''ہسپتال میں کسی ڈاکٹر کے نام ایک چٹ لکھ دیجئے۔''

مجھے کچھ پوچھنے کی فرصت بھی نہ دی گئی اور میں نے ایک ڈاکٹر کے نام رقعہ لکھنا شروع کر دیا۔ مضمون طاہر صاحب نے لکھوایا جس کا مطلب یہ تھا کہ حامل رقعہ خطرناک طور پر علیل ہے اس لئے اسے فوراً ہسپتال میں داخل کرلیا جائے۔

مجھ سے جو لکھوایا گیا، میں نے لکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد طاہر صاحب پھر تشریف لائے۔ مجھے تشویش تھی کہ جس مریض کی میں نے سفارش کی ہے وہ ہسپتال میں داخل ہو سکا ہے یا نہیں، لیکن وہ بڑے مطمئن تھے۔ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا ''جہنم میں جائے ——— میں نے آپ کی چٹ اس کے لواحقین کو دے دی ہے۔''

یہ سن کر میں خاموش ہو گیا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُن سے پوچھا کہ ''یہ مہتاب خاں کون ہیں جن کو ہسپتال میں داخل کرانے کے لئے آپ اتنے بے تاب تھے؟''

طاہر صاحب مسکرائے ''اوّل درجے کا حرامی ہے۔''

اگر مہتاب خاں تیسرے درجے کا حرامی بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا، لیکن مجھے اس سے فوراً دلچسپی پیدا

ہوگئی، چنانچہ میں نے اپنے دوست سے پوچھا ''اسے عارضہ کیا تھا؟''

طاہر صاحب نے جواب دیا ''عشق کا''۔

اس کے بعد انہوں نے خلافِ معمول باتونی ہوکر مہتاب خاں کی داستان عشق سنانا شروع کردی۔

آپ نے بتایا کہ مہتاب خاں کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب ہے۔ جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے، پٹھان ہے کافی ہٹا کٹا ــــــ مگر اس کی دونوں آنکھوں میں لاسا لگا ہوا ہے۔ چوبرجی کے قریب اس کے بڑے بھائی کی چائے کی دُکان ہے، جہاں اُس سے کام لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

طاہر صاحب نے اس نوجوان کے متعلق مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا۔

''منٹو صاحب یہ شخص عجیب و غریب ہے۔ مزاج اس قدر عاشقانہ ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ہر وقت اپنے بھائی کے ہوٹل کے چولھے میں پنکھے سے کوئلے سلگاتا رہتا تھا، مگر بازار میں ہر آنے جانے والی لڑکی کو ایسی نظروں سے دیکھتا کہ وہ اُس پر اگر اُسی وقت نہیں تو تھوڑے عرصے میں ضرور عاشق ہو جائے گی، اور بہت ممکن ہے گھر میں جاکر خودکشی کرلے۔''

اس تمہید کے بعد طاہر صاحب نے مجھے بتایا کہ مہتاب خاں ہوٹل سے باہر لوگوں کے لئے چائے لے جایا کرتا تھا۔ ایک دن اُسے اسکول کی ایک استانی نے جو فزیکل انسکٹرس تھی، اور ہوٹل کے پاس ہی رہتی تھی، چائے کی ٹرے لانے کے لئے کہا۔ اُس کے ہاں پہنچتے ہی وہ اس لڑکی پر عاشق ہوگیا، لیکن مہتاب خاں کا بیان اس سے جدا ہے۔ اُس نے طاہر صاحب اور اُن کے دوستوں سے ٹھیٹ پٹھانی لہجے میں کہا:

''خو وہ رن جو اسکول میں پڑھاتی ہے، مجھے دیکھتے ہی گرم ہوگئی ــــــ خوام خوبرو ہے جوان ہے ــــــ دیکھو اب کیا ہو ــــــ جان کے لالے پڑجائیں گے''۔

اُس کی جان کے لالے پڑے۔ وہ یوں کہ اُس نے اپنے بھائی کے ہوٹل کے گلّے سے پچاس روپے اُڑا لئے اور کسی اور ہوٹل میں ٹھاٹ سے بیٹھ کر اپنے دوستوں کو یہ بات سنائی کہ مس مُراد (یہ اُس لڑکی کا نام ہے) بہت بڑی پیلے رنگ کی موٹر میں انارکلی سے گزر رہی تھی۔ وہ ایک دُکان پر کھڑا نسوار لے رہا تھا کہ عین اُس کے قریب اپنی موٹر رُکوائی۔ باہر نکل کر سرِ بازار اُس سے ہاتھ ملایا اور اپنے پرس سے پچاس روپے کے نوٹ نکال کر اُس کو دیئے اور یہ جا وہ جا ــــــ مہتاب خاں کا بیان تھا کہ جب مس مراد نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ محبت کے شدید جذبے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

اسی رات جب مہتاب خاں چوری کے پچاس روپے، کچھ ہوٹلوں میں باقی کے ہیرا منڈی میں خرچ کر چکا تھا، اس کے بڑے بھائی نے جانے کس جگہ اس کی گردن ناپی اور ایسے زور سے ناپی کہ وہ دو دن تک بلبلاتا رہا لیکن اس نے کسی پر یہ ظاہر نہ کیا (حالانکہ حقیقت کا علم ہوٹل میں ہر آنے جانے والے کو تھا) کہ اُس نے روپے چرائے تھے۔ وہ برابر یہی کہتا رہا کہ اُس کی جوانی اور اس کے حسن سے متاثر ہو کر وہ اسے روپے دیتی رہتی ہے۔

دوسری مرتبہ اس نے ساتھ والے دکاندار کے سو روپے چرائے اور انارکلی کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے دوستوں سے کہا کہ مس مراد نے اسے یہ رقم عیش کرنے کے لئے دی ہے۔ وہ بہت مرعوب ہوئے، لیکن دوسرے روز مہتاب خاں پکڑا گیا۔ چند روز حوالات میں رہا، پھر مقدمہ چلا چونکہ ثبوت کوئی نہ تھا اس لئے بری ہو گیا۔

اس حادثے کے بعد مس مراد کا اس سے عشق اور زیادہ بڑھ گیا بلکہ یوں کہیے کہ اب وہ اپنی روایتی عاشقانہ بے اعتنائی ترک کر کے اس کو ہر وقت یاد کرنے لگا۔ چولھا سلگاتے وقت، یا صبح کو جھاڑو دیتے ہوئے، وہ مس مراد کا نام لیتا —— خو مس مراد —— تو ہی اماری مراد پوری کرے گی۔

اب اس نے روپے پیسے کا سرقہ بند کر دیا، لیکن مکھن کی چوری شروع کر دی۔ ہر روز وہ اپنے بھائی کے ہوٹل سے کم از کم مکھن کی دو ٹکیاں اُڑا لیتا۔ آس پاس کے جو اور ہوٹل تھے، ان سے بھی وہ صرف مکھن ہی چراتا اور کھاتا تھا —— ہر روز اس قدر مکھن کھانے کا یہ اثر ہوا کہ مہتاب خاں اچھا خاصا ڈیری فارم بن گیا —— اس کے بدن سے، اُس کے منہ سے، اس کے لباس سے مکھن ہی کی بو آنے لگی۔ وہ اپنی صحت بنا رہا تھا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ ہر عورت صحت اور جوانی پر مرتی ہے، لیکن طاہر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ ہر مکھن چور، کرشن کنھیا نہیں بن سکتا۔ اُس کی آنکھیں ویسی کی ویسی چندھی تھیں۔

اب کچھ مس مراد کے متعلق سُن لیجئے۔ طاہر صاحب نے جب ان کے حدود اربعے کے متعلق اِدھر اُدھر پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ اس کی ماں بھنگن ہے اور ابھی تک کوٹھے کماتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں لوگوں کا بول و براز اٹھاتی ہے۔ چونکہ وہ اور اس کا خاوند عیسائی ہو گئے تھے اس لئے ان کی لڑکی مس مراد نے تھوڑی سی تعلیم حاصل کی اور ایک اسکول میں فزیکل انسٹرکٹرس ہو گئی —— خوش شکل تھی اس لئے اس کے کئی چاہنے والے پیدا ہو گئے جو اس کی تمام آسائشوں کا خیال رکھتے تھے۔

مہتاب خاں اس کے عشق میں بری طرح گرفتار تھا۔ ہوٹل میں کوئلے جلاتا اور آہیں بھرتا تھا لیکن اس

کے باوجود جب وہ اپنے یار دوستوں سے باتیں کرتا تو بڑے فخر سے اس بات کا اعلان کرتا کہ مس مُراد اس پر بہت بری طرح مرتی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مس مُراد جو بے شمار عاشقوں کے درمیان گھری رہتی تھی، اس کو مہتاب خاں کی موجودگی کا علم ہی کیا ہوسکتا تھا ـــــ اس کے علاوہ اس بے چارے کی حقیقت ہی کیا تھی۔

ایک دن مہتاب چائے کی ٹرے لے کر مس مراد کے یہاں گیا۔ جس جگہ وہ رہتی تھی وہاں ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ اس میں لوکاٹ کے بوٹے تھے۔ مہتاب کو یہ پھل بے حد پسند تھے، معلوم نہیں کیوں ـــــ ٹرے لے کر اندر گیا تو وہاں مس مراد کے دوست احباب بیٹھے لوکاٹیں کھا رہے تھے۔ مس مراد نے اسے چار پانچ دانے شاید اس لئے دیے کہ موسم کا پہلا پہلا میوہ تھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔

واپس ہوٹل آیا تو اس کا بڑا بھائی بھی لوکاٹیں کھا رہا تھا۔ جو مس مراد کی دی ہوئی لوکاٹوں کے مقابلے میں زیادہ بڑی اور رسیلی تھیں لیکن مہتاب یہ ماننے سے منکر تھا۔ قریب قریب چخ ہوگئی۔ اس کے بڑے بھائی نے تاؤ میں آکر کہا:

''اگر تمہیں اپنی مس مراد کی لوکاٹیں پسند ہیں اور جیسا کہ تم کہتے ہو وہ تم پر مرتی ہے تو ایک بوٹا وہاں سے لے آؤ اور ہوٹل کے سامنے لگادو۔''

رات بھر مہتاب خاں غائب رہا۔ اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ مس مراد نے بالیا ہوگا، یا اس نے سو پچاس روپے بھیج دیے ہوں گے، جن سے عیاشی کر رہا ہوگا۔ مگر صبح سڑک پر آنے جانے والے یہ دیکھ کر حیران ہوگئے کہ اس کے ہوٹل کے ساتھ جہاں ایک گڑھا تھا، لوکاٹ کا درخت لگا ہوا ہے۔

یہ اس نے رات رات، وہاں سے جہاں مس مراد رہتی تھی اکھاڑا تھا۔ معلوم نہیں کتنی مشقت کرنی پڑی ہوگی اسے۔ اپنے دوستوں سے مگر اس نے یہی کہا کہ مس مراد نے اسے یہ بوٹا خود اپنے ہاتھوں سے عنایت کیا ہے اس لئے کہ وہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہے۔

یہ بوٹا چند دنوں کے اندر اندر مرجھا گیا، لیکن اس کا چرچا کافی دیر تک رہا۔ طاہر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ وہ مہتاب حاں کے اس مداری پنے سے خاصے متاثر ہوئے تھے، لیکن انہوں نے جب اپنی راویتی محکم پسندی سے کام لیتے ہوئے مہتاب سے کہا:

''تم بکواس کرتے ہو ـــــ ذرا آئینے میں اپنی شکل دیکھو، مس مراد کیا، تمہیں ایک ٹکھیائی بھی کبھی منہ نہیں لگا سکتی۔''

یہ سن کر اس نے اپنا مکھن کھایا ہوا سینہ تان کر جواب دیا۔''خو ـــــ تم کیسا بات کرتا ہے ـــــ خو،تم نے وہ فلم نہیں دیکھا۔نام تھا پرکھائیں ـــــ نہیں، پرچھائیں ـــــ خو،اُس میں ایک خوبرولڑکی،ایک اندھے سے محبت کرتی تھی ـــــ اُم اندھا نہیں ہے ـــــ آنکھیں تھوڑی سی خراب ہیں ـــــ پراس سے کیا ہوا ـــــ مس مراد اُم سے محبت کرتا ہے''۔

جیسا کہ طاہر صاحب کا کہنا ہے، یارلوگوں کی مہربانی یا نامہربانی سے مس مراد تک آخر یہ بات پہنچ گئی کہ مہتاب خاں، جس کی آنکھ میں پھولے ہیں اس سے بے پناہ عشق کر رہا ہے۔اس کا ردِّ عمل خلاف توقع یہ ہوا کہ وہ اپنا مکان چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی،اس لئے کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے دوسرے چاہنے والے جو مہتاب کے مقابلے میں،آنکھوں کے نہیں عقل کے اندھے تھے،اس کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیں۔

جب مہتاب کو معلوم ہوا کہ مس مراد چلی گئی ہے تو اس کو اس قدر صدمہ ہوا کہ اس روز اُس نے ہوٹل میں جتنی مکھن کی ٹکیاں تھیں سب کھالیں۔اس کے بعد اس کا غم جب اور زیادہ بڑھا تو مکھن کھانے کی مقدار بڑھ گئی۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کی توند بڑھ گئی ـــــ بڑا کاہل ہو گیا۔چولھے میں کوئلے سلگاتے سلگاتے اونگھنے لگتا۔بعض اوقات ایسی باتیں کرنا شروع کر دیتا کہ لوگوں کو یہ احساس ہوتا کہ وہ ماؤف الدماغ ہو گیا ہے۔

طاہر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ اسے ہوا ہوایا کچھ بھی نہیں تھا۔کشمیریوں کی زبان میں محض ''ڈام'' لگا تا تھا۔جب کچھ دن گزرے تو اس نے شعر کہنے شروع کر دیئے،مگر یہ شعر اس کی اپنی تخلیق نہیں ہوتے تھے۔اِدھر اُدھر سے فلمی گانوں کے بول توڑ مروڑ کر گنگنا دیتا،جس سے سننے والوں پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ جذب کی حالت تک پہنچ چکا ہے،یا بہت جلد پہنچنے والا ہے۔

اس کا ایک شعر طاہر صاحب کو یاد تھا جو انہوں نے مجھے سنا دیا۔

؎ دو دلوں کو یہ دنیا جینے ہی نہیں دیتی
میری پھٹی شلوار کو سینے ہی نہیں دیتی

اس کی شلوار جو کافی گھیرے دار تھی، یوں تو ہمیشہ پھٹی رہتی، پر جب سے اس کی مس مراد آنکھوں سے اوجھل ہوئی تو وہ بالکل لیر لیر ہو گئی لیکن اس کی مکھن خوری دن بدن بڑھتی گئی۔اس کا چہرہ اور زیادہ سرخ ہو گیا ـــــ

ایک دن طاہر صاحب نے اس سے کہا۔ ''تمہاری رگوں میں اتنا خون جمع ہو گیا ہے —— کیوں نہیں اس میں سے چند اونس بلڈ بنک میں دے دیتے''۔

وہ فوراً مان گیا۔ ڈاکٹروں نے اس کا خون لیا، جو بڑا صحت مند تھا۔ اس کے بعد وہ ایک مرتبہ اور ہسپتال گیا۔ اس کا خون لینے کے لیے سب ڈاکٹر ہر وقت تیار تھے۔

ایک مرتبہ اسے خاص طور پر بلایا گیا کہ اس کے تازہ تازہ خون کی ضرورت تھی۔ جب وہ ہسپتال پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک مریض کے لئے اس کے خون کی ضرورت ہے۔ اسے کوئی عذر نہیں تھا۔ جب اسے فی میل وارڈ میں لے جایا گیا اور اس کا خون مریض کے اندر داخل کرنے کا اہتمام کیا گیا تو اس نے بستر پر دیکھا کہ مس مراد نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہے۔

مہتاب خاں کو معاً خیال آیا کہ شاید اسے چائے لانے کے لئے بلایا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے خود کو خالی ہاتھ محسوس کیا —— لیکن جب اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے میز پر لٹایا گیا اور اس کے خون کے کئی اونس مس مراد کے جسم میں داخل کئے گئے تو وہ کسی قسم کی نقاہت محسوس کئے بغیر اٹھا اور کہنے لگا ''خو، یہ امارا بہن ہے —— اَم چلا''۔

☆☆☆☆☆

ڈائرکٹر کرپلانی

ڈائرکٹر کرپلانی اپنی بلند کرداری اور خوش اطواری کی وجہ سے بمبئی کی فلم انڈسٹری میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بعض لوگ تو حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ ایسا نیک اور پاکباز آدمی فلم ڈائرکٹر کیوں بن گیا، کیونکہ فلم کا میدان ایسا ہے، جہاں جابجا گڑھے ہوتے ہیں۔ اَن دیکھے گڑھے، بے شمار دَل دَلیں، جن میں آدمی ایک دفعہ پھنسا تو عمر بھر باہر نکلنے کا رستہ نہیں ملتا۔

ڈائرکٹر کرپلانی کامیاب ڈائرکٹر تھا۔ اُس کا ہر فلم باکس آفس ہٹ ثابت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سب فلم ساز اُس کی خدمات حاصل کرنے کے لئے بیتاب رہتے ——— مگر وہ لالچی نہیں تھا۔ ایک فلم بنا کر وہ دو تین مہینے کے لئے پنج گنی یا رونا ولہ چلا جاتا اور اپنے آئندہ فلم کی کہانی اور منظرنامے بڑے اطمینان سے تیار کرتا رہتا۔

وہ رہنے والا سندھ حیدرآباد کا تھا، سفید ٹول کی قمیض اور سفید زین کی پتلون کے علاوہ اور کوئی لباس نہیں پہنتا تھا۔ شام کو چھے بجے ایک بوتل بیئر کی پیتا، لیکن اگر شوٹنگ رات کو ہو تو یہ بوتل اُس کے کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ نشے کی حالت میں وہ کام کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اس لئے کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ نشہ انسان کے ذہنی اعصاب کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔

فلمی دنیا میں عشق معاشقے عام ہوتے ہیں ——— آج اگر ایک ایکٹرس کسی ڈائرکٹر کے پاس ہے تو دوسرے روز وہ کسی اور ڈائرکٹر یا ایکٹر کی بغل میں ہوگی۔ وہاں سے پھسل کر وہ شاید کسی نواب یا راجہ کی گود میں چلی جائے۔

سیلولائڈ کی یہ دنیا بڑی نرالی ہے۔ یہاں دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت رہتی ہے۔ جن دنوں کی میں

بات کر رہا ہوں۔ایک ہی دن میں کئی وارداتیں ہوئیں۔ایک ایکٹرس اپنے شوہر کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی، پتی دیو صاحب جس سے ملتے اس کے سامنے اپنی بدقسمتی کا رونا روتے۔ایک ڈائرکٹر نے اپنی بیوی کو زہر دے کر مار ڈالا۔دوسرے نے محبت کی ناکامی کے صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے خودکشی کرلی۔ایک ایکٹرس کے حرامی بچہ پیدا ہوا۔

ڈائرکٹر کرپلانی یوں تو اسی دنیا میں رہتا تھا، مگر سب سے الگ تھلگ۔اس کو صرف اپنے کام سے غرض تھی۔شوٹنگ ختم کی، اور اپنے خوبصورت فلیٹ میں واپس چلا آیا۔اسے کسی ایکٹرس سے جنسی تعلقات پیدا کرنے کی کبھی خواہش ہی نہیں تھی۔

ایک مرتبہ مِس ـــــ نے اس سے رغبت کا اظہار کیا، کرپلانی اس کو علیحدہ کمرے میں ڈائلاگ کی ری ہرسل کرا رہا تھا کہ اس ایکٹرس نے اس سے بڑے دلبرانہ انداز میں کہا ''کرپلانی صاحب! آپ پر سفید کپڑے بہت پھبتے ہیں، ـــــ میں بھی اب سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز پہنا کروں گی۔''

کرپلانی نے جس کے دماغ میں اس وقت فلمائے جانے والے سین کے ڈائلاگ گھسے ہوئے تھے اس سے کہا ''ہاں ـــــ مگر سفید چیزیں بہت جلد میلی ہو جاتی ہیں۔''

''تو کیا ہوا؟''

''ہوا تو کچھ بھی نہیں ـــــ لیکن تمہیں کم از کم چودہ پندرہ ساڑھیاں اور اسی قدر بلاؤز بنوانے پڑیں گے۔''

ایکٹرس مسکرائی ''بنوالوں گی ـــــ آپ ہی لے دیں گے''۔

کرپلانی چکرا گیا۔''میں ـــــ میں آپ کو کیوں لے کر دوں گا؟''

ایکٹرس نے کرپلانی کی قمیض کا کالر جو کسی قدر سمٹا ہوا تھا، بڑے پیار سے درست کیا'' آپ میرے لئے سب کچھ کریں گے ـــــ اور میں آپ کے لئے''۔

قریب تھا کہ وہ ایکٹرس کرپلانی کے ساتھ چمٹ جائے کہ اس نے اس کو پیچھے دھکیل دیا اور کہا'' خبردار جو تم نے ایسی بے ہودہ حرکت کی''۔

دوسرے روز اس نے اس ایکٹرس کو اپنے فلم سے نکال باہر پھینکا ـــــ دو ہزار روپے اڈوانس لے چکی تھی ـــــ کرپلانی نے سیٹھ سے کہا کہ وہ روپے اس کے حساب میں ڈال دے۔

سیٹھ نے پوچھا ''بات کیا ہے مسٹر کرپلانی''۔

''کوئی بات نہیں ہے ـــــ واہیات عورت ہے۔ میں اس کو پسند نہیں کرتا''۔

اتفاق کی بات ہے کہ وہ ایکٹرس سیٹھ کی منظورِ نظر تھی۔ سیٹھ نے جب روز دیا کہ وہ فلم کے کاسٹ میں موجود رہے گی، تو کرپلانی دفتر سے باہر چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔

کرپلانی کی عمر یہی پینتیس برس کے قریب ہوگی۔ خوش شکل اور نفاست پسند تھا۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اپنے خوبصورت فلیٹ میں اکیلا رہتا، جہاں اس کے دو نوکر تھے۔ باورچی اور ایک دوسرا نوکر جو گھر کی صفائی کرتا تھا، اور اس کے آرام وآسائش کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ان دونوں سے مطمئن تھا۔

اس کی زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی۔ اسے عورت سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، مگر اس کے ہم عصر فلم ڈائرکٹروں کو سخت تعجب تھا کہ وہ عموماً رومانی فلم بناتا تھا، جس میں مرد اور عورت کی پر جوش محبت کے مناظر ہوتے تھے۔

اس کے دوست گنتی کے تھے ان میں سے ایک میں تھا، جس کو وہ اپنا عزیز سمجھتا تھا، ایک دن میں نے اس سے پوچھا ''کرپ، ـــــ یہ کیا بات ہے کہ تم کبھی عورت کے نزدیک نہیں گئے، پر تمہارے فلموں پر عشق ومحبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تجربے کے بغیر تم ایسے مناظر کیوں کر لکھتے ہو، جس میں کیوپڈ ہوتا ہے یا اس کے تیر۔''

یہ سن کر وہ مسکرایا ''آدمی تجربے کی بنا پر جو سوچے، وہ ٹھس ہوتا ہے ـــــ پر تخیل کے زور سے جو کچھ سوچے، اس میں حسن ہوتا ہے ـــــ فلم سازی فریب کاری کا دوسرا نام ہے ـــــ جب تک تم اپنے آپ کو فریب نہ دو، دوسروں کو نہیں دے سکتے''۔

اس کا یہ فلسفہ عجیب وغریب تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''کیا تم نے تخیل میں کوئی ایسی عورت پیدا کر لی ہے جس سے تم محبت کرتے ہو''۔

کرپلانی پھر مسکرایا ''ایک نہیں سینکڑوں ـــــ ایک عورت سے میرا کام کیسے چل سکتا ہے ـــــ مجھے عورت سے نہیں اس کے کردار سے دلچسپی ہے ـــــ چنانچہ میں ایک عورت اپنے تخیل میں پیدا کرتا ہوں اور اس کو الٹ پلٹ کرتا رہتا ہوں''۔

''الٹ پلٹ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''یار تم بڑے کم سمجھ ہو، ـــــ عورت کا جسمانی ڈھانچہ تو ایک ہی قسم کا ہوتا ہے ـــــ پر اس کا کیریکٹر جداگانہ ہوتا ہے، ـــــ کبھی وہ ماں ہوتی ہے، کبھی چڑیل، کبھی بہن، کبھی مردانہ صفات رکھنے والی، ـــــ سو ایک عورت میں تم سو روپ دیکھ سکتے ہو، ـــــ اور صرف اپنے تخیل کی مدد سے''۔

میں نے ایک روز اس کی غیر موجودگی میں اس کے میز کا دراز کھولا کہ میرے پاس ماچس نہیں تھی، تو مجھے کاغذات کا ایک پلندہ نظر آیا، جو غالباً اس کے تازہ فلم کا منظر نامہ تھا۔ میں نے اس کو اٹھایا کہ شاید اس کے نیچے ماچس کی کوئی ڈبیا دبی ہو ـــــ لیکن اس کے بجائے مجھے ایک فوٹو دکھائی دی جو ایک خوبصورت سندھی لڑکی کی تھی ـــــ میں اس فوٹو کو نکال کر غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ کرپلانی آ گیا اس نے میرے ہاتھ میں فوٹو دیکھی تو دیوانہ وار آگے بڑھ کے چھین لی اور اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے اس سے معذرت طلب کی، ـــــ ''معاف کرنا کرپ ـــــ میں دیا سلائی تلاش کر رہا تھا کہ یہ فوٹو مجھے نظر آئی، اور میں اسے دیکھنے لگا ـــــ کس کی ہے؟''

اس نے یہ کہہ کر معاملہ گول کرنا چاہا ''کسی کی ہے''۔

میں نے پوچھا ''آخر کس کی؟ ـــــ اس لڑکی کا کوئی نام تو ہوگا''۔

کرپلانی آرام کرسی پر بیٹھ گیا ''اس کے کئی نام ہو سکتے ہیں، ـــــ لیکن وہ رادھا تھی ـــــ ناموں میں کیا پڑا ہے ـــــ یہ وہ لڑکی ہے جس سے میں نے عرصہ ہوا محبت کی تھی''۔

مجھے سخت حیرت ہوئی۔ ''تم نے؟ ـــــ تم نے محبت کی تھی''۔

''کیوں؟ ـــــ میں کیا محبت نہیں کر سکتا، ـــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب محبت کے نام ہی سے دور بھاگتا ہوں، لیکن جوانی کے دنوں میں ہر انسان کو ایسے لمحات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جب وہ دوسری صنف میں بے پناہ کشش محسوس کرتا ہے''۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ کرپلانی کو اس لڑکی سے کیسے عشق ہوا ''یہ کب کی بات ہے کرپ۔ تم نے آج مجھے حیرت زدہ کر دیا کہ تم کسی سے عشق لڑا چکے ہو، ـــــ تمہارے عشق کا انجام کیا ہوا؟''

کرپلانی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ''بہت افسوس ناک''

''کیوں؟''

''میں اس سے محبت کرتا رہا، میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ میں دلچسپی لیتی ہے، ـــــ آخر ایک دن جب میں نے اسے ٹٹولا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ـــــ اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے ـــــ میرا دل ٹوٹ گیا، لیکن میں نے اپنے دل میں اس بت کو بھی توڑ ڈالا جس کی میں پوجا کیا کرتا تھا ـــــ میں نے اس کو بے شمار بددعائیں دیں کہ وہ مر جائے''۔

میں نے پوچھا ''کیا وہ مرگئی؟''

''ہاں اسے مرنا ہی تھا، اس لئے کہ اس نے مجھے مار ڈالا تھا ـــــــ اس کو ٹائی فائڈ ہوا اور ایک مہینے کے اندر اندر چل بسی''۔

''تمہیں اس کی موت کا افسوس نہ ہوا؟''

''مجھے افسوس کیوں ہوتا ـــــــ میری آنکھوں میں چند آنسو آئے، بہنے والے تھے کہ میں نے ان سے کہا، بے وقوفو کیوں خود کو ضائع کر رہے ہو ـــــــ اور وہ میرا کہا مان کر واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے''۔

یہ کہتے ہوئے کرپلانی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، شاید وہی جو اس کا کہا مان کر واپس چلے گئے تھے ـــــــ میں نے سوچا کہ اب اس معاملے پر اور زیادہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے، چنانچہ میں اس سے رخصت لئے بغیر چلا گیا، اس لئے کہ میرا خیال تھا کہ وہ تنہائی میں رو کر اپنا جی ہلکا کرنا چاہتا ہے۔

دوسرے روز اس سے ملاقات ہوئی تو وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ مجھے اپنے ساتھ اسٹڈیو میں لے گیا۔ وہاں چہک چہک کر مجھ سے اور اپنے ٹیکنیکل اسٹاف سے باتیں کرتا رہا۔ یہ اس کی فلم کی شوٹنگ کا آخری دن تھا۔

اس کے بعد کرپلانی ایڈیٹنگ میں قریب قریب ایک ماہ تک مصروف رہا۔ ریکارڈنگ ہوئی، پرنٹ تیار ہوئے، فلم ریلیز ہوا اور بہت کامیاب ثابت ہوا۔

حسب دستور وہ پنج گنی چلا گیا اور ڈیڑھ مہینے تک وہاں بڑی پر سکون اور صحت افزا فضا میں اپنے آئندہ فلم کے لئے کہانی اور اس کا منظر نامہ تیار کرتا رہا۔

اس کا ایک نئی فلم کمپنی سے کنٹریکٹ ہو چکا تھا۔ کہانی بہت پسند کی گئی۔ اب کاسٹ چننے کا مرحلہ باقی تھا۔ سیٹھ چاہتا تھا کہ ہیروئن کے لئے کوئی نیا چہرہ لیا جائے۔ دراصل وہ پہلے ہی سے ایک خوش شکل لڑکی منتخب کر چکا تھا۔ اس کا ارادہ یہ نہیں تھا کہ اس لڑکی کو ایک دم ہیروئن بنا دے، پر جب اس نے کہانی سنی، تو اس کی ہیروئن میں اس کو ہو بہو اسی لڑکی کی شکل و شباہت اور چال ڈھال نظر آئی۔

اس نے کرپلانی سے کہا ''میں نے ایک لڑکی کو ملازم رکھا ہے۔ آپ اسے دیکھ لیجئے۔ آپ کے فلم کے لئے بڑی مناسب ہیروئن رہے گی''۔

کرپلانی نے کہا ''آپ اس کو بلایئے، میں دیکھ لوں گا، ـــــــ کیمرہ اور ساونڈ ٹیسٹ لینے کے بعد اگر میرا اطمینان ہو گیا تو مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا کہ اسے ہیروئن کا رول دے دوں''۔

دوسرے روز صبح دس بجے کا وقت مقرر کیا گیا۔

کرپلانی کی یہ عادت تھی کہ صبح سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر اسٹڈیو آ جاتا، اور ادھر ادھر ٹہلتا رہتا۔۔۔۔۔۔ دس بجے تک وہ نئے اسٹڈیو کی ہر چیز دیکھتا رہا۔۔۔۔۔۔ ساڑھے دس بج گئے۔ اس نے بیئر کی بوتل منگوائی، مگر اسے نہ کھولا، اس لئے کہ اسے یاد آ گیا کہ اسے نئے چہرے کو دیکھنا ہے۔

گیارہ بج گئے، مگر سیٹھ کا دریافت کیا ہوا نیا چہرہ نمودار نہ ہوا۔ کرپلانی اکتا گیا۔ اس نے اپنی کہانی کے منظرنامے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اس میں کچھ ترمیم کی۔ اس دوران میں بارہ بج گئے۔۔۔۔۔۔ وہ صوفے پر لیٹ کر سونے ہی والا تھا کہ چپراسی نے کہا "سیٹھ صاحب، آپ کو سلام بولتے ہیں"۔

کرپلانی اٹھا۔۔۔۔۔۔ سیٹھ کے دفتر میں گیا، جہاں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ جب وہ سیٹھ کی کرسی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تو دم بخود ہو گیا۔۔۔۔۔۔ اس لڑکی کی شکل وصورت بالکل اس لڑکی کی سی تھی جس سے اس نے عرصہ ہوا محبت کی تھی۔

سیٹھ باتیں کرتا رہا، مگر کرپلانی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔۔۔۔۔۔ بہر حال اس لڑکی کو ہیروئن کے رول کے لئے منتخب کر لیا گیا۔

کرپلانی اس لڑکی کو قریب قریب ہر روز دیکھتا اور اس کا اضطراب بڑھتا جاتا۔۔۔۔۔۔ ایک دن اس نے ہمت سے کام لے کر اس سے پوچھا "آپ کہاں کی رہنے والی ہیں"۔

لڑکی نے جواب دیا "سندھ حیدرآباد کی۔

کرپلانی چکرا گیا۔۔۔۔۔۔ "سندھ حیدرآباد کی؟۔۔۔۔۔۔ آپ کا نام؟"

لڑکی نے بڑی دلفریب مسکراہٹ سے کہا "یشودھرا"

"آپ کی کوئی بہن ہے؟"

"تھی۔۔۔۔۔۔ مگر اس کا دیہانت ہو چکا ہے"

"کیا نام تھا ان کا؟"

"رادھا!"

کرپلانی نے یہ سنتے ہی اپنے دل کو پکڑ لیا اور بے ہوش ہو گیا۔۔۔۔۔۔ اور دوسرے روز اچانک مر گیا۔

☆☆☆☆☆

ملبے کا ڈھیر

کامنی کے بیاہ کو ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا پتی دل کے عارضے کی وجہ سے مر گیا اور اپنی ساری جائیداد اس کے لیے چھوڑ گیا۔ کامنی کو بہت صدمہ پہنچا، اس لیے کہ وہ جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔

اُس کی ماں عرصہ ہوا اس کے باپ کو داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو کامنی اس کے پاس جا کر خوب روتی تا کہ اُسے دم دلاسہ ملے۔ لیکن اُسے مجبوراً اپنے باپ کے پاس جانا پڑا جو کاٹھیاواڑ میں بہت بڑا کاروباری آدمی تھا۔

جب وہ اپنے پرانے گھر میں داخل ہوئی تو سیٹھ گھنشام داس باہر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ غالباً اپنے کاروبار کے متعلق سوچ رہے تھے۔ جب کامنی ان کے پاس آئی تو وہ حیران سے ہو کر رہ گئے۔

''کامنی'' ——!

کامنی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے، وہ اپنے پتا سے لپٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ سیٹھ گھنشام داس نے اس کو پچکارا اور پوچھا ''کیا بات ہے''؟

کامنی نے کوئی جواب نہ دیا اور روتی رہی۔ سیٹھ جی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیا ہے۔ انہوں نے صرف ایک ہی چیز کے متعلق سوچا کہ شاید میری بیٹی کے پتی نے اس سے کوئی زیادتی کی ہے جس کے باعث اس کو بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس سے پوچھا ''کیوں بیٹی —— کیا رنچھوڑ نے کوئی ایسی ویسی بات کی ہے''؟

اس پر کامنی اور بھی زیادہ رونے لگی۔ سیٹھ گھنشام داس نے بہت پوچھا مگر کامنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر وہ تنگ آ گئے اور جھنجھلا کر کہا ''مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تم نے میرا آدھا گھنٹہ خراب کر

دیا ہے۔ بولو کیا بات ہے''؟

کامنی نے اپنی آنسو بھری آنکھوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور کہا۔''ان کا دیہانت ہو گیا ہے۔''

سیٹھ گھنشام نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور پوچھا۔''کس کا''؟

کامنی نے ساڑھی کے پلو سے آنسو خشک کیے۔''وہی جن سے آپ نے میرا وواہ کیا تھا''۔

سیٹھ گھنشام سکتے میں آ گئے۔''کب''؟

''پرسوں''۔

''تم نے مجھے اطلاع بھی نہ دی''۔

کامنی نے کہا''میں نے آپ کو تار دیا تھا۔ کیا ملا نہیں آپ کو''؟

اس کے باپ نے تھوڑی دیر سوچا''کل تار تو کافی آئے تھے۔ مگر مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ انہیں دیکھ سکوں۔ اب میں پیڑھی جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے ان تاروں میں تمہارا تار بھی ہو''۔

کامنی دو دن اپنے باپ کے پاس رہی اس کے بعد واپس بمبئی چلی آئی اور اپنے شوہر کی جائیداد اپنے نام منتقل کروانے میں مشغول ہو گئی۔ رنچھوڑ کا صرف ایک بھائی تھا مگر اس کا جائیداد پر کوئی حق نہیں تھا، اس لیے کہ وہ اپنا حصہ وصول کر چکا تھا۔

کامنی جب اس کام سے فارغ ہو گئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ کاٹھیاواڑ گجرات میں دس مکان، احمد آباد میں پانچ، بمبئی میں سات، ان کا کرایہ ہر ماہ اسے مل جاتا جو پانچ ہزار کے قریب ہوتا۔ یہ سب روپے وہ اپنے منیم کے ذریعے سے وصول کرتی اور بینک میں جمع کرا دیتی۔ ایک برس کے اندر اندر اس کے پاس ایک لاکھ روپیہ جمع ہو گئے۔ اس لیے کہ اس کے شوہر نے بھی تو کافی جائیداد چھوڑی تھی۔

وہ اب بڑی مالدار عورت تھی۔ دولت کے نشے نے اس کے سارے غم دور کر دیے تھے۔ لیکن اس کو کسی ساتھی کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ رات کو اکثر اسے نیند نہ آتی۔ گھر میں چار نوکر تھے جو اس کی خدمت کے لیے چوبیس گھنٹے تیار رہتے۔ ہر قسم کی آسائش میسر تھی۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں خلا محسوس کرتی تھی۔ جیسے موٹر کا ٹائر تو ہے ثابت و سالم مگر اس میں ہوا کم ہے۔ پچک پچک جاتا ہے۔

ایک روز وہ بڑی افسردہ حالت میں باہر برآمدے میں لٹکے ہوئے پنگھوڑے پر بیٹھی تھی کہ اس کا منیم آیا۔ کامنی اسے صرف منیم جی کہتی تھی۔ وہ عام منیموں جیسا بڈھا اور جھڑوس نہیں تھا۔ اس کی عمر یہی تیس برس کے قریب ہو گی۔ صاف ستھرا، دھوتی بڑے سلیقے سے باندھتا تھا۔ خوش شکل اور تندرست و توانا تھا۔

پہلی مرتبہ کامنی نے اسے غور سے دیکھا اور جھولا جھولتے ہوئے اس کے پرنام کا جواب دیا اور اس سے پوچھا۔'' کیوں منیم جی آج آپ کیسے آئے''؟

منیم نے اپنا بستہ جو اس کی بغل میں تھا، نکالا۔ کھولنے ہی والا تھا کہ کامنی نے اس سے کہا'' رہنے دیجیے حساب کتاب، چلیے چائے پئیں''۔

دونوں اندر چلے گئے۔ چائے تیار تھی، گجراتی انداز کی۔ منیم کچھ جھینپا، اس لئے کہ وہ اس کا ملازم تھا اور دو سو روپے ماہوار لیتا تھا۔ مگر کامنی نے اصرار کیا کہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھے۔ چائے کے ساتھ نمکین بسکٹ، کھاری سینگ (نمک لگی مونگ پھلی) اور دال مونٹھ اور کچھ اسی قسم کی تین چار چیزیں اور تھیں۔ کامنی غور سے منیم کو دیکھ رہی تھی جو پہلی مرتبہ اس نوازش سے دوچار ہوا تھا۔

کامنی نے چائے کا ایک گھونٹ پی کر اس سے پوچھا'' منیم جی آپ کا نام کیا ہے''؟

نوجوان منیم کے ہاتھ سے بسکٹ گر کر چائے کی پیالی میں ڈبکیاں لگانے لگا'' جی میرا ـــــ میرا نام ـــــ رنچھوڑ داس ہے''۔

کامنی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی۔

'' رنچھوڑ داس؟''

'' جی ہاں''۔

'' یہ تو میرے سورگ باشی پتی کا نام ہے''۔

منیم نے کہا'' مجھے معلوم ہے ـــــ اگر آپ کہیں تو میں اپنا نام بدل لوں گا''۔

کامنی نے ایک بار پھر منیم کو غور سے دیکھا'' نہیں نہیں۔ یہ نام مجھے پسند ہے''۔

چائے کا سلسلہ ختم ہوا تو منیم نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ ایک بلڈنگ پانچ منزلہ بنانے کا ٹھیکہ انہیں مل سکتا تھا۔ اس نے کامنی سے کہا کہ اس سودے میں کم از کم پچاس ہزار روپے بلکہ اس سے زیادہ بچ جائیں گے۔

کامنی کے پاس کافی دولت موجود تھی۔ اس کو کسی قسم کا لالچ نہیں تھا۔ لیکن منیم کے مشورے کو وہ نہ ٹال سکی۔ اس نے کہا'' ہاں منیم جی۔ میں یہ ٹھیکہ لینے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے کہ آپ چاہتے ہیں''۔

منیم کی باچھیں کھل گئیں'' بائی جی۔ ٹھیکہ کیا ہے بس سونا ہی سونا ہے''۔

'' سونا ہو یا لوہا۔ آپ کو روپیہ کتنا چاہیے''؟

''دس ہزار''۔

''کل دس ہزار''؟

''جی نہیں۔ یہ تو فوکٹ میں جائے گا۔ میرا مطلب ہے کہ رشوت میں۔ جب ٹھیکہ مل جائے گا تو ہم اسے کسی اور کے حوالے کر دیں گے اور اپنے پیسے کھرے کر لیں گے''۔

کامنی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ ''ٹھیکہ مل جائے گا تو آپ اسے کسی دوسرے آدمی کے حوالے کیوں کریں گے''؟

منیم ہنسا۔ ''بائی جی۔ یہ دنیا اسی طرح چلتی ہے۔ ہم محنت کیوں کریں، دس ہزار دیں گے، یہ کیا کم ہے۔ اور سالا جس کو ہم دیں گے ہزاروں کمائے گا''۔

کامنی کے دماغ میں روپے پیسے نہیں تھے وہ بار بار منیم کو دیکھ رہی تھی۔ منیم کو بھی اس کا علم تھا کہ وہ اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی ہے۔

تھوڑی دیر ٹھیکے کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی لیکن بالکل پھُس اور بے کیف۔ اچانک منیم نے کامنی کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے کمرے میں لے گیا۔

منیم اور کامنی دیر تک اس کمرے میں رہے۔ منیم اپنی دھوتی کا لانگ ٹھیک کرتے ہوئے باہر نکلا۔ بیڑی سلگا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں زرد رو کامنی آئی اور اس کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ منیم نے اس سے کہا ''بائی جی۔ تو وہ دس ہزار کا چیک لکھ دیجیے''۔

کامنی اٹھی۔ اپنی ساڑھی کے پلو میں اڑسے ہوئے چابیوں کے چھلے کو نکالا اور الماری کھول کر چیک بک نکالی اور دس ہزار روپے کا چیک کاٹ کر منیم کو دے دیا۔ منیم نے یہ چیک اپنی واسکٹ میں رکھا اور کامنی سے کہا ''اچھا تو میں چلتا ہوں۔ کل کام ہو جائے گا''

دوسرے روز کام ہو گیا ٹھیکہ مل گیا۔ اب اس کو ٹھکانے لگانے کا م باقی رہ گیا تھا۔ منیم کامنی بائی کے پاس آیا۔ دونوں کچھ دیر دوسرے کمرے میں رہے۔ اس دوران میں سب باتیں ہو گئیں۔ اب یہ مرحلہ باقی رہ گیا کہ ٹھیکہ کس کے نام فروخت کیا جائے۔ کوئی ایسی پارٹی ہونی چاہیے جو یک مشت روپیہ ادا کر دے۔

منیم ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے کافی دوڑ دھوپ کی۔ آخر ایک پارٹی ڈھونڈ نکالی جس نے دو لاکھ روپیہ یک مشت ادا کر دیا ـــــ اور بلڈنگ کا کام شروع ہو گیا۔

منیم نے جب دو لاکھ روپے کامنی کو دیے تو اسے کوئی خاص خوشی نہ ہوئی۔ البتہ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔ جہاں وہ دیر تک زیر تعمیر بلڈنگ کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔

بلڈنگ کا کام دن رات جاری تھا۔ پانچ سو مزدور کام کر رہے تھے۔ پانچ منزلہ عمارت بن رہی تھی۔ ادھر کامنی اور اس کا منیم دوسرے کمرے میں کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔

منیم بہت خوش تھا کہ اس نے بہت اچھا سودا کیا۔ دو لاکھ روپے، بغیر کسی محنت کے وصول ہو گئے لیکن جس پارٹی نے یہ ٹھیکہ خریدا تھا اس کو اپنی دانست کے مطابق خسارہ ہی خسارہ نظر آ رہا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اسے زیادہ منافع کی امید نہیں تھی۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ بلڈنگ پانچویں منزل تک پہنچ گئی۔ پانچ سو مزدور، دن رات عمارت سازی میں مصروف تھے۔ رات کو گیس کے لیمپ روشن کیے جاتے، سیمنٹ اور بجری کو ملانے کی مشین چلتی رہتی۔

مزدوروں میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی تھیں جو مردوں کے مقابلے میں بڑی تن دہی سے کام کرتی تھیں۔ اپنے شیر خوار بچوں کو جو نیچے زمین پر پڑے ہوتے، دودھ بھی پلاتیں اور سیمنٹ بجری اٹھا کر پانچویں منزل تک پہنچاتیں۔

کامنی کے دوسرے کمرے میں ایک دن یہ طے ہوا کہ وہ شادی کر لیں۔ دوسرے دن صبح اخبار میں منیم نے پڑھا کہ وہ بلڈنگ جو تعمیر ہو رہی تھی، ناقص مسالہ استعمال کرنے کے باعث اچانک گر گئی۔ پچاس مزدور نیچے دب گئے۔ ان کی لاشیں نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

منیم کامنی کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ جب کامنی نے یہ خبر سنی تو اس نے منیم کو دھکا دے کر ایک طرف کر دیا۔ جیسے وہ ملبے کا ڈھیر ہے۔

☆☆☆☆☆

شراب

''آپ کے منہ سے بو کیوں آ رہی ہے۔''

''کیسی بو؟''

''جیسی پہلے آیا کرتی تھی —— مجھے بنانے کی کوشش نہ کیجیے۔''

''لاحول ولا، تم بنی بنائی ہو، تمہیں کون بنا سکتا ہے۔''

''آپ بات ٹال کیوں رہے ہیں؟''

''میں نے تو آج تک تمہاری کوئی بات نہیں ٹالی''۔

''لتے بدن پر جھولنے کا زمانہ آ گیا ہے لیکن آپ کو کچھ فکر ہی نہیں''۔

''یہ تم نے اچھی کہی —— تمہارے پاس کم سے کم بارہ ساڑھیاں، پندرہ قمیصیں سولہ بلاؤز، دس شلواریں اور پانچ بنیانیں ہوں گی اور تم کہتی ہو کہ لتے بدن پر جھولنے کا زمانہ آ گیا ہے۔ تم عورتوں کی فطرت ہی یہی ہے کہ ہمیشہ ناشکری رہتی ہو''۔

''آپ بس مجھے ہر وقت یہی طعنہ دیتے ہیں۔ بتائیے ان پچھلے چھ مہینوں میں آپ نے مجھے کتنا روپیہ دیا ہے''۔

''حساب تو میرے پاس نہیں لیکن اندازاً چھ سات ہزار دیے ہوں گے''۔

''چھ سات ہزار؟ آپ نے ان میں سے کتنے لیے''۔

''یہ مجھے یاد نہیں''۔

''آپ کو بھلا یہ کب یاد رہے گا۔ چورا چکے ہیں اول درجے کے''۔

''یہ تمہاری بڑی مہربانی ہے کہ تم نے مجھے اول درجے کا رتبہ بخشا۔ بس اب چپ رہو، اور سو جاؤ۔''

''سو جاؤں؟''۔ نیند کس کم بخت کو آئے گی۔ جس کا شوہر ایسا گیا گزرا ہو۔ آپ کو کم از کم میرا نہیں تو اپنی ان بچیوں ہی کا کچھ خیال رکھنا چاہیے۔ ان کے تن پر بھی کپڑے نہیں''۔

''ننگی پھرتی ہیں۔ ابھی دس روز ہوئے، میں نے تمہیں ایک تھان پوپلیں کا لا کر دیا تھا۔ اس سے تم نے تینوں بچیوں کے معلوم نہیں کتنے فراک بنائے۔ اب کہتی ہو کہ ان کے تن پر کپڑے ہی نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ غلط بیانی کیوں ہوتی ہے۔ کل کو تم یہ شکایت کرو گی کہ تمہارے پاس کوئی جوتا، کوئی سینڈل نہیں۔ حالانکہ تمہاری الماری میں کئی جوتے اور سینڈلیں پڑی ہیں۔ چار روز ہوئے تمہارے لیے واکنگ شو لے کر آیا تھا۔''

''بڑا احسان کیا تھا آپ نے مجھ پر۔''

''احسان کی بات نہیں۔ میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔''

''آپ حقیقت بیان کر رہے ہیں، تو اس حقیقت کا انکشاف بھی کر دیجیے کہ آج آپ کے منہ سے بو کیوں آ رہی ہے۔''

''کیسی بو''

''اوہ ــــــ تو تمہارا مطلب ہے، میں نے شراب پی ہے۔''

''مطلب وطلب میں نہیں جانتی۔ جو بو آپ کے منہ سے میری ناک تک پہنچ رہی ہے صریحاً اسی خبیث چیز کی ہے''۔

''میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے نہیں پی۔ ایک برس سے میں نے ایک قطرہ نہیں پیا۔ تم خواہ مخواہ شک کرنے لگتی ہو۔''

''خواہ مخواہ تو کوئی شک نہیں کرتا۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''بھئی کسی کی بھی قسم لے لو۔ میں نے نہیں پی۔ نہیں پی ــــــ نہیں پی''۔

''آپ کا اُکھڑا اُکھڑا لہجہ چغلی کھا رہا ہے۔''

''اس لہجے کو جھونکو جہنم میں۔ میں نے نہیں پی۔!''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن آثار بتا رہے ہیں کہ آپ نے کم از کم آدھی بوتل پی ہے۔''

''یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟''

''پندرہ برس ہو گئے ہیں آپ کے ساتھ زندگی گزارتے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی۔ آپ کو یاد ہے، ایک مرتبہ آپ نے مجھے ٹیلی فون کیا تھا اور میں نے فوراً آپ کی آواز سے اندازہ لگا کر آپ سے کہا تھا کہ اس وقت آپ چار پیگ پیے ہوئے ہیں۔ کیا یہ جھوٹ تھا؟''

''نہیں۔۔۔ اس دن میں نے واقعی چار پیگ پیے تھے۔''

''اب میرا اندازہ یہ ہے کہ آپ نے آدھی بوتل پی رکھی ہے۔ اس لیے کہ آپ ہوش میں ہیں۔''

''یہ عجیب منطق ہے۔''

''منطق ونطق میں نہیں جانتی۔ میں نے آپ کے ساتھ پندرہ برس گزارے ہیں۔ میں اس دوران میں یہی دیکھتی رہی ہوں کہ اگر آپ دو تین پیگ پئیں تو بہک جاتے ہیں۔ اگر پوری بوتل یا اس کا نصف چڑھا جائیں تو ہوش مند ہو جاتے ہیں۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب بھی میں پیوں تو آدھے سے کم نہ پیوں۔''

''آپ کو تو مجھے ایک روز زہر پلانا پڑے گی تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔''

''کون سا قصہ۔ زلیخا کا؟''

''زلیخا کی ایسی کی تیسی —— میرا نام کچھ اور ہے۔ غالباً آپ اس نشے کے عالم میں بھول گئے ہوں گے۔''

''میں تمہارا نام کیسے بھول سکتا ہوں؟''

''بتائیے کیا نام ہے میرا؟''

''تمہارا نام —— تمہارا نام؟ —— لیکن نام میں کیا پڑا ہے۔ چلو آج سے زلیخا ہی سہی۔''

''اور آپ یوسف!''

''قسم خدا کی، آج تم نے طبیعت صاف کر دی میری۔ لو یہ سو روپے کا نوٹ۔ آج اپنے لیے کوئی چیز خرید لو۔''

''یہ نوٹ آپ پاس ہی رکھیے۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ ایسے لمحات میں بہت فیاض ہو جایا کرتے ہیں۔''

''کون سے لمحات میں؟''

''یہی لمحات جب آپ نے پی رکھی ہو۔''

''یہ پی پی کی رٹ تم نے کیا لگا رکھی ہے تم سے سو دفعہ کہہ چکا ہوں کہ پچھلے چھ مہینوں سے میں نے ایک قطرہ بھی نہیں پیا، لیکن تم مانتی ہی نہیں۔ اب اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟''

''اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنا علاج کرائیے۔ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ لیجیے تاکہ وہ آپ کی اس بد عادت کو دور کر سکے۔ آپ کبھی غور و فکر کریں تو آپ کو معلوم ہو کہ آپ کی صحت کتنی گر چکی ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کے رہ گئے ہیں۔ میں ساری رات روتی رہتی ہوں۔''

''صرف ایک دو منٹ رونا کافی ہے، ساری رات رونے کی کیا ضرورت ہے اور پھر اتنا پانی آنکھوں میں کہاں سے آجاتا ہے جو ساری رات تکیوں کو سیراب کرتا ہے۔''

''آپ مجھ سے مذاق نہ کیجیے۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا۔ ساری رات کوئی عورت، کوئی مرد رو نہیں سکتا۔ البتہ اونٹ یہ سلسلہ کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے کوہان میں کافی پانی جمع ہوتا ہے، جو آنسو بن بن کے ان کی آنکھوں سے ٹپک سکتا ہے۔ مگرمچھ ہیں، جن کے آنسو مشہور ہیں۔ یہ پانی میں رہتے ہیں، اس لیے ان کو متواتر پانی بہانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ میں آبی حیوان یا جانور نہیں، اور نہ تم ہو۔''

''آپ تو فلسفہ بکھیرنے لگتے ہیں۔''

''فلسفہ کوئی اور چیز ہے، جس کے متعلق تمھارے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوگا۔ میں صرف ایسی باتیں بیان کر رہا تھا، جو عام آدمی سوچ سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے، مگر افسوس ہے کہ تم نے انھیں نہ سمجھا اور ان پر فلسفے کا لیبل لگا دیا۔''

''میں جاہل ہوں۔ بیوقوف ہوں۔ ان پڑھ ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ تسلیم ہے۔ جانے میری بلا کہ فلسفہ کیا ہے؟ میں تو صرف اتنا پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ کے منہ سے وہ گندی گندی بو کیوں آرہی ہے؟''

''میں کیا جانوں۔ ہو سکتا ہے، میں نے آج دانت صاف نہ کیے ہوں''۔

''غلط ہے ہم دونوں نے اکٹھے صبح غسل خانے میں دانتوں پر برش کیا تھا۔ ٹوتھ پیسٹ ختم ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً نوکر کو بھیجا اور وہ کولی نوس لے کر آیا''۔

''ہاں، ہاں مجھے یاد آگیا''۔

''آپ ہوش ہی میں نہیں۔ آپ کی یاد کو اب کب تک جگاتی رہوں گی۔''

''یاد کو چھوڑو کل صبح تم ٹھیک پانچ بجے جگا دینا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔''

''ضروری کام کیا ہے آپ کو؟ شراب کی بوتل کا بندوبست کرنا ہوگا۔''

''بھئی، مدت ہوئی میں اس چیز سے نا آشنا ہو چکا ہوں۔''

''آج تو آپ پوری طرح آشنا ہو کے آئے ہیں''۔

''یہ سراسر بہتان ہے۔ میں تمہاری قسم کھا کے ——''۔

''میری قسم آپ نہ کھائیے۔ آپ کیسی بھی قسم کھائیں، مجھے آپ کی کسی بات پر یقین نہیں آئے گا، اس لیے کہ شراب پینے کے بعد آپ کی کوئی بات قابل اعتماد نہیں ہوتی۔''

''یعنی تم ابھی ——''۔

''آپ کو یہ ہچکی شروع کیوں ہوگئی؟''

''ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ مجھے معلوم نہیں۔ شاید ڈاکٹروں کو بھی نہ ہو۔''

''پانی لاؤں؟''

''نہیں —— اندر میری الماری میں گلیسرین پڑی ہے، وہ لے آؤ۔''

''اس سے کیا ہوگا۔''

''وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔''

''آپ نشے میں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ گلیسرین کا استعمال غلط ہو جائے۔''

''جاؤ۔ اس کے چار قطرے فوراً ہچکی بند کر دیں گے۔''

''لیکن آپ کے منہ سے یہ بو کس چیز کی آ رہی ہے۔''

''میرے پیچھے —— کیو —— کیو —— کیوں پڑی ہو؟ گلیسرین لاؤ۔''

''لاتی ہوں۔ یہ سب شراب پینے کی وجہ سے ہے۔''

''کس کم بخت نے پی ہے۔ اگر پی ہوتی تو یہ حال نہ ہوتا۔''

''لے آئی ہو گلیسرین۔''

''جی نہیں، وہاں آپ کی بوتل پڑی تھی۔ اس میں سے تھوڑی سی گلاس میں ڈال کر لے آئی ہوں۔ پانی کا گلاس بھی ساتھ ہے۔ آپ خود جتنا چاہیں اس میں ملا لیجیے۔ میرا خیال ہے گلیسرین سے آپ کو اتنا فائدہ نہیں پہنچے گا جتنا اس چیز سے۔''

☆☆☆☆☆

سُرمہ

فہمیدہ کی جب شادی ہوئی تو اُس کی عمر انیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اُس کا جہیز تیار تھا۔ اس لیے اُس کے والدین کو کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ پچیس کے قریب جوڑے تھے، اور زیورات بھی، لیکن فہمیدہ نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ سرمہ جو خاص طور پر ان کے یہاں آتا ہے، چاندی کی سُرمے دانی میں ڈال کر اُسے ضرور دیں۔ ساتھ ہی چاندی کا سرمچو بھی۔

فہمیدہ کی یہ خواہش فوراً پوری ہوگئی۔ اعظم علی کی دکان سے سُرمہ منگوایا۔ برکت کی دکان سے سُرمے دانی اور سرمچو لیا اور اس کے جہیز میں رکھ دیا۔

فہمیدہ کو سرمہ بہت پسند تھا۔ وہ اُس کو معلوم نہیں، کیوں اتنا پسند تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کا رنگ بہت زیادہ گورا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ تھوڑی سی سیاہی بھی اس میں شامل ہو جائے۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے سُرمے کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

اُس کی ماں اُس سے اکثر کہتی۔ ''فہمی ـــــ یہ تمہیں کیا خبط ہو گیا ہے ـــــ جب نہ تب آنکھوں میں سُرمہ لگاتی رہتی ہو ـــــ''۔

فہمیدہ مسکراتی۔ ''امی جان ـــــ اس سے نظر کمزور نہیں ہوتی ـــــ آپ نے عینک کب لگوائی تھی''؟

''بارہ برس کی عمر میں ـــــ''۔

فہمیدہ ہنستی۔ ''اگر آپ نے سُرمے کا استعمال کیا ہوتا، تو آپ کو کبھی عینک کی ضرورت محسوس نہ

ہوتی ـــــ اصل میں ہم لوگ کچھ زیادہ ہی روشن خیال ہو گئے ہیں، لیکن روشنی کے بدلے ہمیں اندھیرا ہی اندھیرا ملتا ہے۔"

اُس کی ماں کہتی۔"جانے کیا بک رہی ہو۔"

"میں جو کچھ بک رہی ہوں، صحیح ہے ـــــ آج کل لڑکیاں نقلی بھویں لگاتی ہیں ـــــ کالی پنسل سے خدا معلوم اپنے چہرے پر کیا کچھ کرتی ہیں ـــــ لیکن نتیجہ کیا نکلتا ہے ـــــ چڑیل بن جاتی ہیں۔"

اُس کی ماں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔"جانے کیا کہہ رہی ہو۔ میری سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آیا۔"

فہمیدہ کہتی۔"امی جان! آپ کو اتنا تو سمجھنا چاہیے کہ دُنیا میں صرف خاک ہی خاک نہیں ـــــ کچھ اور بھی ہے۔"

اُس کی ماں اس سے پوچھتی۔"اور کیا ہے؟"

فہمیدہ جواب دیتی۔"بہت کچھ ہے ـــــ خاک میں بھی سونے کے ذرے ہو سکتے ہیں۔"

خیر ـــــ فہمیدہ کی شادی ہو گئی ـــــ پہلی ملاقات میاں بیوی کی بڑی دل چسپ تھی۔ جب فہمیدہ کا خاوند اس سے ہم کلام ہوا، تو اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں سیاہیاں تیر رہی ہیں۔

اس کے خاوند نے پوچھا۔"یہ تم اتنا سرمہ کیوں لگاتی ہو؟"

فہمیدہ جھینپ گئی اور جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔

اُس کے خاوند کو یہ ادا پسند آئی اور وہ اس سے لپٹ گیا ـــــ لیکن فہمیدہ کی سُرمہ بھری آنکھوں سے ٹپ ٹپ کالے کالے آنسو بہنے لگے۔

اُس کا خاوند بہت پریشان ہو گیا،"تم رو کیوں رہی ہو؟"

فہمیدہ خاموش رہی۔

اُس کے خاوند نے ایک بار پھر پوچھا"کیا بات ہے ـــــ آخر رونے کی وجہ کیا ہے ـــــ میں نے تمہیں کوئی دکھ پہنچایا؟

"جی نہیں"۔

"تو پھر رونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"کوئی بھی نہیں"۔

اُس کے خاوند نے اس کے گال پر ہولے ہولے تھپکی دی اور کہا'' جان من جو بات ہے مجھے بتا دو ــــ اگر میں نے کوئی زیادتی کی ہے تو اس کی معافی چاہتا ہوں ــــ دیکھو تم اس گھر کی ملکہ ہو ــــ میں تمہارا غلام ہوں ــــ لیکن مجھے یہ رونا دھونا اچھا نہیں لگتا ــــ میں چاہتا ہوں کہ تم سدا ہنستی رہو''۔

فہمیدہ، روتی رہی۔

اُس کے خاوند نے اُس سے ایک بار پھر پوچھا۔'' آخر اس رونے کی وجہ کیا ہے؟''

فہمیدہ نے جواب دیا۔'' کوئی وجہ نہیں ہے، آپ پانی کا ایک گلاس لا دیجیے مجھے۔''

اُس کا خاوند فوراً پانی کا ایک گلاس لے آیا ــــ فہمیدہ نے اپنی آنکھوں میں لگا ہوا سرمہ دھویا ــــ تولیے سے اچھی طرح صاف کیا ــــ آنسو خود بخود خشک ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اپنے خاوند سے ہم کلام ہوئی۔

'' میں معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کو میں نے اتنا پریشان کیا ــــ اب دیکھیے، میری آنکھوں میں سُرمے کی ایک لکیر بھی باقی نہیں رہی''۔

اُس کے خاوند نے کہا۔'' مجھے سرمے پر کوئی اعتراض نہیں ــــ تم شوق سے اس کو استعمال کرو ــــ مگر اتنا زیادہ نہیں کہ آنکھیں ابلتی نظر آئیں۔''

فہمیدہ نے آنکھیں جھکا کر کہا،'' مجھے آپ کا ہر حکم بجا لانا ہے ــــ آئندہ میں کبھی سرمہ نہیں لگاؤں گی''۔

'' نہیں، نہیں ــــ میں تمہیں اس کے استعمال سے منع نہیں کرتا ــــ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ــــ کہ میرا مطلب ہے کہ اس چیز کو بقدرِ کفایت استعمال کیا جائے ــــ ضرورت سے زیادہ جو بھی چیز استعمال میں آئے گی، اپنی قدر کھودے گی''۔

فہمیدہ نے سُرمہ لگانا چھوڑ دیا ــــ لیکن پھر بھی وہ اپنی چاندی کی سُرمے دانی اور چاندی کے سرمچو کو ہر روز نکال کر دیکھتی تھی اور سوچتی تھی کہ یہ دونوں چیزیں اس کی زندگی سے کیوں خارج ہو گئی ہیں۔ وہ کیوں ان کو اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دے سکتی۔

صرف اس لیے کہ اُس کی شادی ہو گئی ہے؟

صرف اس لیے کہ وہ اب کسی کی ملکیت ہو گئی ہے؟

یا ہوسکتا ہے کہ اُس کی قوتِ ارادی سلب ہوگئی ہو۔

وہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکی تھی —— کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔

ایک برس کے بعد اُس کے ہاں چاند سا بچہ آ گیا۔

فہمیدہ نڈھال تھی، لیکن اسے اپنی کمزوری کا کوئی احساس نہیں تھا، اس لیے کہ وہ اپنے لڑکے کی پیدائش پر نازاں تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اُس نے کوئی بہت بڑی تخلیق کی ہے۔

چالیس دنوں کے بعد اُس نے سرمہ منگوایا اور اپنے نومولود لڑکے کی آنکھوں میں لگایا —— لڑکے کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں —— اُن میں جب سُرمہ کی تحریر ہوئی تو وہ اور بھی زیادہ بڑی ہوگئیں۔

اس کے خاوند نے کوئی اعتراض نہ کیا کہ وہ بچے کی آنکھوں میں سرمہ کیوں لگاتی ہے —— اس لیے کہ اسے بڑی اور خوب صورت آنکھیں پسند تھیں۔

دن اچھی طرح گزر رہے تھے۔ فہمیدہ کے خاوند شجاعت علی کو ترقی مل گئی تھی۔ اب اُس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے کے قریب تھی۔ ایک دن اُس نے اپنے لڑکے، جس کا نام اس کی بیوی نے عاصم رکھا تھا، سُرمہ لگی آنکھوں کے ساتھ دیکھا —— وہ اس کو بہت پیارا لگا۔ اس نے بے اختیار، اس کو اٹھایا، چوما چاٹا اور پلنگڑی پر ڈال دیا —— وہ ہنس رہا تھا، اور اپنے ننھے منے ہاتھ پاؤں اِدھر اُدھر مار رہا تھا۔

اُس کی سالگرہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ فہمیدہ نے ایک بہت بڑے کیک کا آرڈر دے دیا تھا —— محلے کے سب بچوں کو دعوت دی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے لڑکے کی پہلی سالگرہ بڑی شان سے منائی جائے۔

سالگرہ یقیناً شان سے منائی جاتی، مگر دو دن پہلے عاصم کی طبیعت ناساز ہوگئی اور ایسی ہوئی کہ اسے تشنج کے دورے پڑنے لگے ——!

اُسے ہسپتال لے گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا۔ تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ اسے ڈبل نمونیا ہوگیا ہے۔

فہمیدہ رونے لگی —— بلکہ سر پیٹنے لگی۔ ''ہائے میرے لال کو یہ کیا ہوگیا ہے —— ہم نے تو اسے پھولوں کی طرح پالا ہے۔''

ایک ڈاکٹر نے اُس سے کہا۔ ''میڈم، یہ بیماریاں انسان کے احاطہ اختیار میں نہیں۔ ویسے بحیثیت ڈاکٹر میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ بچے کے جینے کی کوئی اُمید نہیں۔''

فہمیدہ نے رونا شروع کر دیا۔ ''میں تو خود مر جاؤں گی ـــــ خدا کے لئے، ڈاکٹر صاحب! اسے بچا لیجیے۔ آپ علاج کرنا جانتے ہیں ـــــ مجھے اللہ کے گھر سے امید ہے کہ میرا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر نے بڑے خشک لہجے میں کہا۔ ''خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

''آپ اتنے ناامید کیوں ہیں؟''

میں نااُمید نہیں۔ لیکن میں آپ کو جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا۔''

''جھوٹی تسلیاں، آپ مجھ کو کیوں دیں گے ـــــ مجھے یقین ہے کہ میرا بچہ زندہ رہے گا۔''

''خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔''

مگر خدا نے ایسا نہ کیا اور وہ تین روز کے بعد ہسپتال میں مر گیا۔

فہمیدہ پر دیر تک پاگل پن کی کیفیت طاری رہی۔ اس کے ہوش و حواس گم تھے۔ کوئلے اٹھاتی۔ انہیں پیستی اور اپنے چہرے پر ملنا شروع کر دیتی۔

اُس کا خاوند سخت پریشان تھا۔ اس نے کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ دوائیں بھی دیں، لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ فہمیدہ کے دل و دماغ میں سُرمہ ہی سُرمہ تھا۔ وہ ہر بات کالک کے ساتھ سوچتی تھی۔

اُس کا خاوند اس سے کہتا ''کیا بات ہے، تم اتنی افسردہ کیوں رہتی ہو؟''

وہ جواب دیتی ''جی، کوئی خاص بات نہیں ـــــ مجھے آپ سُرمہ لادیجیے۔''

اُس کا خاوند اس کے لئے سُرمہ لے آیا۔ مگر فہمیدہ کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ وہ خود بازار گئی اور اپنی پسند کا سُرمہ خرید کر لائی۔

اپنی آنکھوں میں لگایا اور سو گئی ـــــ جس طرح وہ اپنے بیٹے عاصم کے ساتھ سویا کرتی تھی۔

صبح جب اُس کا خاوند اُٹھا اور اُس نے اپنی بیوی کو جگانے کی کوشش کی تو وہ مردہ پڑی تھی۔ اس کے پہلو میں ایک گڑیا تھی جس کی آنکھیں سُرمے سے لبریز تھیں۔

(دستخط) سعادت حسن منٹو

۱۱۔ دسمبر ۱۹۵۴ء

☆☆☆☆☆

کالی کلی

جب اُس نے اپنے دشمن کے سینے میں اپنا چھرا پیوست کیا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سینے کے زخم سے سُرخ سُرخ لہو کا چشمہ پھوٹنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں وہاں لہو کا چھوٹا سا حوض بن گیا۔ قاتل پاس کھڑا اُس کی تعمیر دیکھتا رہا تھا۔ جب لہو کا آخری قطرہ باہر نکلا تو لہو کی حوضیہ میں مقتول کی لاش ڈوب گئی اور وہ پھر سے اڑ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ننھے ننھے پرندے اُڑتے، چُوں چُوں کرتے حوضیہ کے پاس آئے تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان کا باپ یہ لال لال پانی کا خوبصورت حوض کیسے بن گیا۔ نیچے تہ میں ایک قطرۂ خون، اپنے لہو کی آخری بوند، جو اس نے چوری چوری اپنے دل کے خفیہ گوشے میں رکھ لی تھی تڑپنے لگی۔ اس کا یہ رقص ایسا تھا جس میں زرق برق پشوازوں کا کوئی بھڑکیلا پن نہیں تھا، معصوم بچے کے سے چہل تھے۔ وہ اچھل کود رہی تھی اور اپنے دل ہی میں خوش ہو رہی تھی۔ اس کو اس بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ وہ چار چڑیاں جو حوض کے اوپر بیقراری سے پھڑ پھڑاتی دائرہ بناتی اُڑ رہی ہیں ان کے دل ہانپ رہے ہیں اور بہت ممکن ہے وہ ہانپتے ہانپتے ان کے سینوں سے اچھل کر حوض میں گر پڑیں۔ وہ اپنی خوشی میں مست تھی۔

اُوپر اُڑتی ہوئی چڑیوں میں ایک چڑیا نے جو شکل وصورت کے اعتبار سے چڑا معلوم ہوتا تھا کہا۔ ''تم رو رہی ہو؟''

چڑیا نے اپنی اڑان ہلکی کر دی، چنانچہ تیز ہوا میں لڑھکتے ہوئے اس نے اپنے ننھے سے نرم و نازک اور ریشم جیسے پر کو اپنی چُونچ سے پھیلا کر اپنی ایک آنکھ پونچھی اور جلدی سے اپنے دوسرے پروں کے اندر اس آنسو آلود پری کو چھپالیا۔ دوسری آنکھ کے اس جل دیپ کو اُس نے ایسے ہی ننھے سے مخملیں پر سے

پھونک ماری۔ وہ فوراً راکھ بن کر حوض کی سُرخ آنکھوں میں سُرمے کی تحریر بن کر تیرنے لگی۔

حوض کی یہ تبدیلی دیکھ کر باقی تین چڑیوں نے پلٹ کر چوتھی چڑیا کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں اس کو سرزنش کی اور ایک دم اپنے سارے پر سمیٹ لیے اور چشم زدن میں وہ حوض کے اندر تھیں —— حوض کا لال لال پانی ایک لمحے کے لیے تھرتھرا اُٹھا۔ اس نے زبردستی ان کی بند چونچوں میں اپنی بڑی چونچ سے اپنے خون کی ایک ایک بوند ڈالنے کی کوشش کی، جس طرح ماں باپ اپنے پیارے بچوں کے حلق میں چمچوں کے ذریعے سے دوا ٹپکاتے ہیں، مگر وہ نہ کھلیں ——

وہ سمجھ گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے چنانچہ اس کی آنکھوں سے اتنا ہی سفید پانی بہہ نکلا، جتنا اس حوضیہ میں لال تھا —— جو وہ قاتل اس ایک لال بوند کے بغیر، جو اس کے اُوپر اُڑ رہی تھی اور اس سفید پانی سمیت، جو وہ اس کے وجود میں چھوڑ گیا تھا۔

اُس نے یہ سفید آنسو اور بہانے چاہے مگر وہ بالکل خشک تھے۔ ایک صرف اس کی آنکھوں کی بصارت باقی تھی —— وہ اسی پر قانع ہو گیا —— اس نے دیکھا کہ اس کی حوضیہ کے پانی کا رنگ بدل رہا ہے۔ اس کے لئے یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی کہ جب قتل نہیں کیا گیا تھا۔ قتل کے بعد تو اُس نے سنا تھا کہ سفید سے سفید خون بھی جیتا جاگتا سُرخ ہو جاتا ہے۔

دن بدن حوض کا پانی نئی رنگت اختیار کرنے لگا۔ شروع شروع میں تو وہ گرم گرم سرخ قرمزی تھا۔ تھوڑی دیر میں بھوسلا پن اس میں پیدا ہونے لگا۔ یہ تبدیلی بڑی سست رفتار تھی۔

اس نے سنا تھا کہ قدرت اٹل ہے، وہ کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ سوچتا کہ یہ قدرت کیسی ہے جو اس کی اپنے عناصر سے تخلیق کی ہوئی چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اب اسے کسی تصویر ساز کی پلیٹ بنا رہی ہے جس پر وہ ایک مرتبہ صاف اور شدھ رنگ لگا کر، پھر اس پر سینکڑوں دوسرے رنگوں کی تہیں چڑھا دیتا ہے اور بہت مسرور ہوتا ہے —— اس میں مسرت انگیز بات ہی کیا ہے اور اس بات کے لیے کہ ایک بے گناہ کو قتل کروا دینا؟ —— یہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔

میں اگر اپنے قاتل کی جگہ ہوتا تو کیا کرتا؟ —— ہاں کیا کرتا؟

اسے اپنے ہاتھوں سے نقرئی تاروں والا ہار پہناتا —— زربفت کی اس کی اچکن ہو، سر تلّے دار دستار اور اس طائرِ تازی پر سوار جس پر زربفت کی جھول ہو اور وہ اس پر سوار ہو کر قدرت بانو کو دلھن بنا کر گھر لانے کے لیے روانہ ہو جائے۔ اس کے جلو میں صرف اس کے خون کے قطرے ہوں۔

وہ سوچتا کتنی شاندار سواری ہوتی جو آج تک کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ وہ ایک بہت اونچے درخت پر اپنا گھونسلا بناتا جس میں حجلۂ عروسی کو بٹھاتا۔ اس کا چہرہ حیا کے باعث رنگ برنگ کے پروں کے گھونگھٹ کی اوٹ میں ہوتا۔ وہ اس نقاب کو بہت ہولے ہولے اُٹھاتا۔ جوں جوں نقاب اوپر کو اٹھتی، اس کا دل نفرت وحقارت سے لبریز ہوتا جاتا۔ اس کے انتقامی جذبے کی آگ اور زیادہ تیز ہوتی جاتی جیسے اس کی نقاب کے پر اس پر تیل نچڑ رہے ہوں لیکن وہ اس جذبے کو اپنے دل میں وہیں دبا دیتا جیسے وہ مرجھائے ہوئے پھولوں کی رُوکھی سُوکھی اور بے کیف پتیاں ہیں جنہیں کئی ننھی ننھی ناگ سنپونیوں نے پھونکیں مار مار کر ڈس دیا ہو۔

شبِ عروسی میں اس نے اپنی دلھن سے بڑی پیاری اور محبت بھری باتیں کیں، ایسی باتیں جن کو سننے کے بعد سب پرندوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ یہ ایسا کلام ہے جو اگر فرشتے اور حوریں بھی اپنے سازوں پر گائیں تو خود کو عاجز سمجھیں اور بربطوں کے تار جھنجھلا اٹھیں کہ یہ نغمہ ہم سے کیوں ادا نہیں ہو سکتا۔ آخر کار فرشتوں نے اپنے حلق میں اپنی اپنی دلھنوں کی مانگ کے سیندور بھر لیے اور مر گئے۔ حوروں نے اپنے بربط توڑ ڈالے اور ان کے باریک تاروں کا پھندا بنا کر خودکشی کر لی۔

اس کو اپنے یہ افکار بہت پسند آئے تھے، اس لیے کہ یہ غیب سے آئے ہیں۔ چنانچہ اس نے گانا شروع کیا۔ اس کا الحان واقعی الہامی تھا۔ اگر پرندوں کے ہجوم کو وہ صرف چند نغمے سناتا تو وہ یقیناً بے خودی کے عالم میں زخمی طیور کے مانند پھڑ پھڑانے لگتیں اور اسی طرح پھڑ پھڑاتی پھڑ پھڑاتی قدرت کے اشجار کو پیاری ہو جاتیں۔ وہ اپنے تمام پتے اور اپنی کومل شاخوں کو نوچ کر ان کی لاشوں پر آرام سے رکھ دیتے۔ ادھر باغ کے سارے پھول اپنی تمام پتیاں ان پر نچھاور کر دیتے۔ کھلی اور ان کھلی کلیاں بھی خود کو ان کی مجموعی تربت کی آرائش کے لیے پیش کر دیتیں۔

پھر تمام سرنگوں ہو کر انتہائی غم ناک سُروں میں دھیمے دھیمے سُروں میں شہیدوں کا نوحہ گاتیں ـــــــ ساتوں آسمانوں کے تمام فرشتے اپنے اپنے آسمان کی کھڑکیاں کھول کر اس سوگ کے جشن کا نظارہ کرتے اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں جو ہلکی ہلکی پھوار کی صورت میں ان خاکی شہیدوں کی پھولوں سے لدی پھندی تربت کو نم آلودہ کر دیتیں تاکہ اس کی تازگی دیر تک رہے۔

سنا ہے کہ یہ تربت دیر تک قائم رہی ـــــــ پھول جب بالکل باسی ہو جاتے، پتے خشک ہو جاتے تو ان کی جگہ اپنے بدن سے نوچ نوچ کر آہستہ آہستہ اس تربت پر رکھ دیے جاتے۔

اُدھر دوسرے باغ میں جو اپنی خوبصورتی کے باعث تمام دنیا میں بہت مشہور تھا۔ ایک طائر جس کا نام بلبل یعنی ہزار داستان ہے اپنے حُسن اور اپنی خوش الحانی پر نازاں بلکہ یوں کہئے کہ مغرور تھا۔ باغ کی ہر کلی اس پر سو جان سے فدا تھی مگر وہ ان کو منہ نہیں لگاتا۔

اگر کبھی از راہِ تفریح وہ کبھی کسی کلی پر اپنی خوبصورت منقار کی ضرب لگا کر اسے قدرت کے اصولوں کے خلاف پہلے ہی کھول دیتا تو اس غریب کا جی باغ باغ ہو جاتا، پر وہ شادی مرگ ہو جاتی۔

اور دل ہی دل میں دوسری کھلی ان کھلی کلیاں حسد اور رشک کے مارے جل بھن کر راکھ ہو جاتیں اور وہ کسی چٹان کی چوٹی کے سخت پتھر پر ہولے سے یوں بیٹھتا کہ اس پتھر کو اس کا بوجھ محسوس نہ ہو۔ اطمینان کر کے اس پتھر نے اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا ہے، تو وہ موم کر دینے والا ایک حزنیہ نغمہ شروع کرتا ـــــ بہ فرطِ ادب اور تاثر کے باعث سرنگوں ہو جاتے۔

کلیاں سوچتیں کہ یہ کیا وجہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے التفات سے محروم رکھتا ہے ـــــ ہم میں سے اکثر جل جل کے بھسم ہو گئیں ـــــ پر اس کو ہماری کچھ پروا نہیں۔

ایک سفید کلی اپنے شبنمی آنسو پونچھ کر کہتی ہے۔ "ایسا نہ کہو بہن، اس کو ہماری ہر ادا ناپسند ہے۔"

کالی کلی کہتی۔ "تو سفید جھوٹ بولتی ہے ـــ میری طرف کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھے ـــــ دونوں دیدے پھوڑ ڈالوں۔"

کاسنی کلی کو دکھ ہوتا: "ایسا کرو گی تو تم کہاں رہو گی؟"

سفید کلی طنزیہ انداز میں اس مغرور پرندے کی طرف سے جواب دیتی۔ "اس کے لیے دنیا کے تمام باغوں کی کلیوں کے منہ کھلے ہیں ـــــ وہ نیلے آسمان کے نیچے جہاں بھی چاہے اپنے حسین خیمے گاڑ سکتا ہے۔"

کالی کلی مسکراتی ـــــ یہ مسکراہٹ سنگِ اسود کے چھوٹے سے کالے تریڑے کے مانند کھلتی۔

"سفید کلی نے ٹھیک کہا ہے۔ خواہ مجھے خوش کرنے کے لیے ہی کہا ہو ـــــ میں یہاں کا بادشاہ ہوں۔"

سفید کلی اور زیادہ نکھر گئی۔ "حضور! آپ شہنشاہ ہیں ـــــ اور ہم سب آپ کی کنیزیں۔"

کالی کلی نے زور سے اپنے پر پھڑ پھڑائے جیسے وہ بہت غصے میں ہے۔ "ہم میں مجھے شامل نہ کرو ـــــ مجھے اس سے نفرت ہے۔"

جونہی کالی کلی کی زبان سے یہ گستاخانہ الفاظ نکلے، سب چڑیاں ڈر کے مارے پھڑ پھڑاتی ہوئی وہاں سے اڑ گئیں۔ ایک صرف کالی کلی باقی رہ گئی۔

اس نے آنکھ اٹھا کر بھی اس چٹان کو نہ دیکھا جس کے ایک کنگرے کی نوک پر وہ اکڑ کر کھڑا تھا —— کالی کلی اس کے قدموں میں تھی —— اپنی اس بے اعتنائی اور رعونت کے ساتھ۔

حسین وجمیل بلبل کو اس بے اعتنائی اور رعونت سے پہلی مرتبہ دو چار ہونا پڑا تھا۔ اس کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ چٹان سے نیچے اتر کر وہ ہولے، ہولے، جیسے ٹہل رہا ہے، کالی کلی کے قریب سے گزرا گویا وہ اس کا موقع دے رہا ہے کہ تم نے جو غلطی کی ہے درست کرلو —— پر اس نے اس فیاضانہ تحفے کو ٹھکرا دیا۔

اس پر بلبل اور جھنجھلایا اور مڑ کر کالی کلی سے مخاطب ہوا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے، تم نے مجھے پہچانا نہیں۔''

کالی کلی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''ایسی تم میں کون سی خوبی ہے جو کوئی تمہیں یاد رکھے —— تم ایک معمولی چڑے ہو، جو لاکھوں یہاں پڑے جھک مارتے ہیں۔''

بلبل سراپا عجز ہو گیا۔ ''دیکھو، میں اس باغ کا تمام حسن تمہارے قدموں میں ڈھیر کرسکتا ہوں۔''

کالی کلی کے ہونٹوں پر کالی طنزیہ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ''میں رنگوں کے بے ڈھب، بے جوڑ رنگوں کے ملاپ کو حسن نہیں کہہ سکتی —— حسن میں یک رنگی اور یک آہنگی ہونی چاہیے۔''

''تم اگر حکم دو تو میں اپنی سرخ دم نوچ کر یہاں پھینک دوں گا ——''

''تمہاری سُرخ دم کے پر، سرخاب کے پر تو نہیں ہو جائیں گے —— رہنے دو، اپنی دُم میں —— میری دم دیکھتے رہا کرو، جو سنگِ اسود کی طرح کالی ہے اور آبنوس کی طرح کالی اور چمکیلی۔''

یہ سن کر وہ اور زیادہ جھنجھلا گیا اور سوچے سمجھے بغیر کالی کلی سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ کر معذرت طلب کرنے لگا۔ ''مجھے معاف کر دینا۔ باغ کی مغرور ترین حسینہ!''

کالی کلی چند لمحات بالکل خاموش رہی، پھر اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ رات کے گھپ اندھیرے میں اچانک دو دیے جل پڑے ہیں۔ ''میں تمہاری کنیز ہوں پیارے بلبل!''

بلبل نے چونچ کا ایک زبردست ٹھونگا مارا اور بڑی نفرت آمیز نا امیدی سے کہا۔ ''جا، دور ہو جا، میری نظروں سے —— اور اپنے رنگ کی سیاہی میں ساری عمر اپنے دل کی سیاہی گھولتی رہ۔

سعادت حسن منٹو (دستخط)

۴ جنوری ۱۹۵۶ء (؟)

☆☆☆☆☆

مضامین

0 پاکستانی ادب:

پاکستان کے فلم

ٹھیٹ پاکستانی فلموں کا تصور کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسا کنواں کھودنے سے پہلے ہی آدمی پیاس سے بے نیاز ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے ایک برس ہو چکا ہے۔ مگر اس عرصے میں ایسا فلمی ادارہ نہیں بن سکا جس پر ہم پاکستان کی چھاپ ثبت کر سکیں۔

مذہبوں میں بُعد تھا لیکن روزمرہ کی زندگی میں اتنا بڑا فاصلہ نہیں تھا اور فلم روزمرہ کی زندگی ہی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لیے جتنے فلم بنے ان میں سے قریب قریب ہر ایک میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا سامان موجود تھا۔

تجارتی نقطۂ نظر سے بھی ایسے فلم تیار کیے جاتے تھے جو سب دیکھیں اور یہ نقطۂ نظر بہت دیر تک قائم رہے گا۔ تقسیم ہو چکی ہے۔ تبادلۂ آبادی بھی ہو چکا ہے۔ مگر اِدھر اور اُدھر دونوں طرف کے فلم سازوں کا یہ نقطۂ نظر نہیں بدلا اور کیسے بدل سکتا ہے، جب سوال کمانے کا ہے۔

ہندوستان میں اگر کسی نے ایسا فلم بنایا جو پاکستان کے خلاف ہے تو ظاہر ہے کہ وہ یہاں پاکستان میں نہیں چلے گا۔ بالکل اسی طرح اگر کسی نے پاکستان میں ایسا فلم بنایا جس سے ہندوستانیوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، تو نمائش کے لیے اسے ہندوستان بھیجنا ہی بے کار ہے۔ اوّل تو ایسے فلم، سنسر پاس ہی نہیں کریں گے۔

تقسیم سے پہلے ہندوستانی فلموں کی مارکیٹ صرف ہندوستان کی تھی۔ یا پھر ایران اور افغانستان یا

مشرقی افریقہ کی چھوٹی منڈیاں۔اس کے مقابلے میں امریکی اور انگلیسی فلموں کا میدان بہت ہی وسیع تھا اور اب بھی ہے یعنی ساری دنیا —— یہی وجہ تھی کہ ہندوستانی فلم خاطر خواہ ترقی نہ کر سکے اور فلم انڈسٹری اچھی طرح پنپ نہ سکی۔

آج تو فلم انڈسٹری بٹ کر اور بھی زیادہ کمزور ہو گئی ہے، اِدھر اور اُدھر دونوں طرف۔ پاکستان کے حصے میں ہر چیز قلیل مقدار میں آئی ہے۔فلم انڈسٹری تو اب یہاں ہونے نہ ہونے کے برابر ہے اور اس کا مستقبل بھی کوئی اتنا زیادہ روشن نہیں۔

لاہور میں گنتی کے تین چار اسٹوڈیو تھے۔ایک فسادات میں جل گیا۔اب صرف ایک رہ گیا ہے، پنچولی صاحب، جس میں کچھ مسلم فلم ساز کام کر رہے ہیں۔اس کے دو اسٹیج ہیں۔مگر ان میں ساز و سامان اچھا نہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے اسی کو الٹا سیدھا کر کے یہاں کے فلم ساز روتے دھوتے فلم بنا رہے ہیں۔

یوں تو کہا جا سکتا ہے کہ چند برسوں میں جب کہ حالات اچھے ہو جائیں گے ____ یہی فلم ساز جو اب اوندھے سیدھے فلم بنا رہے ہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ پاکستان فلم انڈسٹری، کی گرتی ہوئی دیواروں کو مضبوط بنا دیں گے، لیکن جب آدمی ان مولویوں کی تقریریں سنتا ہے جو اپنی نام نہاد شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں تو آرٹ کا مستقبل بالکل ہی تاریک ہو جاتا ہے۔

پچھلے دنوں ایک بزرگ ہاتھ میں یہ بڑی قینچی لیے لیے پھرتے تھے اور کہتے تھے اگر میں نے کسی مسلمان عورت کو بے پردہ دیکھا تو میں اس کی چٹیا کاٹ دوں گا۔اب اگر اسی قسم کے دو تین اور گیسو تراش بزرگ پیدا ہو گئے تو فرمایئے فلموں میں کیا رہے گا۔ایکٹرسوں کو ان میں بھی برقع پہن کر کام کرنا پڑے گا۔

یہ سوچ کر اور نام نہاد شریعت کے اثر کی تصویر آنکھوں کے سامنے لا کر سنگیت کا مستقبل بھی تاریک ہو جاتا ہے۔اگر خدانخواستہ غلط قسم کی مولویت کا دور دورہ شروع ہو گیا تو موسیقی کا فن جس میں مسلمانوں نے زندگی پھونکی، یہاں بالکل ہی ناپید ہو جائے گا اور اگر یہ ناپید ہو گیا تو فلم بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ تو تصویر کا تاریک رُخ ہے۔روشن رخ پر نظر ڈالیے تو وہ بھی اتنا حوصلہ افزا نہیں۔فلموں کی جان اس کی کہانی ہوتی ہے۔یہ سوچیے کس قسم کی کہانیاں یہاں فلمائی جائیں گی موضوع تو ہمارے یہاں بے

شمار ہیں لیکن ان پر قلم کون اٹھائے گا۔ ہر موضوع کے ساتھ کئی کئی بکھیڑے وابستہ ہیں۔

پردے پر کچھ لکھیے اور سینما کے پردے پر کچھ پیش کیجیے تو اس کا جو ردِعمل ہوگا آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ طلاق اتنا اچھا موضوع ہے لیکن اس پر بھی ہم کوئی بے باک فلم تیار نہیں کر سکتے اور اگر پہلو بچا کر کوئی فلم بنا بھی دیں تو یہ خطرہ لاحق رہے گا کہ لوگوں میں غلط تعلیم پھیلے گی۔

اُدھر ہندوستان میں فلم سازوں کے راستے میں اتنی مشکلات نہیں جتنی کہ یہاں کے فلم سازوں کے راستے میں ہیں جو قدم قدم پر نمودار ہوں گی۔ وہ لوگ تو ویسے ہی فلم بنائیں گے جیسے بناتے آئے ہیں کیونکہ فلموں کی اکثریت ہندو معاشرت سے متعلق ہوتی تھی۔ مسلمان فلم ساز بھی عام طور پر ایسے ہی فلم بناتے تھے اور انہیں اس کا محاورہ بھی ہو گیا تھا۔ پر اب وہ پاکستان میں کس قسم کے فلم بنائیں گے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ابھی تک کسی کو معلوم نہیں چنانچہ ان دنوں واضح پروگرام کسی کے بھی پیشِ نظر نہیں۔ کوئی ''ہیر رانجھا'' بنا رہا ہے، کوئی ''جہاد'' اور کوئی ''تیری یاد'' جو ہندو معاشرت ہی سے متعلق ہے۔

''جہاد'' جیسا کہ ظاہر ہے، ایسا فلم بنے گا جو صرف پاکستان ہی میں چلے گا۔ ادھر کے دسٹری بیوٹر تو اسے ہاتھ تک نہیں لگائیں گے۔ ''تیری یاد'' واگھے سے ادھر جا سکتی ہے اور ''ہیر رانجھا'' بھی اس لیے کہ ان عاشقوں پر تقسیم کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔

ممکن ہے ''جہاد'' چل نکلے لیکن پھر اس کے لیے بزنس کا میدان اتنا وسیع نہیں اس لیے کہ سارا ہندوستان اس کے حلقۂ تجارت سے کٹ جائے گا اور اگر خدانخواستہ یہ ناکام رہا تو آپ یہ سمجھئے کہ ایک فلم ساز کی کمر ٹوٹ جائے گی۔

یہاں کے فلم سازوں کے سامنے کوئی واضح پروگرام نہیں اس لیے کہ حکومت بھی ابھی تک کوئی واضح پروگرام اپنے لیے متعین نہیں کر سکی۔ لیکن فلم سازوں کو اپنا نفع نقصان خود سوچنا ہے۔ اس لیے کہ حکومت کی سرپرستی اسے نہ پہلے نصیب تھی اور نہ اب نصیب ہوگی۔

فلموں کے بارے میں حکومت شاید اس لیے غور نہیں کرتی کہ اس کے سامنے اور بے شمار پیچیدہ مسائل ہیں جو سب سے پہلے حل ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ اس صنعت کا درجہ بھی حکومت کی نگاہ میں کوئی اتنا بلند نہیں۔ وہ ٹیکس لگا دے گی لیکن اس کی بہتری کے لیے کچھ نہیں سوچے گی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ فلم سازوں ہی کو سر جوڑ کر اپنی اور اپنی صنعت کی فلاح کے لیے کوئی راستہ تلاش کرنا ہے۔

راستہ تلاش کرنے کے لیے بھی کئی راستے ہیں۔ ایک تو یہی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، ہونے دو، جو کچھ

بنتا ہے بننے دو۔ عوام خود فیصلہ کردیں گے اور بتادیں گے کہ کون سا راستہ غلط ہے کون سا صحیح لیکن یہ راستہ بھی مہنگا ہے۔ تجربے اسی وقت اچھے لگتے ہیں جب خوشحالی ہو، لیکن یہاں تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اوپر تلے دو تین فلم فیل ہوئے تو ساری انڈسٹری ہی اڑن چھو ہو جائے گی۔

ایک راستہ اور بھی ہے وہ یہ کہ صرف مغلیہ فلم بنائے جائیں لیکن ان کے لیے بے اندازہ دولت کی ضرورت ہے جو فی الحال ہمارے فلم سازوں کے پاس ہے نہیں۔ بفرضِ محال کسی نے جی کڑا کر کے ایک فلم بنا بھی لیا تو وہ بدعت جو مغلیہ فلموں میں ''پکا'' نے شروع ہوئی تھی، اس کا کیا ہوگا۔ یعنی فلم ساز کو اس میں بھی بدرجہء مجبوری تاریخ کو گڈ مڈ کر کے مغلوں کے مقابلے میں راجپوت کردار ٹھونسنے پڑیں گے تاکہ غیر بھی خوش رہیں۔

راستے اور بھی ہیں، مگر سب کے سب خاردار۔ اُدھر فلم بنتے رہیں گے۔ اِدھر سوچ بچار ہوتی رہے گی۔ میں یہ طنز کے طور پر نہیں کہہ رہا۔ حالات ہی بہت دگرگوں ہیں۔ اِدھر کشمیر کی لڑائی ہے اُدھر حیدرآباد کا قضیہ ہے۔ کبھی نہر کا پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ کبھی جاری کر دیا جاتا ہے۔

لیجیے صاحب اُدھر جانا ہو تو پرمٹ حاصل کیجیے اور لیجیے واگھے کی تجارت بند —— کون سرمایہ دار ہے جو اس دھاندلی اور افراتفری کے عالم میں اپنی تجوری کھول کر فلم سازی میں روپیہ لگائے گا۔

یوں تو چاروں اور ہچکچاہٹ ہچکچاہٹ ہے۔ لیکن فلمی دنیا پر تو یہ بری طرح مسلّط ہے۔ اسٹوڈیو بنائیں یا نہ بنائیں، اور اگر بنائیں تو ایسی کون سی جگہ ہے جو دونوں ڈومینیوں کی جنگ شروع ہونے کی صورت میں محفوظ و مامون ہوگی۔

کیا فلم میں ہندو کردار رکھے جائیں؟ —— ایسا تو نہیں ہوگا کہ ادھر والے ناپسند کریں۔ اسلامی کردار رکھنے میں کیا مضائقہ ہے، لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ادھر والے رنجیدہ ہو جائیں۔

جو اسلامی فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں میرا خیال ہے وہ یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ اب وہ کسی ایکٹرس کو قرآن شریف کی تلاوت کرتے یا نماز پڑھتے دکھا سکتے ہیں یا نہیں اور ابھی تک کئی فلم پروڈیوسر تو یہی فیصلہ نہیں کر پائے کہ وہ اِدھر کام کریں گے یا اُدھر۔

پاکستان میں کیسے فلم بنیں گے اس کے متعلق آج کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کل کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں بھی کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی اور وہ جو ہمارے تصور میں ٹھیٹ پاکستانی فلم ہیں تو وہ بہت دور کی چیز ہیں۔

بہر حال ہمارے یہاں گنتی کے جو چند فلمی ادارے ہیں اپنی بقاء کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور ان کی یہ کوشش قابل داد ہے۔ اس لیے کہ وہ بالکل اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں۔ اگر صاحب دماغ ان کی راہبری کریں اور حکومت کا تغافل کسی قدر کم ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ حالات اُمید افزا ہو سکتے ہیں اور دم نزع کو پہنچی فلم انڈسٹری سنبھل سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاڑھی مُونچھ برقع اَن لمیٹڈ

وقت کے تقاضے اور پبلک کی ضرورت کے پیشِ نظر چند خادمانِ قوم وملت نے ایک اَن لمیٹڈ کمپنی قائم کی ہے، جس کے حصص دھڑا دھڑ فروخت ہو رہے ہیں۔ خداوند تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ اس کمپنی کو تھوڑے ہی عرصے میں لاکھوں روپے کا منافع ہوگا۔

کمپنی مذکورہ فی الحال دو کام شروع کر رہی ہے۔ ایک تو پردے سے متعلق ہے اور دوسرا ڈاڑھیوں سے، اور یہ دونوں اس وقت بہت اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ فرنگی تہذیب وتمدن اختیار کرنے کے باعث اکثر خواتین کو پردے سے کوئی تعلق اور مردوں کو ڈاڑھیوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ کمپنی کے پیشِ نظر ایسے مردوں اور عورتوں کی جماعت ہے اور یہی اس کا حلقۂ تجارت ہوگا۔

کمپنی کے اربابِ حل وعقد نے فیصلہ کیا ہے کہ جن عورتوں کو پردے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان کو مناسب داموں پر وقت کے اس بہت بڑے مطالبے سے روشناس کرایا جائے، اور آہستہ آہستہ مستور رہنے کا عادی بنایا جائے۔ چنانچہ اس محکمہ کو مندرجہ ذیل حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔

(ا) اونچی سوسائٹی کی خواتین کے لیے ـــ اس ڈیپارٹمنٹ میں ایسے برقعے وضع کیے جائیں گے جن کے اندر رہ کر خواتین کو تکلیف نہ ہو۔ ماہرین چنانچہ ایسے برقعے تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، جو بالکل شفاف ہیں۔ یہ شیشے کے کپڑے سے تیار کیے گئے ہیں۔ کمپنی کو یہ امید ہے کہ یہ اونچی سوسائٹی میں بہت مقبول ہوں گے کیونکہ ان کو استعمال کرنے سے کپڑوں کی سج دھج کی نمائش میں کوئی رکاوٹ

نہیں ہوگی۔

ماہرین ایسے برقعے بھی تیار کر رہے ہیں، جو گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم رہیں۔ان کو ایرکنڈیشنڈ برقعے کہا جائے گا، اور جو شیشے کے شفاف برقعے ہیں ان کو اسٹریم لائینڈ۔

ایسے برقعے بھی اس ڈیپارٹمنٹ میں تیار کیے جا رہے ہیں، جو خوشبو بھی پھیلایا کریں گے یعنی خواتین نے جو خوشبو کپڑوں پر استعمال کی ہوگی چلتے پھرتے برابر باہر بھی نکلتی رہے گی۔

رات کو استعمال کرنے کے لیے ایسے نئی وضع کے برقعے بھی ایجاد کیے جائیں گے جو سارے سراپا کو روشن رکھیں۔ کمپنی کو امید ہے کہ اونچی سوسائٹی میں بہت زیادہ مقبول ہوں گے کیونکہ دس ہزار آرڈر، بنانے سے پہلے ہی موصول ہو چکے ہیں۔

(۲) درمیانے طبقے کی عورتوں کے لیے—— اس ڈیپارٹمنٹ میں جو ماہرین پردہ مقرر کیے گئے ہیں۔وہ ایک جدید قسم کا برقع وضع کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ بڑی نادر چیز ہے۔ درمیانے طبقے کی عورتیں اسے نعمت عظمیٰ قرار دیں گی کیونکہ یہ خاص طور پر ان کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر ایجاد کیا گیا ہے۔ جب چاہا چھپ گئے جب چاہا ظاہر ہو گئے۔ایک بٹن لگا دیا گیا ہے جونہی درمیانے طبقے کی عورت کو کوئی اپنا رشتہ دار نظر آئے اس کو دبا دے۔ وہ اسے پہچان نہیں سکے گا۔

اس برقع کے علاوہ ایک اور برقع بھی ایجاد کیا گیا ہے، جس کو پہننے سے شکل وصورت بالکل تبدیل ہو جاتی ہے۔اصل میں پردے کا مفہوم یہی ہے کہ لوگ دیکھیں تو پہچانیں نہیں۔ چنانچہ کمپنی مذکور کو امید واثق ہے کہ درمیانے طبقے کی عورتوں میں یہ ایجاد بے حد مقبول ہوگی۔

(۳) نچلے طبقے کے لیے—— کمپنی مذکور نے ایک بہت بڑا کارخانہ قائم کر دیا ہے، جہاں اصلی اسپات یعنی فولاد کے برقعے بن رہے ہیں۔ خدا کے فضل وکرم سے یہ ایسے مضبوط بنے ہیں کہ نچلے طبقے کے مردان پر پورا بھروسا کر سکتے ہیں۔ تالے علیحدہ ملتے ہیں۔ جن میں اور کوئی چابی نہیں لگتی۔ دو چابیاں دی جاتی ہیں، جن پر نمبر لگے ہیں۔ اگر یہ گم ہو جائیں تو نمبر بتانے پر کمپنی مذکور تیار کر کے دے دے گی۔ برقعے مفت دیے جائیں گے۔

مغرب زدہ مردوں کے لئے، جو ڈاڑھی اور مونچھ سے بالکل بے نیاز ہو چکے ہیں، بالوں سے متعارف کرانے اور اس کا عادی بنانے کے لیے اس کمپنی نے مختلف طبقوں کی سہولت اور ذرائع کے پیشِ نظر تین ڈیپارٹمنٹ کھول دیے ہیں۔

اونچی سوسائٹی کے معزز حضرات کے لیے ــــــ ایسی مونچھیں اور ڈاڑھیاں تیار کر لی گئی ہیں، جو بالکل تکلیف نہیں دیتیں۔ کسی جلسہ میں تقریر کرنا ہو۔ نماز پڑھنے جانا ہوان کو بے تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وضو کرتے وقت پانی بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ہر سائز کی اور ہر فیشن کی ڈاڑھی موجود ہے۔ خشخشی، بڑی، نوکیلی، پاٹ دار ــــــ باتصویر فہرست چھپ گئی ہے اس میں سے کوئی بھی نمونہ پسند کیا جاسکتا ہے۔ مختلف موقعوں کے لیے مختلف ڈیزائن کی ڈاڑھی مونچھیں کثیر تعداد میں تیار موجود ہیں۔ جس رنگ کا سوٹ ہو اس کے ساتھ میچ کرتی ڈاڑھی آڈر دے کر بنوائی جاسکتی ہے۔ کمپنی مذکور کو امید ہے کہ اونچی سوسائٹی کے معزز حضرات اس ڈیپارٹمنٹ کی خوب سرپرستی کریں گے۔

(۲) درمیانے طبقے کے لیے ــــــ اس ڈیپارٹمنٹ میں ایسے سیلون کھول دیئے گئے ہیں جہاں ڈاڑھی اور مونچھیں بڑھانے کی تربیت دی جاتی ہے ــــــ شروع شروع میں اسپرٹ گم سے ان کے چہروں پر بال چسپاں کیے جاتے ہیں۔ بعد میں جب بالوں کی عادت پڑ جائے تو اصلی بال اگائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو برس میں ایک دفعہ ڈاڑھی مونچھوں سے سبکدوش ہونا چاہیں، ایسی آرام گاہیں بنادی گئی ہیں جہاں وہ شیو کرنے کے بعد ایک ماہ تک آزاد رہ سکتے ہیں۔ یہاں رہنے کے بعد ان کو پھر سیلون بھیج دیا جائے گا جہاں از سرنو ان کی ڈاڑھی مونچھیں اگانے کا عمل شروع ہوگا۔ فیس بہت واجبی ہے یعنی فی کس پانسو روپے جو درمیانے طبقے کا ہر مرد ادا کرسکتا ہے۔

(۳) نچلے طبقے کے لیے ــــــ اس ڈیپارٹمنٹ میں ایسے ماہرین مقرر کر دیے گئے ہیں، جو پندرہ دن کے اندر اندر ایک فٹ بڑی ڈاڑھی اگا سکتے ہیں۔ جن کے بال اگتے ہی ان پر عمل جراحی کیا جاتا ہے اور مشین کے ذریعے سے بالوں کی جڑیں بودی جاتی ہیں۔ بالوں کو موٹا کرنے کے نسخے بھی تیار کر لیے گئے ہیں۔ چنانچہ نچلے طبقے کا ہر مرد اپنی مرضی کے مطابق اپنی ڈاڑھی کے بال موٹے اور کھردرے بنوا سکتا ہے۔ سر گھونٹنے کے لیے کمپنی مذکور نے امریکا سے ایک ایسی برقی مشین بنوائی ہے جو ایک منٹ میں ایک ہزار سر گھوٹ سکتی ہے اور دس ہزار لبیں کتر سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

ہمارا جھنڈا

''یہ جھنڈے سرنگوں کرنے کا وقت نہیں، یہ جھنڈے سربلند کرنے کا وقت ہے''۔ یہ ہیں وہ قلندرانہ الفاظ جو میں نے ایک راہ چلتے آدمی کے منہ سے سنے اور میں سوچ میں پڑ گیا۔

قائداعظم کے انتقال کی خبر شہر میں پھیلے ابھی کوئی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ غمزدہ سڑکوں کی اداس فضا میں اخبار بیچنے والوں کی چیخیں ابھی تک گونج رہی تھیں۔ ہر شخص کے چہرے پر حزن وملال طاری تھا۔

لوگ سڑکوں پر چل پھر رہے تھے جیسے کسی نظر نہ آنے والے جنازے کے پیچھے پیچھے جارہے ہیں۔ ہولے ہولے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چپکے چپکے قائداعظم کی ناگہانی موت کا تذکرہ ہورہا تھا۔ ہر شخص یہ مجسم سوال بنا ہوا تھا ''اب ہمارا کون ہے۔''

میں نے بھی سوچا۔ ''اب ہمارا کون ہے؟'' —— لیکن میرے کانوں میں اس راہ چلتے آدمی کے یہ الفاظ گونجے ''یہ جھنڈے سرنگوں کرنے کا وقت نہیں، یہ جھنڈے سربلند کرنے کا وقت ہے'' —— میں نے اپنی فرطِ غم سے جھکی ہوئی گردن سیدھی کی اور اس دھندلکے کے دوسرے پار دیکھنے کی کوشش شروع کی جو میرے دل ودماغ پر چھایا ہوا تھا لیکن دکانوں کی مکمل ہڑتال کی طرح دماغ میں بھی خیالات کی مکمل ہڑتال تھی۔

مرد رو رہے تھے۔ عورتیں بلک رہی تھیں۔ ہر آنکھ تر تھی۔ اب ہمارا کون ہے —— اب ہمارا کون ہے؟

ایک نے کہا'' چالیس دنوں تک یہ سوگ جاری رہے گا —— مگر اس آدمی نے کیا کہا تھا۔'' یہ

جھنڈے سرنگوں کرنے کا وقت نہیں یہ جھنڈے سر بلند کرنے کا وقت ہے۔"

میں نے سوچا نہیں نہیں، یہ جھنڈے سرنگوں کرنے کا وقت ہے۔ یہ آنسو بہانے اور ماتم کرنے کا وقت ہے۔ چالیس دن کیا چالیس سال تک سوگ منانے کا وقت ہے لیکن میں "امروز" کے دفتر میں تھا، رات بھر کام کرنے کے باوجود سارا عملہ موجود تھا۔ کسی نے مجھے سلام علیک نہ کہا کسی نے مجھ سے قائداعظم کی وفات پر تبادلہ خیالات نہ کیا۔ ہر ایک اپنے کام میں مصروف تھا۔ چہرے زرد تھے۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آوازیں تھرتھرا رہی تھیں۔ لیکن کام کیے جا رہے تھے۔ قلم کاغذ پر روانی کے ساتھ چل رہے تھے---- میں نے سوچا یہ ہے اصل سوگ یہ ہے اصل ماتم۔

دفتر سے نکلا تو میں نے اکثر لوگوں کے بازوؤں پر سیاہ ماتمی بلّے لگے دیکھے۔ یہ کالے چیتھڑے مجھے برے لگے---- میں نے سوچا یہ کیوں اپنے غم کا اشتہار دے رہے ہیں۔ یہ کیوں اپنے زرد چہروں، کانپتے ہاتھوں اور تھرتھراتی ہوئی آوازوں کے ساتھ وہ کام نہیں کر رہے جو انہیں کرنا چاہیے---- یہ کیوں اصلی سوگ نہیں منا رہے۔ انہوں نے کیوں اُس راہ چلتے آدمی کی آواز نہیں سنی "یہ جھنڈے سرنگوں کرنے کا وقت نہیں، یہ جھنڈے سر بلند کرنے کا وقت ہے۔"

میں ریڈیو پاکستان کے دفتر میں تھا۔ اتوار ہونے کے باوجود تمام اسٹاف موجود تھا۔ تانگوں کی ہڑتال تھی لیکن سیّد مظفر حسین خبریں پڑھنے والے، جو تانگوں سے معذور ہیں وہ بھی دفتر میں موجود تھے، لیکن اُن کے ہونٹوں پر وہ سدا کھیلنے والی مسکراہٹ نہیں تھی۔

حفیظ ہوشیارپوری تھے۔ اُنہوں نے رات دو بجے قائداعظم محمد علی جناح کی وفات پر اشعار فکر کیے تھے۔ کرسی پر بیٹھے تھے۔ گال اور بھی اندر کو پچک گئے تھے، قریب قریب خالی الذہن تھے مگر اِدھر اُدھر ٹیلی فون کرنے اور وصول کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اسٹیشن ڈائرکٹر فرید صاحب تھے۔ رنگ بالکل زرد، آنکھوں کے نیچے گہرے سانولے حلقے، کرسی پر بیٹھے تھے۔ ایک ہاتھ نہایت ہی مایوسی کے عالم میں کشادہ پیشانی کے ساتھ چسپاں کیے پروگرام کے بارے میں احکام دے رہے تھے۔

ہر ایک کا رنگ زرد تھا۔ مگر رُوح سرخ یاقوت تھی۔ چمکتی اور دہکتی ہوئی۔ میں نے سوچا، اِن کا کون ہے؟---- مجھے کوئی جواب نہ ملا---- مگر جواب یہی تھا کہ جو وہ کر رہے تھے۔

میں نے سوچا اِن کا کون ہے؟---- جواب ملا---- یہ خود اپنے "کون" ہیں اور ایک بار پھر میرے کانوں میں اُس راہ چلتے آدمی کے الفاظ گونج گئے۔ "یہ جھنڈے سرنگوں کرنے کا وقت نہیں، یہ جھنڈے

ند کرنے کا وقت ہے۔"

میرا دل بلیوں اُچھل گیا ــــ قائداعظم وفات پا گئے ہیں۔ ساری قوم ــــ وہ قوم جس میں وہ
ں مہاجرین جو دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں، شامل ہیں ــــ بین کر رہی ہے، اپنی چھاتی
رہی ہے، لیکن اِس ماتم میں مدافعت کی للکار بھی ہے، اس میں ضبط و نظم کی خاموش صدا بھی ہے جو
سوگوار مگر زندہ قوم میں ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے۔

قائداعظم وفات پا چکے ہیں۔ قائداعظم سپردِ خاک ہو چکے ہیں لیکن یہ مشیت ایزدی ہے۔ "اب
ا کون ہے؟" جیسے مشکل سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنے "کون" ہیں ــــ قائداعظم کو پیدا کرنے
وہ قادرِ مطلق ہے، جس نے ہمیں بھی پیدا کیا ہے۔

چالیس دن یا ایک دن کا سوگ بالکل فضول اور بے کار ہے ــــ میدانِ جنگ میں لہو اور لوہے کی
ئی لڑتے ہوئے، یا اپنی نوساختہ مملکت کی دیواریں چُنتے ہوئے ایک فرد کی (خواہ وہ ہمیں کتنا ہی عزیز
ں نہ ہو) بے وقت موت پر آنسو بہانا اپنے جھنڈے سرنگوں کرنا ہے۔

ہمارا جھنڈا قائداعظم محمد علی جناح نہیں تھا۔ وہ تو صرف ملتِ بیضا کا ایک رہنما تھا جس نے اس
نڈے کو بنایا اور سب سے پہلے لہرایا۔ ہمارا جھنڈا "پاکستان" ہے ــــ پاکستان بھی نہیں، اس لیے کہ
ی بہت محدود ہے۔ ہمارا جھنڈا "اسلام" ہے جس کا دوسرا مطلب راستی ہے۔ "یہ جھنڈے سرنگوں
رنے کا وقت نہیں، یہ جھنڈے سربلند کرنے کا وقت ہے۔"

☆☆☆☆☆

قتل، قاتل اور مقتول
ایک فریم میں

انسان ـــــــ انسان کا بیری!

جماعت ـــــــ جماعت کی دشمن!

قوم ـــــــ قوم سے نبرد آزما!

حکومت ـــــــ حکومت سے ستیزہ کار!

یہ ہے بیسویں صدی کی داستان ـــــــ اور یہی داستان پہلی صدی کی بھی تھی۔ دیگر اجناس کی طرح انسان کے گوشت پوست کی دکانیں پہلے بھی سجتی تھیں، آج بھی سجتی ہیں۔ گردنیں مروڑنے کے لیے پھانسیاں پہلے بھی نصب ہوتی تھیں، آج بھی نصب ہوتی ہیں۔ انسان کے خون کا چھڑکاؤ پہلے بھی ہوتا تھا، آج بھی ہوتا ہے۔ قتل و غارت گری، جبر و تشدد اور بہیمیت و بربریت کا جذبہ انسان میں اسی طرح موجود ہے جس طرح کہ پہلے تھا۔ اتنے پیغمبر، اتنے اوتار، اتنے رشی، اتنے اولیا آئے اور چلے گئے مگر انسان کی اصلاح نہ کر سکے۔ اس کے بنائے ہوئے قوانین بھی، اس کے جرائم و شدائد کا مواخذہ کرتے رہے، مگر ان کے محرک کو دور نہ کر سکے، لیکن انسانیت کچھ ایسی ڈھیٹ ہے کہ وہ بھی ابھی تک مایوس نہیں ہوئی، اور سوز و ساز، درد و داغ، جستجو و آرزو میں اسی طرح مگن ہے جس طرح وہ آج سے ہزارہا سال پہلے بھی تھی۔ یہی انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے اور یہی سب سے بڑا فرحیہ، لیکن اگر اس المیہ اور فرحیہ میں

کوئی غلط جنبش، کوئی بھونڈی حرکت دیکھنے میں آئے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اس ڈرامے میں کوئی ڈراپ انتظام کرنے والے کی غلطی سے گر پڑے تو بڑا صدمہ ہوتا ہے۔

سولہ اکتوبر کی شام کو جب مجھے لیاقت علی خاں کی موت کا علم ہوا تو میں جھنجھلا گیا۔ حیاتِ انسانی کا اختتامیہ سب کو معلوم ہے۔ لیاقت کی پرخطر زندگی میں قاتل کی گولی سے ہلاک ہونا یقیناً اُس کے لئے بھی کوئی تعجب انگیز بات نہیں تھی، مگر یہ ڈراپ جس طرح گرا، اور مجمع میں جو بھگدڑ مچی، وہ اس ڈرامے کے متوقع انجام کا حصہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے کوفت ہوئی اور میں نے اس کا اعلان بھی کیا۔

اس ٹریجڈی سے صرف راولپنڈی کا تعلق نہیں تھا، اس خونیں حادثے سے صرف وہ اشخاص متعلق نہیں تھے جو ڈائس کے آس پاس بیٹھے تھے۔ اس المیے سے پاکستان کا ہر فرد و بشر متعلق تھا۔ لاہور میں اس سانحہ شدید کی اطلاع سب سے پہلے ایک انگریز کو پہنچتی ہے۔ وہ تصدیق کی خاطر اے پی پی کے دفتر میں ٹیلی فون کرتا ہے۔ وہاں سے کچھ پتہ نہیں چلتا تو ریڈیو پاکستان لاہور والوں سے پوچھتا ہے۔ وہاں سے بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا تو خاموش ہو جاتا ہے۔

اے پی پی کا ٹیلی پرنٹر غالباً پونے چھے کے قریب حرکت میں آتا ہے، اور یہ مختصر ٹائپ کرتا ہے کہ راولپنڈی کے جلسہ عام میں کسی نے پاکستان کے وزیراعظم خان لیاقت علی خاں پر دو فائر کیے ـــــ مگر فوری ہدایت دیتا ہے کہ یہ خبر منسوخ سمجھی جائے۔

سات بجے تک وہ لوگ جن تک خاں لیاقت علی خاں کے زخمی ہونے کی خبر، اے۔ پی۔ پی کے اس منسوخ شدہ اعلان کے ذریعے سے پہنچ چکی تھی، لاہور کی معتبر ہستیوں سے اس کی تصدیق یا تردید کے لیے تڑپتے رہتے ہیں، مگر ان کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اچانک سات بج کر کچھ منٹ پر ریڈیو پاکستان لاہور یہ منحوس خبر نشر کرتا ہے کہ راول پنڈی کے جلسۂ عام میں جونہی خاں لیاقت علی خاں تقریر کرنے اٹھے، ہجوم میں سے ایک شخص سید اکبر نے ان پر دو فائر کیے۔ گولیاں دل کے قریب لگیں۔ ہسپتال میں اپریشن کیا گیا جو ناکام ثابت ہوا اور وہ زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ ساتھ ہی یہ بتایا کہ ہجوم نے مشتعل ہو کر قاتل کو وہیں ٹھکانے لگا دیا۔

خاں لیاقت علی خان کی موت سے جو صدمہ پاکستان کو پہنچا ہے، وہ ظاہر ہے۔ اس سے جو نقصان ہوا، اس کا اندازہ بھی آدمی لگا سکتا ہے۔ ان کے قتل سے جو نقصان ہوا ہے، اس پر کوئی غور ہی نہیں کر رہا تھا، اور نہ کوئی یہ سوچ رہا تھا کہ پہلی صفوں میں قاتل داخل کیسے ہو گیا، جو اتنا کامیاب نشانہ لگا سکا ـــــ

مختلف ذرائع سے جو مختلف خبریں ہم تک پہنچیں ان کا اختصار بنظر غور ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ قاتل نے دو گولیاں چلائیں، بہت قریب سے۔

۲۔ حملہ آور کے فائر کرنے کے فوراً بعد قریب کھڑے پولیس کے سپاہیوں نے ہوا میں گولیاں چلائیں اور عظیم الشان مجمع میں جو ابھی تک حادثے سے بے خبر تھا، سخت ہیجان پھیل گیا تاہم مجمع پر جلد قابو پا لیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر راول پنڈی نے شہر اور چھاؤنی میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔

۳۔ خان لیاقت علی کو فوراً فوجی ہسپتال پہنچایا گیا جہاں ان کے جسم میں خون داخل کیا گیا۔

۴۔ خان لیاقت علی خاں گولیاں لگتے ہی بے ہوش ہو گئے تھے۔

یہ اس حادثے کی پہلی خبریں تھیں، جو پاکستان والوں کو ملیں ——— ان سے لوگ مختلف نتائج برآمد کرتے رہے ——— میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پولیس نے ہوا میں کیوں گولیاں چلائیں۔ یوں تو پنجاب پولیس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایسے موقع پر ہوا کے داخلے پر بھی پابندیاں عائد کر دیتی ہے، مگر اس وقت جبکہ قاتل اس کی نگاہوں کے سامنے تھا، جس کی گرفتاری یقینی تھی، اس نے پندرہ بیس ہزار کے مجمع کو ہوا میں گولیاں چلا کر کیوں منتشر کیا، اور وہ بھی اس بری طرح کہ اسے اس پر قابو پانے کے لیے اپنی طاقت الگ صرف کرنی پڑی۔

کہا گیا تھا کہ پولیس کے سپاہی قریب کھڑے تھے، اور انہیں یقیناً ایسے موقع پر بہت قریب موجود ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہوا میں گولیاں چلا سکے، لیکن وہ قاتل کو نہ بچا سکے جو ان کے پاس ہی کہیں ہونا چاہیے تھا۔

ہجوم میں افراتفری پھیل گئی تھی، اتنی کہ پولیس قاتل کو قتل ہونے سے نہ بچا سکی، اس کا یہ مطلب تھا کہ مجروح خان لیاقت علی خان کو فوری طبی امداد پہنچانے کا انتظام بہت مشکل ہو گیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کو ہسپتال پہنچایا گیا تو وہاں ان کے جسم میں خون داخل کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

زخمی حالت میں وہ کتنی دیر تک وہاں پڑے رہے اس کے متعلق جہاں تک مجھے علم ہے، ابھی تک کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ کتنے عرصے میں ان کو ہسپتال پہنچانے میں کامیابی ہوئی، اس کے بارے میں بھی قطعی معلومات بہم نہیں پہنچائی گئیں۔

اگر خان لیاقت علی خاں مرحوم پاکستان کا وزیر اعظم تھا، جس کے اشارے پر ہر پاکستانی اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار تھا تو وہ یہ جاننے کا حق ضرور رکھتا ہے کہ ان کی جان کیسے اور کیونکر ہلاک

ہوئی۔اس کی حفاظت کے لیے کیا اقدامات کیے گئے تھے،اگر کیے گئے تھے تو وہ کیوں ناکام ثابت ہوئے۔

۱۷۔اکتوبر کی شام تک جو مختلف اطلاعات ہم تک پہنچیں،ان کا لب لباب یہ تھا:

۱۔ وزیر اعظم پاکستان کا قاتل افغانستان کا باشندہ ہے اور قبیلہ جدران سے تعلق رکھتا ہے۔اس کی جیب سے دو ہزار روپے کے نوٹ برآمد ہوئے ہیں (ایسوسی ایٹڈ پریس)

۲۔ وزیر اعظم پاکستان کا قاتل شناخت کر لیا گیا ہے اس کا نام سید اکبر ولد ببرک ہے۔افغانستان کا باشندہ ہے،ساپر خیل ذات سے ہے۔اس نے کچھ عرصہ پہلے ضلع ہزارہ میں اقامت اختیار کی تھی۔اس کے قبضے سے دو ہزار چالیس روپے برآمد ہوئے ہیں،اور ایبٹ آباد میں اس کے مکان سے دس ہزار روپے۔اتنی بڑی رقم کی برآمدگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کو غالباً اسی مقصد سے خریدا گیا تھا۔اُس کے قبضے سے جو کاغذات برآمد ہوئے ہیں ان میں ایک نقشہ بھی ہے جس میں شمال مغربی پاکستان کے اہم مقامات دکھائے گئے ہیں۔اس کے علاوہ دیگر کاغذات فارسی میں ہیں جن کی تحقیق ہو رہی ہے۔

۳۔ افغان قونصل مقیم پشاور سردار محمد قیوم خاں جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں،اس واقعہ سے پانچ گھنٹے قبل پُراسرار طریقے سے پشاور سے غائب ہو گئے تھے۔بعد میں اس امر کی تحقیق ہو گئی کہ وہ درہ خیبر کے راستے دو بجے دوپہر افغان سرحد میں داخل ہو گئے اور سہ پہر تک افغان پاسپورٹ آفس میں ٹھہرے رہے،پھر شام کو کابل روانہ ہو گئے۔

۴۔ خان لیاقت علی خاں کے قتل کے سلسلے میں پولیس کو ایک دس سالہ بچے کی تلاش ہے جو قاتل کا ملازم تھا اور اس کے ساتھ گرینڈ ہوٹل راولپنڈی کے کمرہ ۳ میں دو تین دن تک رہا۔

۵۔ حکومت سرحد نے حکومت پنجاب کو قاتل؛سید اکبر کے متعلق اپنے شکوک سے آگاہ کر دیا تھا۔

اس سے حادثہ قتل کی اصلیت جاننے والوں کی کیا تشفی ہو سکتی تھی۔وہ بدستور پیاسے رہے اور ان کی دماغی الجھنوں میں اضافہ ہوتا گیا،یہ کچھ عجیب قسم کا استخراج تھا کہ چونکہ قاتل کے پاس سے دو ہزار چالیس اور اس کے گھر سے دس ہزار روپے برآمد ہوئے اس لیے گمان غالب ہے کہ اُسے اس کام کے لیے خریدا گیا تھا،میں قتل اور قاتل کی نفسیات کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا تھا،لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُسے اسی مقصد کے لیے خریدا گیا تھا تو وہ اپنے حق الخدمت کا کچھ حصہ جیب میں ڈال کر اس جگہ کیوں آیا جہاں وہ اپنا

کام سرانجام دینا چاہتا تھا اور جہاں سے اس کو اپنے بچ نکلنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ اس سوال کے بطن سے دو چھوٹے چھوٹے سوال اور پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ ہوسکتا ہے قاتل کو اپنے بچ نکلنے کی امید ہو

۲۔ اگر ایسا تھا تو کیا اس کے بچانے کے لیے اور آدمی موجود تھے۔

ان کو اگر تھوڑی دیر کے لیے پیشِ نظر رکھا جائے تو قتل کا نقشہ بالکل نئی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ ہو نہ ہو، قاتل کے آس پاس کئی آدمی تھے جونہی اُس نے گولی چلائی، ان آدمیوں نے اُس کا صفایا کر دیا۔ مگر پھر یہ چیز ذہن میں آتی ہے کہ جس فرد نے یا جس جماعت نے قاتل کو اس خونیں کام کے لیے اکسایا تھا اس نے مزید آدمیوں کو اس راز میں کیوں شامل کیا۔ کیا یہ اُس کی حماقت نہیں تھی؟

پشاور سے افغان قونصل کی گم شدگی کو پراسرار کس بنا پر بنایا گیا اور اس کو حادثۂ قتل سے کس طرح منسوب کیا گیا۔ کوئی بھی قونصل جس وقت چاہے اپنے ملک کو روانہ ہوسکتا ہے۔ اس کی نقل و حرکت پر کوئی کڑی پابندی عاید نہیں ہوسکتی۔ اگر افغانستان کا اس حادثے میں ہاتھ تھا تو سردار محمد قیوم خان کو پشاور چھوڑنے کی عجلت کیا تھی۔ اُس کی جان کی محافظت کی ذمہ دار پاکستان کی حکومت تھی —— ایسے سوالات جیسا کہ ظاہر ہے صرف اُسی صورت میں پیدا ہوتے ہیں جب کہ انسان کو کسی چیز کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہی نہ ہو۔

پھر یہ خبر کہ حکومت سرحد نے حکومت پنجاب کو قاتل کے متعلق اپنے شکوک سے غالباً ایک دن پہلے مطلع کر دیا تھا، بہت ہی اہم ہے۔ اگر حکومت پنجاب کو یہ اطلاع مل گئی تھی تو اس نے اس ضمن میں کیا کیا۔ پنجاب پولیس جو معمولی سے شبہ پر مچھروں اور مکھیوں کو بھی گرفتار کر لیا کرتی ہے اتنی اہم رپورٹ ملنے پر بھی خاموش کیوں رہی۔ اس نے قاتل سید اکبر کی جملہ نقل و حرکت پہ نگرانی کیوں نہ رکھی؟

پولیس کو قاتل کے دس سالہ ملازم کی تلاش ہے —— یہ خبر بڑی مضحکہ خیز تھی۔ تلاش کا مطلب کیا تھا۔ پولیس کو تو چٹکی بجانے میں قاتل کے معمولی سے معمولی جان پہچان رکھنے والے کو بھی گرفتار کر لینا چاہیے تھا۔

۲۰۔ اکتوبر کے ''آفاق'' میں عینی شاہد مسٹر عرفانی کے قلم سے ایک طویل مضمون چھپا جس میں یہ دو باتیں قابلِ غور تھیں:

(۱) حملہ آور مسٹر عرفانی سے چھ گز کے فاصلے پر اُن کے بائیں کندھے کے برابر ترچھا بیٹھا تھا۔ پولیس نے ہوا میں فائر کرنے شروع کردیے۔ یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع اور ایسے یکلخت طور پر ہوا کہ کسی کے بھی حواس بجا نہ رہے۔

(۲) خان لیاقت علی خاں کے گرنے کے بعد جو شخص، سب سے پہلے لپک کر اُن تک پہنچا، وہ پنڈی کا ڈپٹی کمشنر ہارڈی تھا۔

راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ہارڈی نے، جو لپک کر خان لیاقت علی خاں کی طرف پہنچے، کیا اُن کا فرض نہیں تھا کہ وہ قاتل کی طرف بھی دوڑتے، جو اُن سے صرف چھ گز کے فاصلے پر تھا۔ خان لیاقت علی خاں کو دیکھنے والے اور حضرات بھی موجود تھے، لیکن قاتل کی حفاظت کے لیے تو مسٹر ہارڈی کو یقیناً فکر کرنا چاہیے تھی۔

پولیس نے ہوا میں فائر کئے۔ کیوں؟ کس کے حکم سے؟

ان سوالوں کا جواب ہمیں ابھی تک نہیں ملا اور معلوم نہیں کب تک نہیں ملے گا۔

۲۱۔ اکتوبر ۵۱ء ''آفاق'' میں مسٹر عرفانی نے اس حادثے کی مزید تفصیل لکھی جس میں ذیل کی باتیں اہم تھیں:

(۱) پستول عام اور معمولی ساخت کا نہیں تھا۔

(۲) قاتل کو ہاتھ بڑھاتے، پستول چلاتے کسی نے نہ پکڑا۔

(۳) قاتل کے جسم میں کئی گولیاں لگی ہوئی تھیں۔

(۴) ڈائس کے نیچے ایک شخص ریوالور سمیت پکڑا گیا۔

(۵) ڈپٹی کمشنر مسٹر ہارڈی کو ٹیلی فون پر کسی نے ہدایت دی تھی کہ اسٹیج پر سوائے لیاقت کے اور کوئی شخص نہ ہو۔

(۶) قاتل نے ہزارہ سے چلتے ہوئے پولیس کو چٹ لکھ کر بھیجی ''میں پنڈی جا رہا ہوں۔ گرینڈ ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ پولیس سے کہہ دیا جائے کہ وہ مجھے وہاں تنگ نہ کرے جس طرح اس نے مجھے مری کے قیام کے دوران میں تنگ کیا تھا''۔

(۷) قاتل نے جس پستول سے خان لیاقت علی خاں کو ہلاک کیا تھا وہ پولیس یا سی آئی ڈی کو نہیں مل سکا۔

یہ باتیں میرے یا کسی اور کے تبصرے کی محتاج نہیں۔ اس لیے کہ ان پر کوئی چھلکا نہیں جسے اتارا جائے۔ ہزارہ میں پولیس کو معلوم تھا کہ ان کا ''آدمی'' کہاں جا رہا ہے اور کہاں ٹھہرے گا۔ اگر ان کو اس کا صحیح علم نہ بھی ہوتا تو بھی ان کو اتنا پتا ضرور تھا کہ وہ ہزارہ سے جا رہا ہے، اور جب وہ جا رہا تھا تو ہزارہ کی خفیہ پولیس سائے کی طرح کیوں اس کے پیچھے نہ رہی۔ معمولی سے معمولی سیاسی کارکن کی نقل وحرکت بھانپ بھانپ کر اور ماپ ماپ کر وہ اس پر عرصہء حیات تنگ کر دیتی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اتنی بڑی ہستی کا ہونے والا قاتل جس پر ایک عرصے سے شبہ تھا، بڑے آرام سے ہزارہ سے نکلتا ہے، پولیس کو اپنی منزل اور اپنے جائے قیام کا بالکل صحیح پتا دیتا ہے اور چھے گز کے فاصلے پر بیٹھ کر ایسا نشانہ لگاتا ہے کہ پہلی گولی ہی اپنا کام کر جاتی ہے۔

۱۳۔ اکتوبر کو وہ راولپنڈی آتا ہے، اور ۱۶ کی صبح تک گرینڈ ہوٹل رہا۔ اس دوران میں اس کی شخصیت پُراسرار رہی۔ اس کی ہر بات نرالی تھی۔

ہوٹل میں اس سے دو تین آدمی ملنے آتے تھے، ان کے متعلق قاتل نے کہا تھا، سی آئی ڈی کے ہیں۔ ہوٹل رجسٹر میں اس نے اپنے نام کے ساتھ ''سی آئی ڈی پنشنر'' لکھا تھا ——— سمجھ میں نہیں آتا کہ ان تمام شک افزا باتوں کے باوجود کسی نے بھی اس کو زیرِ نگرانی نہ رکھا اور اگر رکھا تو بڑی غفلت سے کام لیا۔ قاتل کو قتل کر دیا گیا۔ مگر حیرت ہے کہ وہ پستول کہاں گیا، جس نے خان لیاقت علی خاں کو شہید کیا۔

انیس اکتوبر کو میاں ممتاز دولتانہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب نے ایک تقریر کے دوران میں کہا ''مجھے اس احساس سے بے حد ندامت ہے کہ یہ حادثہ فاجعہ میرے صوبے میں ہوا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس میں حکومت یا پولیس کے حفاظتی انتظامات میں کوئی کوتاہی نہ تھی''

خدا کرے ایسا ہی ہو، مگر جو اطلاعات اب تک ہمیں پہنچی ہیں۔ اُس سے اس بارے میں ہماری کامل تسلی وتشفی نہیں ہوتی۔ قاتل کے جسم سے کئی گولیاں برآمد ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں حکومت اور پولیس نے کیا تحقیق کی ہے۔

سید اکبر ہمارے پاکستان کے محبوب وزیرِ اعظم اور رہ نما کا قاتل تھا۔ وہ گردن زدنی تھا، وہ ایک ایسے گھناؤنے فعل کا مرتکب ہوا تھا، جس کی سزا اس کو ملنا چاہیے تھی۔ مگر اس کو ہجوم کے غیظ وغضب سے محفوظ رکھنا چاہیے تھا۔ ہم کچھ بھی کہیں اس نقصان کے پیشِ نظر جو ہماری مملکت کو ہوا ہے۔ ہم جذبات میں آ کر لاکھ دلائل پیش کریں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۱۶ اکتوبر کی سہ پہر کو دو انسان قتل ہوئے۔ ایک خان

لیاقت علی خاں وزیراعظم پاکستان اور ایک ہزارہ کا باشندہ مسمی سید اکبر۔

خان لیاقت علی خاں مرحوم ومغفور کا قاتل سید اکبر تھا۔اس کے متعلق تو پولیس اپنا فیصلہ دے چکی ہے لیکن سید اکبر کا قاتل کون تھا؟ وہ جذبہ جو اس کے خلاف ہجوم کے دل میں پیدا ہو گیا تھا! اس کے ساتھی جو قتل کی سازش پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے——یا پولیس؟ کیونکہ حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ قاتل کے جسم سے تین گولیاں نکلی ہیں۔اب بیان کیا گیا ہے کہ وہ پولیس کے پستولوں سے نکلی تھیں۔اس ضمن میں پولیس کے ایک ذمہ دار افسر کا نام بھی لیا جا رہا ہے لیکن میں فی الحال اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔میاں دولتانہ کو چاہیے کہ وہ فوراً عوام کو تمام واقعات سے آگاہ کریں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی تقریر میں ہماری پولیس کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں اپنے کامل اطمینان کا اظہار کر چکے ہیں، لیکن اگر واقعات اس کے برعکس ہیں تو انہیں اپنے فرض میں کوئی کوتاہی نہ کرنی چاہیے۔

جس طرح خان لیاقت علی خان کے قتل کا صحیح سراغ لگانا ہماری پولیس اور ہماری حکومت کا فرض ہے، اسی طرح قاتل سید اکبر کے قتل کا صحیح سراغ لگانا بھی ان دونوں کے فرض میں داخل ہے، سیاسیات کی جملہ الجھنوں سے قطع نظر اگر صرف قانون کی نگاہوں میں، اس میدان میں جسے میزانِ عمل کہا جاتا ہے، اس کسوٹی پر جسے انسانیت کہا جاتا ہے، ہم سولہ اکتوبر کی سہ پہر کے حادثے کو پرکھیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سید اکبر اور اس کے قاتلوں کے فعل میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔دونوں قاتل ہیں اور اس سزا کے مستوجب جو تعزیراتِ پاکستان میں ایسے لوگوں کے لیے مرقوم ہیں۔ان کے خونیں راستے جدا تھے، لیکن وہ ملتے ایک ہی چوراہے سے تھے، جس میں انسانی خون سے لبریز حوض ہے۔

سید اکبر نے خان لیاقت علی خاں کو قتل کر کے پاکستان پر ایک شدید ضرب لگائی اور سید اکبر کو قتل کر کے ایک یا زائد آدمیوں نے اس کو اور اس کی شاخ کو بھی کاٹ دیا، جس کا سہارا لے کر اس نے یہ ضرب لگائی تھی۔

☆☆☆☆☆

مجذوب کی بڑ

(پندرہ جنوری کے اخباروں کی روشنی میں ایک سوریئلی تصویر)

سونے کی دوا ایک چمچ ـــــ ایک چھٹانک پانی ـــــ بس بس!

چپ کراؤ ـــــ (۔و۔)

چھے بج گئے ـــــ چائے! ـــــ چائے! ـــــ نوکر نہیں آیا ابھی تک؟ ـــــ کیوں نہیں آیا ـــــ سینما چلا گیا تھا ـــــ یوں چلا گیا تھا؟ ـــــ کوئی حرج نہیں۔ کبھی کبھی نوکروں کو سینما ضرور دیکھنا چاہیے۔

آفاق، زمیندار، نوائے وقت، امروز، احسان، غائب ہے ـــــ معلوم نہیں نسیم بانو کا کیا حال ہے ـــــ

وہیں ہندوستان میں رہتا تو ٹھیک تھا ـــــ بجلی کا بل ـــــ دو مہینوں کا اکٹھا بل ـــــ رعایت غائب۔

السٹریڈ ویکلی ـــــ بیالیس ہزار یا چالیس؟ ـــــ پندرہ ہی سہی ـــــ کشنری ـــــ ادھار اینٹریز ـــــ اسکول کی فیس ـــــ بارہ روپے ماہوار ـــــ چوبیس ـــــ ہر مہینے۔

اُون۔ گھی۔ آٹا۔ کوئلہ ـــــ سات سالہ بچے کا ـــــ اکاون روپے۔ بھتیجی کی شادی۔ ایک سو ایک روپے۔ سات روپے فی کالم۔ سوا تین روپے۔ تین سو پچیس بٹا سات۔ سات چوکا اٹھائیس حاصل آئے چار۔ چار پانچ، پینتالیس۔ سات چھکا، بیالیس ـــــ باقی بچے، تین ـــــ تین میں نہ تیرہ

میں مُٹھی کی گرہ میں۔

شلواریں؟ ---- کُرتے؟ ---- سب صافیاں، سب صافیاں ---- سولہ ہزار کا نقصان ---- کفن، کفن، کفن! ---- جیب کفن!

انسٹرئیڈ ویکلی ---- بیالیس ہزار یا چالیس ہزار؟

امریکی بحری جہاز۔ جان ایچ ---- کیساڈی ---- امریکی بحریہ کے ہوائی جہاز دنیا میں کسی جگہ بھی سات سو ستر میل کے فاصلے پر ایٹم بم گرا کر واپس آ سکتے ہیں۔

ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد ---- احمد ندیم قاسمی۔ پانچ بہنوں کے ایک بھیّا۔ ترقی پسند۔ رجعت پسند۔ سنکی۔ لطیفہ گو۔

چائے! ---- چائے۔

سینما چلی گئی ہے ---- کوئی حرج نہیں کبھی کبھی چائے کو سینما ضرور چلی جانا چاہیے۔

بارہ انڈے۔ دو ڈبل روٹیاں ---- جام ---- ساڑھے چھے روپے ---- سگرٹ ادھار!

پیرس، پندرہ جنوری ---- اتحادی قوموں کی تولیتی کمیٹی نے اقلیتی علاقوں پر حکمران ممالک کو ہدایت کی ہے کہ وہ کوڑے کی سزا دینا ترک کر دیں۔ کسی ملک نے تجویز کی مخالفت نہیں کی۔

عوام اپنے مشورے بھیجیں ---- لاہور ۱۵ جنوری، حکومت پاکستان ایک مسوّدہ قانون پر غور کر رہی ہے، جو کوڑے لگانے کے ایکٹ بابت ۱۹۰۹ء میں ترمیم کرنے سے متعلق ہے ---- اس مسوّدے میں کوڑے لگانے کی سزا کی توسیع کر کے ضابطۂ تعزیرات پاکستان کی رو سے کئی ایک مزید جرائم پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کون؟ ---- ڈاکٹر کا نوکر؟ ---- بھی؟ ---- کہہ دو گھر پر نہیں ہے ---- ہسٹیریا، ہسٹیریا۔

اخبار نویس کی شادی ---- اخبار نویس کی شادی؟ ---- عمل میں آئی؟ ---- برات اور ولیمہ میں لاہور کے اکثر بڑے بڑے اخبار نویسوں اور ممتاز شہریوں نے شرکت کی ---- اخبار نویس۔ سات روپے فی کالم ----

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ نکاح اور شادی کی تمام رسوم شریعت اسلامیہ کے تقاضوں کے عین مطابق ادا ہوئیں ---- ہماری دعا ہے کہ خدا دولہا اور دلھن کو ہمیشہ خوش رکھے!

ایک سوبیس روپے میں دومن چینی بیچنے والا بوڑھا ڈپو ہولڈر گرفتار کرلیا گیا۔ یہی چینی کے ڈپو ہولڈر حکومت کا آٹا بلیک مارکیٹ میں بیچتے ہیں ——— چٹی ڈاڑھی آٹا خراب۔

چائے! ——— چائے!

کیا کہا چینی نہیں ہے ——— لوہے چینی ڈالو۔ تانبہ چینی ڈالو۔ کیمونسٹ چینی ڈالو ——— ابراہیم جلیس ڈالو ———

ڈپو ہولڈر کی گرفتاری پر ہجوم نے اظہارِ طمانیت کیا۔ کچھ دل جلوں نے "ہائے آٹا۔ ہائے آٹا" کہتے ہوئے سیاپا کیا ——— ہائے آٹا۔ ہائے آٹا ——— اُلو باٹا!

ڈھاکہ۔ پندرہ جنوری۔ چوتھے درجے کے تین ہزار سرکاری ملازمین نے حکومت مشرقی بنگال کو اپنی طرفی کے نوٹس کا جواب دے دیا ہے ——— اپنی احتیاج اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھوکے ہونے کے بلبے لگانے کا پورا حق حاصل ہے۔

بلبے کھاؤ۔ بلیاں کھاؤ۔ مرغابیاں کھاؤ۔ تو ندیں بڑھاؤ ——— پولس کو سڑک کے کنارے نوزائیدہ سلطنت ملتی رہے گی۔

لاہور ۱۵ جنوری ——— زیر دفعہ ۳۲۹ کارپوریشن ایکٹ مسمات رسولاں۔ ثریا۔ سرداراں اور خورشید وغیرہ کو پچاس پچاس روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ عورتیں بازار شیخو پوریاں، بازار سبز پیر وغیرہ میں کوٹھی خانوں میں بدکاری کراتی تھیں۔

عورت کو مردوں پر فضیلت حاصل ہے۔ لاہور۔ پندرہ جنوری

حکیم سید ظفر عسکری سکرٹری شعبہ علمیہ پنجاب، پراونشل طبی کانفرنس نے اعلان کیا ہے کہ عنقریب ایک عظیم الشان مباحثہ ہورہا ہے۔ موضوع ——— عورت کو مرد پر فضیلت حاصل ہے۔

چائے ——— چائے ——— اصفہانی چائے ——— دو روپے دو آنے پیکٹ! ——— ادھار۔ ادھار۔

اُسٹر ئیڈ ویکلی ——— بیالیس ہزار یا چالیس ہزار روپے! ——— کلبوز ڈاؤن ——— کلبوزا کروس!

لاہور۔ پندرہ جنوری ——— پنڈوریاں (ضلع شیخوپورہ) رینالہ خورد، پنڈی گھیپ اور دوسرے بہت سے مقامات میں بورڈ اساتذہ کے مطالبات کی کامیابی کے لئے دعائیں کی گئیں۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمیں آباد ———

اُنسٹر یئیڈ ویکلی ـــــ بس اُنسٹر یئیڈ ویکلی۔

اُون، آٹا،نمک، چاول، دھان، گندم، ہائے گندم ہائے آٹا۔

شیخوپورہ میں گندم کی قیمتوں میں اضافہ ـــــ سولہ روپے فی من کے حساب سے فروخت ہو رہا ہے۔

کوریا کی گفت وشنید میں تو تو میں میں تک نوبت پہنچ گئی۔

کورذوق۔کورذوق ـــــ نوبت ایٹم بم تک پہنچنی چاہیے تھی۔

اسلامی انقلاب لانے کے لئے بہترین لٹریچر مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ سے طلب کریں۔

تاجروں کو معقول کمیشن اسلامی کمیشن ـــــ اسلامی انقلاب ـــــ نمونہ مفت۔

سلمبٹ ۱۵ جنوری۔علاقہ باری گرام اور دولھاچرا تک جنگلی ہاتھی پہنچ چکے ہیں۔مقامی شہریوں میں اس قدر خوف و ہراس پھیل گیا ہے کہ وہ اپنے مکانوں کو چھوڑ چھوڑ کر دوسری آبادیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔

مہاجر ـــــ شرنارتھی ـــــ اور شرنارتھی ـــــ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اسی کا ناؤں۔

قتل کے مقدمے کا فیصلہ ـــــ اس فیصلے کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ جب فاضل جج نے ملزم کو سزائے موت کا فیصلہ سنایا تو اس نے ''بُلبی'' ماری ـــــ فاضل جج نے اپنے فیصلے میں بھی اس ''بلبی'' کا ذکر کیا ہے ـــــ

موت زندہ باد! ـــــ قبرستان پائندہ باد!

نئی دہلی۔پندرہ جنوری ـــــ پولنگ بوتھ جھنڈے والا کے قریب ایک امیدوار ووٹروں کو کچھ روپے دے رہا تھا۔ایک فوٹوگرافر نے اس کی تصویریں لینی شروع کردیں۔اس پر فوٹوگرافر پر پتھر پھینکے گئے۔

لذتِ سنگ

سر کھجاتا ہوں جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے ـــــ لذتِ سنگ باندازہ تقریر نہیں

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد ـــــ سنگ اٹھایا تھا کی سر یاد آیا

سر محمد اقبال۔حکیم الامت

شیخ غلام احمد۔طاقت کی مشہور دوائی والا۔محلہ پیر گیلانیاں۔

پیر ننگے شاہ ـــــ تنگِ پیری ہے جوانی میری۔

☆☆☆☆☆

شاعرِ کشمیر ـــــ مہجور کاشمیری

تین ہاتو

میں کشمیری ہوں، ـــــ ایک ہاتو۔ صرف اس لحاظ سے کہ میرے آباؤ اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں تشریف لائے (خدا معلوم کب؟) یہ عجیب بات ہے کہ میں نے آج تک کشمیر نہیں دیکھا۔ صرف بانہاں تک گیا ہوں۔ لیکن میرے والد صاحب تو وہاں تک بھی نہ پہنچ سکے تھے۔ یہ اور بھی عجیب بات ہے کہ میرے والد صاحب کو کشمیریوں سے عشق تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کبھی کبھی اس عشق کے زیرِ اثر کسی ''ہاتو''، یعنی کشمیری مزدور کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے آیا کرتے تھے اور اسے بیٹھک میں بٹھا کر بڑے فخر سے کہا کرتے تھے۔ ''میں بھی کاشر ہوں۔''

لڑکپن میں والد صاحب کی یہ بچگانہ جذباتی حرکت مجھے بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے بھی کشمیر اور کشمیریوں سے وہی والہانہ غیبی محبت اور الفت ہے جو والد صاحب مرحوم کو تھی۔

اسی جذبے کے زیرِ اثر میں اس کتابچے کے متعلق کچھ کہہ رہا ہوں۔ حالانکہ شاعری سے مجھے کوئی شغف نہیں۔

عرصہ ہوا، والد مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ ایک شاعر غنی ہوا ہے۔ بہت بڑا شاعر ـــــ فارسی کا شاعر، جس کی شاعری کی دھوم ایران میں بھی مچی تھی۔ انھوں نے بتایا تھا کہ ایران کا ایک شاعر (شاید پیدل چل کر) کشمیر گیا اور غنی کے گھر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہے لیکن پھر بھی اس نے دستک

دی۔ اندر سے ایک خستہ حال آدمی نکلا۔ ایرانی شاعر نے اس سے کہا کہ وہ ایران سے غنی کاشمیری سے ملنے آیا ہے۔ خستہ حال آدمی نے ایرانی شاعر سے کہا ''آپ تشریف رکھیے، میں انہیں بلا کر لاتا ہوں۔''

وہ اپنے مہمان کی مہمان نوازی کے لیے کچھ بندوبست کرنے چلا گیا۔

یہ خستہ حال آدمی غنی کاشمیری تھا، جس کی فارسی شاعری کی دھوم ایران تک پہنچ چکی تھی۔ وہ چلا گیا اور ایرانی شاعر وہاں کمرے میں بیٹھ گیا ——— دیر تک بیٹھا رہا، مگر غنی کاشمیری نہ آیا۔ تنگ آ کر اس نے اپنی بیاض فرش پر رکھ دی جس میں اس کا ایک شعر نامکمل تھا۔ اس نے مصرع ثانی لکھا تھا لیکن مصرع اولیٰ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مصرع ثانی یہ تھا:

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

بیاض چھوڑ کر ایرانی شاعر چلا گیا کہ وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو غنی کاشمیری آیا۔ اس نے دیکھا کہ بیاض کھلی پڑی ہے اور اس کے کھلے ہوئے صفحے پر ایک نامکمل شعر درج ہے جس کا مصرع ثانی یہ ہے:

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

غنی کاشمیری نے فوراً قلم اٹھایا اور مصرع اُولیٰ لکھ دیا:

کدام سوختہ جاں دست زد بدامانت

یہ میں نے سب کچھ تمہیداً عرض کیا ہے، اصل میں مجھے اپنی اس عقیدت، محبت اور عشق کا اظہار کرنا تھا جو مجھے کشمیر اور کشمیریوں سے ہے۔ کشمیر میں نے نہیں دیکھا، لیکن کشمیری دیکھے ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ میں نے مہجورؔ نہیں دیکھا، جسے میرا عزیز دوست نصیر نہ صرف دیکھ چکا ہے بلکہ اس سے مل چکا ہے۔

مجھے یہ بھی افسوس ہے کہ میں کشمیری زبان سمجھ سکتا ہوں، نہ بول سکتا ہوں۔ لیکن نصیر یہ زبان سمجھتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے اور چونکہ وہ ذوقِ سلیم رکھتا ہے اس لیے اس نے مہجورؔ کے ترقی پسند خیالات کا ترجمہ کیا اور بڑی خوبصورت نثر میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

نصیر بھی کشمیری ہے، حالانکہ اس کے خدوخال سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تبت کا رہنے والا ہے۔ اس کا رنگ گہرا سانولا ہے جو کشمیریوں کا نہیں ہوتا، لیکن وہ کشمیری ہے، اس کا دل کشمیری ہے ——— اس کے گُردے کشمیری ہیں ——— وہ مہجور نہیں ہے، لیکن اس کا عاشق ہے، اس کا پرستار ہے۔

وہ جب مہجور کی باتیں کرتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ اس فضا کی باتیں کر رہا ہے جو کشمیر ہے، جس میں میرے آباؤ اجداد کسی زمانے میں رہا کرتے تھے اور وہاں کے حکمران کے جور و ستم سے تنگ آ کر ہجرت کر آئے تھے۔

مجھے ندامت ہے کہ میرے آباؤ اجداد نے ہجرت کی، جور و ستم سہنا بہت بڑی بات ہے لیکن ہجرت بہت بڑا فرار ہے۔ مہجور نے ظلم و ستم سہے۔ اس نے سب سے بڑی اذیت جو ذہنی خصوصیت ہے، برداشت کی، مگر وہ ڈٹا رہا۔ ہجرت کا خیال تک بھی اس کے دماغ میں نہ آیا۔ وہ وہیں رہا، جہاں کا وہ تھا۔

ہجر، ہماری رومانوی شاعری کا ایک اہم جزو ہے ——— معلوم نہیں یہ کیا بلا ہے، کیونکہ اس سے مجھے آج تک واسطہ نہیں پڑا لیکن مہجور کے کلام کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ہجر ہی اس کا وصال تھا۔

ایک عجیب بات اور ہے کہ آج کل پاکستان اور ہندوستان میں کشمیر کا جھگڑا چل رہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی کشمیری ہے۔ اسے کشمیر سے محبت ہے، جیسی مجھے ہے، جیسی نصیر کو ہے، جیسی کسی اور کشمیری کو ہو سکتی ہے ——— کاش مہجور زندہ ہوتا ——— اگر وہ زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں، ڈاکٹر گراہم کی ضرورت پیش نہ آتی۔

وہ اپنے قلندرانہ انداز میں جواہر لال نہرو اور خواجہ ناظم الدین کو (یہ بھی کشمیری ہیں) سمجھا دیتا کہ دیکھو انسان کا خون، پانی سے ارزاں نہیں ہے۔ کشمیری خواہ وہ مسلمان ہو، یا ہندو، ہر حالت میں کشمیری ہے۔ تم جواہر لال نہرو ہو ——— یہ ناظم الدین ہے۔ دونوں کشمیری ہو۔ حالانکہ تم کشمیر کے باشندے نہیں ہو لیکن تمہاری روح کشمیری ہے ——— ''تم گوگ جی اور بت'' (شلغم اور چاول) کو ایسے دستر خوان سے کبھی نکال نہیں سکتے۔ پھر تم کیوں لڑتے ہو۔ شلغم اور بھات کی قسم کھاؤ، کیا تم ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکتے ہو؟

(۱۹ نومبر ۱۹۵۲ء)

☆☆☆☆☆

روسی ادب

رُوسی ادب پر ایک طائرانہ نظر

رُوس کو مغربی تہذیب کا آخری بچہ کہتے ہیں۔ رُوس کی نشاۃ الثانیہ مغربی ممالک سے دو سو سال بعد شروع ہوئی، تاہم روس نے ایسے ادیب اور مصنف پیدا کیے ہیں جن پر فکرِ انسان بجا طور پر نازاں ہے۔

افسانہ نگاری کا فن دست بدست فرانس سے اہلِ رُوس کے حصے میں آتا ہے۔ جہاں اسے انتہائی عروج حاصل ہوتا ہے۔ رُوسی مفکرین نے اس فن کو حقیقت نگاری کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے، جس میں کسی کو بھی کلام نہیں۔

رُوسی افسانوں اور ڈراموں میں حیاتِ انسانی اور نظام عالم کے متعلق غور و فکر کے شواہد پائے جاتے ہیں۔ قصے کا موضوعِ بحث عموماً انسان ہوتا ہے۔ انسان کے باہمی تعلقات اُس کے خیالات و جذبات، میلانات و رجحانات، عزائم و مقاصد، رنج و خوشی، کشمکشِ حیات اُس کی جدوجہد اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے بحث ہوتی ہے۔ فلسفیانہ نظریات اور حکیمانہ نکات کی نہایت وضاحت سے تشریح کی جاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ملتِ احمر کے افکار و آرا کے سامنے دُنیائے ادب نے اپنا سر جھکا لیا ہے۔

اُنیسویں صدی کے آخر میں روس میں دو ادیب نمودار ہوتے ہیں طالسطائی اور داستووسکی جن کی شہرت مملکتِ زار سے نکل کر دنیا کے ہر گوشے میں پھیل جاتی ہے۔ دونوں زندگی، نفسیات، انشا اور کردار میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے تاہم دونوں کی تصانیف نے اہل روس کے لیے بانگِ درا کا کام کیا۔ دونوں ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف دو مختلف راستوں سے گامزن تھے۔ دونوں کے افکار میں حیاتِ نو کی تڑپ بدرجہ اتم موجود ہے اور دونوں کے ادبی کردار روس کی متحرک تصاویر ہیں۔

طالسطائی

سرزمین روس کا زندۂ جاوید ادیب و مفکر ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا۔ داستوویسکی کے افسانوی کارناموں کا اگر کوئی مدِ مقابل ٹھہر سکتا ہے تو وہ اُس کا ہمعصر کاؤنٹ لیو طالسطائی ہے، جو اخلاقیات، مذہب، سیاست اور فلسفے کا امام تسلیم کیا گیا ہے۔ افسانہ نگاری کے فن میں بھی اُسے ایسا ہی کمال حاصل تھا۔ اُس کی ہر تصنیف اس کی عظمت اور بہترین فن کاری پر شاہد ہے۔

رُوس، طالسطائی کی گراں پایہ ہستی پر جس قدر فخر کرے بجا ہے۔ یہی وہ ذات تھی جس نے زار کی باجبروت شخصی حکومت کے ہوتے ہوئے اس وقت حریت و آزادی کا علم بلند کیا، جب اہلِ روس نے غلامی ہی کو مدارِ حیات تصور کر کے حکمرانوں کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا تھا۔

آج دنیا میں جہاں کہیں آزادی کی روح پائی جاتی ہے وہ کچھ نہ کچھ اسی مفکر اور حریت نواز شخصیت کی تعلیم کی شرمندۂ احسان ہے۔

طالسطائی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قازان یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ چند سال بعد اُس کے بھائی نے اُسے مجبور کیا کہ وہ فوجی ملازمت حاصل کرے۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء کے وسط میں وہ کاکیشیا چلا گیا۔ وہاں کی حسین سرزمین اور دہقانی دلچسپیوں نے نوجوان طالسطائی کے ذہن کی خوب ربوبیت کی۔ حسن و عشق کی اس سرزمین میں طالسطائی نے اپنا قلم اٹھایا۔

۱۸۵۳ء میں طالسطائی کاکیشیا سے کریمیا چلا گیا۔ جہاں اس نے ''داستان سباستوپول'' رقم کی۔ اس کے دو برس بعد ''جنگ اور صلح'' اور ''اینا کرینینا'' شائع ہوئیں۔ ۱۸۷۰ء کے قریب اُس کے زاویۂ نگاہ میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی یعنی آرٹ کی جگہ اخلاقیات نے لے لی۔ اُس نے دہقانوں کو سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی۔ چند سال بعد وہ بے سروسامانی کی حالت میں اپنے گھر سے نکل گیا اور بہت جلد ایک غیر معروف ریلوے سٹیشن پر بے جان نظر آیا۔

طالسطائی نے اپنے اوائل عمر کے حالات، اپنی تصنیف ''میرا اعتراف'' میں قلمبند کیے ہیں جن میں قازان یونیورسٹی کی تعلیم، کاشت کی معلومات، استنبول کی فوجی مشاقی کا نہایت وضاحت سے ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی ابتدائی عیاشیوں، اخلاقی لغزشوں، اپنے نامناسب غصوں، ناجائز عادات، کھیل تماشوں کی شرکت، ناحق کے جھگڑے فساد اور اپنے ذوقِ مصوری کا نہایت خندہ پیشانی سے اعتراف کیا ہے، اور آخر میں بتایا ہے کہ کس طرح اس کو وہ ذرائع ہاتھ آئے جن سے اُس کے ضمیر نے

کسب ضیا اور رُوح نے لطافت حاصل کی اور وہ اپنی مستور و محجوب حقیقتوں سے واقف ہو گیا جس کے بعد کامیاب زندگی کا دور شروع ہوتا ہے۔

بہر حال ان تمام فروع کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ طالسطائی ایک وہبی مصور اور مسلّم مفکر تھا۔

طالسطائی ایک کامیاب شاعر ہونے کے علاوہ بلند پایہ تمثیل نگار بھی تھا۔

داستوو سکی

فیڈر داستوو سکی ماسکو میں ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوا، مگر وہ اپنے ہمعصر طالسطائی کی طرح ایک امیر خاندان کا چشم و چراغ نہ تھا۔ وہ آخری لمحات تک غربت کے سر دپنجوں میں رہا۔ اُس نے اس زمانے میں قلم اٹھایا جب وہ انجینئر نگ سکول میں ایک ملازم کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس کی پہلی کتاب Poor Folk تھی جو اس نے ۱۸۴۵ء میں لکھی۔ اس تصنیف نے اُسے دنیائے ادب سے روشناس کرایا۔ ۱۸۴۵ء یعنی انقلاب کی تحریک کے زمانے میں وہ ایک اشتراکی مجلس میں داخل ہو گیا جہاں وہ چار سال تک قید رہا۔ اس طویل زمانے کی اسیری کے مصائب و نوائب کو اس نے اپنی تصنیف House of The Dead میں بیان کیا ہے۔ اسیری کے اس زمانے نے اس کو انسان کی فطرت کا بہترین مصور بنا دیا۔ گو اُس کی زبان کسی بہترین فن کار ایسی نہیں مگر اس کی تصانیف فطرتِ انسانی کی عمیق ترین گہرائیوں کے مطالعے کا نتیجہ ہیں۔

ایڈگر ایلن پو کی طرح داستوو سکی انسانی نفسیات کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ اپنی ایک تصنیف میں خود ایک جگہ یوں لکھتا ہے: ''میں روح کی تمام گہرائیوں میں ایک ہی دفعہ پہنچ جاتا ہوں''

۱۸۵۰ء میں وہ سینٹ پیٹرز برگ واپس چلا آیا اور کچھ عرصہ تک ایک اخبار کی ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ مگر یہ زمانہ بھی تکالیف میں گزرا۔ ۱۸۸۱ء میں یہ عظیم الشان انسان عالمِ جاودانی کو سدھارا۔

اُس کی غیر فانی تصانیف میں ''جرم اور سزا''، ''بیوقوف'' اور ''شیاطین'' بہت مشہور ہیں۔

گارشن (۱۸۵۵ء۔۱۸۸۸ء)

مغربی روس میں پیدا ہوا۔ اور سینٹ پیٹرز برگ میں تعلیم حاصل کی۔ اس کی پہلی تصنیف زمانہ تعلیم

ہی میں شائع ہوئی جس نے اس نوجوان ادیب کے افکار کو دنیا سے روشناس کرایا۔

۱۸۷۷ء میں وہ بلگیر کی جنگِ آزادی میں شامل ہوا۔ اس جنگ کے دوران میں اُس نے سپاہی کی نفسیات کا بغور مطالعہ کیا۔ اُس کی کہانیوں کو جن میں جنگ کی تصویریں کھینچی گئی ہیں، طالسطائی کے افسانوں سے بہت مناسبت ہے۔ دورانِ جنگ میں وہ زخمی ہوا اور کچھ عرصہ بعد ایک دماغی بیماری میں مبتلا ہو کر اس نے داعیِ اجل کو لبیک کہی۔

اس کی کہانیوں میں "چار دن" بہت مشہور ہے۔

انطون چیخوف (۱۹۰۴ء۔۱۸۶۰ء)

روسی افسانہ نگاری کے تیسرے دور کا سالارِ کارواں انطون چیخوف ایک غریب گھرانے میں ۱۷ جنوری ۱۸۶۰ء کو پیدا ہوا۔ اُس نے ۱۸۸۴ء میں طبابت کی سند حاصل کی مگر اُس کو اپنا ذریعۂ معاش نہ بنایا۔ اس لیے کہ اُسے معلوم تھا کہ میں اپنی تصانیف سے زیادہ کما سکتا ہوں۔

چیخوف کی مختصر کہانیاں اُسے دُنیائے ادب کی صفِ اول میں جگہ دلواتی ہیں۔ اس کی شاہراہ دوسرے افسانہ نگاروں سے بالکل مختلف تھی۔ اُس کا کام فطرتِ انسانی کی عکاسی کرنا تھا۔ اُس کا دماغ ایک آئینہ تھا جس میں وہ فطرتِ انسانی کا صحیح عکس دیکھ کر وہی عکس دنیا کو دکھا دیتا۔

اُس کے افسانوں میں بے جا طوالت نام تک کو نہیں وہ اپنے افسانوں اور ڈراموں میں دنیا کے تمام نشیب و فرازِ انسانی، دل کی کیفیات، ایک ہی پلاٹ میں بیان کرنے کے بجائے زندگی کی صرف ایک قاش پیش کرتا ہے۔ یہی چیخوف کا کمال ہے جس نے اسے زندگی کا بہترین مصور بنا دیا۔

ایک روسی نقاد چیخوف کے آرٹ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے: "روس کے خاموش مناظر کی طرح مغموم و یاس آفریں، روس کے موسمِ خزاں کی طرح رنگین، موسم سرما کی رات کا ساپُر اسرار و عمیق، کھلے میدانوں اور نیلے آسمان کا پُراز مصائب، زندگی اور غیر معلوم خوشی کے متعلق گیت —— یہ ہے چیخوف کا آرٹ۔"

چیخوف اُس چنگاری کو جو سرشتِ انسانی میں نہاں ہے شعلہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ معلم اخلاقیات نہ تھا بلکہ صحیح معنوں میں ایک بہترین فن کار اور فطرت انسانی کا فقید المثال مصور تھا۔

اُس کی اکثر تصانیف کا ترجمہ مسٹر کونسٹینس گارنٹ نے کیا ہے۔

۴ جولائی ۱۹۰۴ء کو اس باکمال انسان نے موضع بیڈن ویلر میں وفات پائی اور ماسکو میں سپردِ خاک

کیا گیا۔

ولیڈمیر کورولنکو

جنوب مغربی روس میں ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوا۔ روس کے دیگر ادباء کی طرح کورولنکو بھی حصولِ تعلیم میں سیاسی وجوہ کی بنا پر تشنہ رہا۔ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے اُسے ماسکو کے زراعتی سکول کو خیر آباد کہنی پڑی اور چھ سال کے طویل عرصہ تک سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں زندگی کاٹنی پڑی۔ اس زمانہء اسیری کے بعد وہ موضع نذنی میں اقامت پذیر ہوا جہاں وہ عرصے تک ایک رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ دراصل یہی اوراق اُس کی شہرت کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اپنے افسانوں میں ''مثالیت'' کا عمیق عنصر موجود رکھنے کے باوجود وہ حقیقت نگاری کا بہترین صناع تسلیم کیا گیا۔ اُس کی اکثر کہانیوں میں سائبیریا کی زندگی جھلکیاں دکھاتی ہے۔

این لیکوف (۱۸۹۵ء۔۱۸۳۱ء)

لیکوف کے افکار مذہبی مسائل اور دفتری زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ اُس کا طرزِ انشا ایک عجیب قوت بیان اور تخیل کی بلند پروازیوں کا اجتماع ہے۔

وی سمیڈوچ

دنیائے ادب میں ویری سیف کے نام سے متعارف ہے۔ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوا۔ مصنف ہونے کے علاوہ وہ ایک طبیب بھی تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی طبابت کو تادمِ آخر جاری رکھا۔ اس کی اکثر تصانیف میں ایسے کردار پیش کیے گئے ہیں جو جادۂ حیات پر تنہا چھوڑ دیے گئے ہوں، جو تاریکی میں ہوتے ہوئے بھی قدامت پسندی کا دامن تھامے ہوئے ہوں۔ گورکی کی طرح سمیڈوچ بھی پرانے کھنڈروں میں نئے انسانوں کی تلاش کرتا ہے۔ یہ نئے انسان جن کی رگوں میں زندگی متحرک ہے کون ہیں؟ ـــــــ اشتراکیت پسند۔

اُس کی تصانیف زیادہ تر کارل مارکس کی تعلیم کی مرہونِ منت ہیں۔

ایولن میکوف (۱۸۹۷ء۔۱۸۲۱ء)

میکوف ابتداء میں ایک سنگ تراش تھا مگر اس کے بعد جلد ہی وہ ادب کے وسیع سمندر کی لہروں

سے ہم آغوش ہوگیا۔ ایامِ شباب میں اُس نے مصوری کی تعلیم بھی حاصل کی۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں میں رنگ اور نقوش کی چاشنی بدرجہ اتم موجود ہے۔

میکوف، جیسا کہ ایک روسی نقاد بیان کرتا ہے، بپتسمہ یافتہ چین[۲] اور جعلی یکس[۳] ہے۔

الیکسنر طالسطائی (۱۸۷۵ء۔۱۸۱۷ء)

الیکسنر طالسطائی اور الیگزینڈر ردوم کے ایام طفلی ایک ساتھ بسر ہوئے۔ اس کے علاوہ اسے گوئٹے کی گود میں کھیلنے کا شرف بھی حاصل تھا۔

یہ جمالی شاعر صوفی خیالات کا ترجمان تھا۔ ۱۷۹۳ء کا پروانہء مساوات اس کے نزدیک ''سال کی فضول ایجاد'' تھی۔

رومانی تخیلات اور ڈرامائی تفصیل کی وجہ سے اسے غنائی شعرا میں ایک اچھا رتبہ حاصل ہے۔

نکریسوف (۱۸۷۷ء۔۱۸۲۱ء)

نکولی نکریسوف سولہ سال کی عمر میں اپنا وطن مالوف چھوڑ کر سینٹ پیٹرز برگ چلا آیا تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف فوج میں حصہ نہ لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کم سنی کے زمانے میں اُس کے ناتواں کاندھوں پر زندگی کا تمام بوجھ رکھ دیا گیا۔

شروع شروع میں اُس نے نثر کی طرف توجہ دی مگر جلد ہی نظم کی طرف رخ پلٹ کر چند سالوں میں روس کا بہترین شاعر اور دو رسالوں کا مدیر بن گیا۔

بچپن کے زمانے میں اُس نے زندگی کے بہت سے مصائب دیکھے تھے۔ غلیظ سے غلیظ مقامات پر بسر اوقات کی تھی چنانچہ اُس نے انہی حقائق کو اپنی شاعری میں داخل کر دیا اور اسی بات نے اسے ایک بہترین شاعر بنا دیا۔

یہ نکریسوف کی شخصیت ہی تھی جس نے روس کی قدیم شاعری میں سے بہت سے عناصر یک قلم خارج کر دیے اور اس میں نئی روح اور جدت داخل کر دی۔

حال ہی میں یورپ کے نقادوں نے متفقہ طور پر نکریسوف کو بلند پایہ شاعر تسلیم کر لیا ہے۔

نیڈسن (۱۸۸۷ء۔۱۸۶۲ء)

نیڈسن اپنے دیگر ہم عصروں سے بالکل مختلف تھا۔ اُس کی شاعری چیخوف کا مغموم و یاس آفرین رنگ لیے ہوئے ہے۔ دراصل اس کی شاعری ایک نغمہ ہے، مرتے ہوئے سپاہی کا ـــــ عین شباب میں موت کے سرد پنجوں نے اس نوجوان شاعر کا غنچۂ حیات مسل دیا۔

نوجوانوں کے طبقے میں نیڈسن کو بہت مقبولیت حاصل تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ اس کے افکار میں اپنی دبی ہوئی آہوں اور شکستہ امیدوں کی جھلک دیکھتے تھے۔

میکسم گورکی (۱۸۶۸ء)

اُنیسویں صدی کا نصفِ آخر صنعتی ترقی کا زمانہ تھا۔ دہقانی اشتراکیت کا خیال روسی اذہان سے بتدریج محو ہو رہا تھا۔ کسانوں کی جگہ کارخانوں کے مزدوروں نے حاصل کر لی۔ روسی افسانہ نگار کی توجہ کسان سے منعطف ہو کر مزدور کی زبوں حالی پر مرکوز ہو گئی۔ کارل مارکس کے افکار نے روس کی حزبی اشتراکیت کا خاتمہ کر دیا۔

اس زمانہ کے گلستانِ ادب میں گورکی نے بادِ نسیم کا کام کیا۔ شباب، مستقل مزاجی اور فکرِ جدید کے ساتھ گورکی روس کے ایوانِ ادب میں داخل ہوا ـــــ شاید کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہونے کے لیے۔

گورکی کے افکار ایک المناک راگنی کی صورت میں اُٹھے اور روس کی فضا پر چھا گئے۔ اس برہنہ پا مفکر کی صدا طالسطائی کی کمزور آواز ایسی نہ تھی بلکہ شیر کی ایک گرج تھی جس نے روس کے خوابیدہ مزدوروں کو جگا دیا۔

الیکسنر پیشکوف گورکی ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اُس کی پیدائش کے تھوڑے ہی عرصے بعد انتقال کر گیا۔ ابھی وہ کمسن ہی تھا کہ اس کے دادا نے اُسے ایک کفش دوز کے ہاں نوکر کرا دیا۔ مگر وہ وہاں سے بھاگ کر ایک جہاز میں ملازم ہو گیا۔ جہاز پر بھی وہ بہت عرصے تک نہ رہا۔ قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ مستقبل قریب کا ادیب اتنے عرصے تک دنیا کی نظروں سے روپوش رہے۔ گورکی کے ذہنی تلاطم نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ روس کی سرحدوں پر آوارہ پھرتا رہے۔ خانہ بدوشی کی اس سیاحت کو اس نے ۱۸۹۰ء

میں قلمبند کیا۔ یہی اُس کی پہلی تصنیف تھی اور چند تصانیف کے بعد گورکی کی شہرت دنیا کے ہر گوشے میں پھیل گئی۔

۱۹۰۵ء کے انقلاب میں حصہ لینے کی وجہ سے اسے اپنی مادرِ وطن کو خیر آباد کہنی پڑی۔ روس کو چھوڑ کر وہ اٹلی میں اقامت پذیر ہوا۔ جہاں اُس نے چند کتب تصنیف کیں۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد گورکی دوبارہ روس میں داخل ہوا۔

رُوس کا یہ عظیم الشان انسان کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی غیر فانی تصانیف "ماتا"، "خوفزدہ"، "دوسرے شعلے" سے اکناف عالم میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

گورکی بالعموم مجلسی زندگی کے ان فراموش کردہ افراد کی المناک داستانوں کو قلم بند کرتا ہے جو زندگی کے حقیقی معنوں ہی سے نا آشنا ہوں اور جن کے قلوب زمانے کے کھردرے پن سے بے حس ہو چکے ہوں۔

گورکی درحقیقت ایک ادبی جراح ہے اس کے افکار ہر دماغ کو چیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اُس کی بیان کی ہوئی داستانوں کی صحیح تصویریں وہاں منقش ہو جاتی ہیں یہی گورکی کا کمال ہے جو اُسے زمانہء حال کے ادیبوں کی فہرست میں ایک بلند رتبہ دلواتا ہے۔

کسی بوٹ پر کیچڑ یا برف کے نشان، پیانو کے چھیڑے ہوئے پردے، دہقانوں کی بھدی گفتگو، سنتری کی آنکھوں میں حیوانی جھلک، سمندر کی لہروں کا جھاگ اور اسی قسم کے حقیر حادثات گورکی کے قلم سے اس پُر اثر انداز میں بیان کیے جاتے ہیں کہ وہ ہمیں ان کی گہرائیوں تک لے جاتے ہیں جہاں رومانی افسانوں کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیں حقیقی زندگی سے روشناس کراتا ہے۔ خواہ ہمیں اس سرزمین کے جغرافیائی حالات کے سوا اور کچھ معلوم نہ ہو جو اُس کے افسانوں سے متعلق ہوتی ہے۔

اُس کی تصانیف نے ہماری آنکھوں کے سامنے روسی زندگی کی فلمی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

گورکی نے افسانوں کے علاوہ بہت سے ڈرامے بھی سپردِ قلم کیے ہیں جو صنعت کا بہترین نمونہ ہیں Below Depths اور Childrin of The Sun بہت مشہور ہیں۔

گورکی زندہ ہے اور گو ان دنوں وہ اکثر بیمار رہتا ہے مگر پھر بھی اُس نے اپنا قلم ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اُس کی تمام تصانیف سولہ مختلف جلدوں میں منقسم ہیں۔ جن میں سے اکثر کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

لیونڈ اینڈ ریف (۱۹۱۹ء۔۱۸۷۱ء)

اینڈ ریف وسطی رُوس میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ جو مقامی سکول کا ایک معمولی معلم تھا اس کو بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے گیا۔ گو باپ کی وفات کے بعد اینڈ ریف کے لیے تعلیم حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ تاہم اس نے کسی نہ کسی طرح پیٹرز برگ کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر لی۔ اس زمانے میں وہ تعلیمی مصارف کے لیے بچوں کو پڑھا کر رقم مہیا کرتا۔ اینڈ ریف کی زندگی تکلیف دہ مصائب ونوائب سے بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ انہی رنج وآلام سے تنگ آ کر ایک دفعہ اُس نے خودکشی کا اقدام بھی کیا مگر خوش قسمتی سے موت کے ہاتھوں سے بال بال بچ گیا۔

۱۸۹۷ء میں اُس نے ماسکو سے وکالت کا امتحان پاس کیا اور قانونی مقدمات کے نامہ نگار کی حیثیت میں کام کرنا شروع کر دیا۔

۱۸۹۸ء میں اُس نے اپنی کہانیوں کا پہلا مجموعہ شائع کیا جو اُس کے لیے کافی شہرت کا باعث ہوا۔ ان افسانوں کے مطالعہ کے بعد ایک روسی نقاد نے اینڈ ریف کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

''ہم دیکھتے ہیں کہ افقِ ادب پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ جس کی تابانی مسحور کن اور پُراسرار ہے۔''

ان کہانیوں کے بعد کی تصانیف اور ڈراموں نے اسے اکناف عالم میں مشہور کر دیا۔

اس کے ابتدائی افکار میں بلاشک وشبہ گورکی اور چیخوف کا رنگ نمایاں طور پر غالب نظر آتا ہے۔

اینڈ ریف کے افسانوں کے ہیرو عموماً قدیم نظام کے کھنڈر دیکھتے ہیں۔ انھیں اپنا سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملتی وہ زندہ نہیں رہ سکتے مگر اس کے ساتھ ہی وہ زندہ رہنے کے آرزومند بھی ہیں۔ زندگی انہیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان میں خوشی کے دور کی تمنا اور نیک انجام کی خواہش مردہ نہیں ہوتی۔ دراصل اینڈ ریف کا غم دنیا کا غم ہے۔

اگر گورکی بحرِ ادب کا نہنگ ہے تو اینڈ ریف ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی ناکام جدوجہد کے بعد اندرونی عدم وفقدانِ احساس کا عکاس ہے۔ اس زمانے میں ہر قسم کی ادبی دواؤں کی مانگ تھی۔ اینڈ ریف نے اس فن کو سیکھ لیا۔ چنانچہ وہ جلد ہی ایک کامیاب ترین ''دواساز'' بن گیا۔

اس نے یاس وقنوط اور طبعی اور مافوق الطبعی خطرات کے بیان میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی اور دوستووسکی کے نظریات کو لے کر انہیں اپنے فکرِ جدید کے قالب میں ڈھال لیا۔ اُس کے افکار جمالی

حسیات پر اثر انداز ہونے کے بجائے اعصاب پر اثر کرتے ہیں۔ اس کی تصانیف میں ''دھند''، ''تاریکی''، ''نفت بردار'' اور ''گورنر'' شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اینڈریف نے اپنی پہلی تمثیل ''سوئے انجم'' ۱۹۰۶ء میں لکھی۔ اس کے بعد اس نے اور بہت سے ڈرامے لکھے مگر وہ ان کے افسانوں کے مدِ مقابل نہیں ٹھہر سکتے۔ ان ڈراموں کا فلسفہ بھی فنا اور موت سے متعلق ہے۔

''طمانچہ زدہ'' نامی تمثیل جو امریکہ کے کسی نگار خانے نے فلم بھی کی ہے اس کے تمام ڈراموں میں کامیاب اور موثر تمثیل ہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب سرخ توپیں ''عسکرِ ابیض'' پر گولہ باری کر رہی تھیں، اینڈریف اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔

فیڈر ٹیٹرنیکوف

ایف سلوگب کا اصلی نام فیڈر ٹیٹرنیکوف ہے۔ ۱۸۹۵ء میں اُس نے پہلی مرتبہ اپنے اشعار کے ایک مجموعے سے خود کو دنیائے ادب سے روشناس کرایا۔ اس کے بعد اُس نے ایک ضخیم ناول ''ننھا شیطان'' لکھا۔ اس تصنیف نے اُسے دیگر مشہور ادبا کی فہرست میں داخل کر دیا۔ مگر اس ناول کے بعد کی تصانیف میں اس نے اپنے اشہبِ فکر کو تخیل کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا جس کی وجہ سے قارئین کچھ تنگ آ گئے اور غالباً یہی تنفر اُس بے رُخی کا باعث تھا جو اس کی بہترین تصنیف ''کری ایٹڈ لی جنڈ'' کو نصیب ہوئی۔

اُس کی آخری تصنیف ''دی چار مر آف سنیکس'' گو ادبی لحاظ سے بہت کمزور ہے مگر اس میں کلام نہیں کہ اس میں شعریت کا عنصر ہر حالت میں کامیاب ہے۔

سلوگب دنیا کو دو حصوں میں منقسم کرتا ہے۔ ایک ''اچھی دنیا'' جس میں اتحاد، سکون اور حسن ہو۔ دوسری ''بری دنیا'' جس میں تفرقہ، ہوس اور فواحش موجود ہیں۔ سلوگب کے نزدیک ہماری یہ دنیا معائب کی تخلیق ہے اور سکون و اتحاد کی دنیا صرف انسانی قلوب میں پائی جا سکتی ہے۔

سلوگب کا فلسفہ زیادہ تر تلبیس نما عدمیت سے مشابہ ہے۔

اُس نے بہت سی تمثیلیں بھی سپردِ قلم کی ہیں مگر وہ دیگر تصانیف کی طرح کامیاب نہیں۔ ان ڈراموں کے متعلق صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ حسین تو ہیں مگر یہ حسن صرف ظاہری ہے۔

سلوگب کا طرزِ انشا حد درجہ خیالی، ذو معنی اور تعجب خیز طریق پر جدت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

بہر حال وہ روس کا بلند پایہ غنائی شاعر اور مسلّم ادیب ہے۔ سلوگب زندہ ہے اور ابھی تک اپنے افکار پیش کر رہا ہے۔

اینڈری بیلی (۱۸۸۰ء)

صوفی خیالاتِ جدیدہ کا سب سے بڑا ترجمان بلا شک وشبہ بی بوگیف ہے، جو حلقہء ادب میں بیلی کے نام سے متعارف ہے۔

بیلی ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۴ء میں اپنے کلام کا پہلا مجموعہ شائع کیا جس میں اُس نے اظہار جذبات وخیالات کے لیے نئے ذرائع پیش کیے ہیں۔ اُس کا نظم ونثر کا طرزِ انشا غیر معمولی طور پر عجیب ہے۔

بیلی نے ایک بڑا ضخیم ناول بھی لکھا ہے مگر وہ ادبی لحاظ سے پُر از اسقام ہے۔

ویلری بروسوف (۱۹۲۴ء۔۱۸۷۳ء)

(۱۹۲۴ء۔۱۸۷۳ء) بروسوف ۱۸۷۳ء میں ایک سوداگر کے ہاں پیدا ہوا۔ ساز گار اسباب ہونے کی وجہ سے اُس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۴ء میں بروسوف نے اپنی پہلی تصنیف شائع کی مگر وہ حلقہء ادب میں کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ اس تصنیف کے بعد کی کتابوں نے اُسے اور بھی بدنام کر دیا اور ایک لحاظ سے وہ ''ادبی مسخرہ'' کہلانے لگا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ کچھ عرصے تک ایوانِ ادب کے دروازے اس پر بند رہے۔

اُس کی ابتدائی شاعری گو بہت سے اوصاف کی حامل تھی مگر پھر بھی وہ نقادوں کے نزدیک خرافات تھی شاید اس لیے کہ ان میں ذوقِ صحیح کا مادہ مفقود تھا۔ درحقیقت بروسوف کی شاعری افکار شباب کا اجتماع ہے۔

کچھ عرصہ تک بروسوف کی ہر کتاب سے یہی ناروا سلوک ہوتا رہا مگر نوجوان ادیب کا پائے استقلال باوجود ان ہمت شکنیوں کے نہ ڈگمگایا۔ اُس کا طرزِ انشا بتدریج پختہ ہوتا گیا اور ساتھ ساتھ اس کے شائقین میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ آخر وہ روس کا مستند غنائی شاعر تسلیم کر لیا گیا۔

بروسوف سیاسیات سے بالکل علیحدہ رہا۔ سیاسیات کے متعلق اُس کا رویہ ہمیشہ جمالی نقطہ نظر کا پہلو لیے رہا ہے۔ گو بروسوف کی شاعری میں تمدن کا رنگ ہے مگر پھر بھی وہ فکری شاعر نہیں کہلا سکتا۔ بروسوف

نے مختصر کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں ایڈگر ایلن پو کا رنگ نمایاں طور پر غالب ہے۔

ای۔ چریکوف (۱۸۶۷ء)

گورکی کے افکار نے بہت سے نامور ادیب پیدا کیے ہیں جن میں چریکوف کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ چریکوف ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طبابت کی سند حاصل کی۔ اس نے اپنی پہلی تصنیف ''ڈاکٹر کی نوٹ بک'' سے دنیائے ادب میں سنسنی پیدا کر دی۔

اس کی اکثر تصانیف مارکس کے نظریات سے بحث کی صورت میں ہیں۔

اس کی کہانیوں میں ''جادوگر'' [۴] اور ''گرفتار بلا'' [۵] جو زمانہ انقلاب کی قلمی تصویریں ہیں، شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ٹی۔ بنن (۱۸۷۰ء)

روس کی قدیم روایات اور ویرانوں کا شاعر و مفکر بنن ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کا بربطِ فکر گزشتہ مسرت بھرے ایام کا نغمہ خواں ہے۔ بنن نے بہت سے مختصر افسانے بھی سپردِ قلم کیے ہیں جن میں ''سان فرانسسکو کا اجنبی'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

الگزنڈر کپرن

حقیقیئن میں الگزنڈر کپرن کو ایک بلند رتبہ حاصل ہے۔ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا اور فوجی تعلیم حاصل کی مگر جلد ہی اس زندگی سے تنگ آ کر فوجی ملازمت کو خیر باد کہہ دی۔ اس کے بعد وہ اپنا بیشتر وقت ادبی خدمات میں صرف کرنے لگا۔

کپرن نے اپنا پہلا ناول [۶] جو کئی سو صفحات پر مشتمل تھا، ۱۹۰۵ء کے آغاز میں شائع کیا جس نے مجلسی دائرہ میں سنسنی پیدا کر دی۔

کپرن کی زندگی نشیب و فراز سے پُر تھی۔ اُس نے زندگی کا مطالعہ شکستہ مکانوں، غریبوں کی جھونپڑیوں، میخانوں اور کارخانوں ایسے مقامات سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام مشاہدے کی خاطر رہزنوں، چوروں اور ماہی گیروں کے ساتھ بسر کیے تھے یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیاں روس کی متحرک تصاویر ہیں۔ اُس کا طرزِ انشا نہایت پاکیزہ اور شستہ ہے۔

''ڈیول'' فوجی زندگی کی ایک نہایت واضح قلمی تصویر ہے جس میں کپرن نے فوجی افسروں کی فحش کاریوں اور سپاہیوں کی قمار بازی و مے پرستی کو کمال فن کاری سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔

کپرن کا سینہ محبت، انتہائی محبت سے معمور ہے۔ وہ ''قدرت'' کے دام الفت میں گرفتار ہے۔ ہر درخت، ہر پھول، ہر زندہ چیز کا پرستار ہے۔ کپرن اپنے ایک ناول ''گڑھا'' میں قاری کو شہر کی نہایت بھیانک تصویر پیش کرتا ہے مگر وہ رجائی ہے ہمیں اُس کے کرداری ڈھانچوں میں زندگی جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

کپرن محبت کا مغنی ہے۔ محبت جو موت سے کہیں طاقتور ہے، محبت جو زندگی کا بیک وقت آغاز و انجام ہے۔ روس کے کسی انشا پرداز نے کپرن کی طرح حقیقی یعنی محبت کی تصویر کشی نہیں کی۔

''یاما'' نامی تصنیف کے بعد اس نے ابھی تک اپنے تازہ افکار نہیں پیش کیے۔ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر وہ روس چھوڑ کر فرانس کے کسی گوشے میں اقامت پذیر ہے۔

اعتذار

طوالت کے خوف سے یہ مضمون ہر حالت میں تشنہ تکمیل ہے۔ طالسطائی سے پہلے اور کپرن سے بعد کے انشا پردازوں کی ادبی سرگرمیوں کے حالات فرصت آئندہ میں بیان کیے جائیں گے۔ انشاءاللہ۔

☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ یہ افسانہ پنجاب کے کسی رسالے میں شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ موسیقی کا دیوتا۔

۳۔ شراب کا دیوتا۔

۴۔ یہ افسانہ ہمایوں کے کسی پرچے میں شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ مترجمہ مسز ابو سعید۔

۶۔ ''ڈیول''

رُوسی ادب کا تعارف

رُوسی ادب کی ابتدا

رُوس کو یورپ سے متعارف کرانے والے وہ Norse Men تھے جو بائی زینتیم اور شمالی یورپ کے درمیان ایک اچھا تجارتی راستہ تلاش کرنے کے سلسلے میں اُنیسویں صدی کے آخری نصف میں رُوس کی سرحدوں کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے تجارتی مراکز نور گورود اور کیف تھے۔ اولیگ (۹۱۲ء-۸۷۹ء) نے کیف کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔ ولادی مئیر (۱۰۱۰ء-۹۸۰ء) نے بائی زینتائن شہزادی اینا سے شادی کی۔ چنانچہ مسیحیت جہیز کی صورت میں اس کے ساتھ روس میں آئی۔ شاہزادہ اور اس کی رعایا نے ۹۸۸ء میں دین مسیحی قبول کیا۔ یہ وہ دوسرا رشتہ ہے جس نے روس کو بائی زینتائن اثر کے ماتحت کر دیا۔ یونانی راہبوں، صناعوں اور کسانوں کے داخلے سے کیف بہت جلد ایک بارونق شہر اور گوناگوں دلچسپیوں کا مرکز بن گیا۔ اس زمانے میں ادب کی طرف بھی توجہ دی گئی۔

اس عہد کے لٹریچر میں ہم یونانی زبان کے تراجم دیکھتے ہیں۔ ان دنوں میں نئے نئے مسیحی روسیوں کی روحانی غذا صرف دعاؤں، انجیل کی آیتوں اور مختلف خدا رسیدہ بزرگوں کی مدح و ستائش پر مشتمل تھی۔ اس وقت کی قابلِ ذکر تصنیف Instruction ہے جو شاہزادہ ولاڈی مئیر مونا ماخ (۱۱۲۵ء-۱۰۵۳ء) معرضِ تحریر میں لایا۔ یہ کتاب بچوں کے لیے ہے، جس میں مصنف نے اخلاقی قواعد جمع کیے ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ ہم Chronicle of Nestor کو بھی فراموش نہیں کر سکتے جو اس زمانے کے ادب کے اچھے نمونے ہیں۔

کیف کے لیے ایک ادبی مرکز میں تبدیل ہو جانا بالکل آسان تھا۔ مگر جغرافیہ اور تاریخ اس کی راہ میں دد

زبردست رکاوٹیں تھیں۔ ولاڈی میئر موناماخ کی وفات کے بعد شاہزادوں میں ان بن سے منگولوں نے خوب فائدہ اٹھایا اس کے علاوہ تاتاری (تیرھویں صدی کے پہلے نصف میں) بڑھتے ہوئے قریب قریب سارے روس پر قابض ہو گئے۔ حملوں کے دوران میں کیف کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ جوروا ستبداد، تخریب اور تاتاریوں کی بربریت نے کیف میں تخلیقی قوت کا ناس ماردیا۔

تاتاریوں کے عہد میں ادبی سرگرمیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔ ایک نظم کے چند ٹکڑے ہیں جو تیرھویں صدی کے نصف اول کی یادگار ہیں۔ اس نظم کا عنوان "The Song About The Ruin of The Russian Land" ہے۔ اس کے بعد کے زمانے کی ایک مربوط نظم ہمیں ملتی ہے جس میں تاتاریوں اور شاہزادہ متری کی جنگ کا ذکر ہے۔ ان سب سے زیادہ قابلِ ذکر Poem of The Rovt of Mamai ہے۔

تاتاری فی الحقیقت ایسی قسم کے جنگ جو لوگ تھے۔ وہ صرف خراج کے خواہاں تھے۔ ماسکو کے شاہزادے ایوان کالتیا (۴۰ء-۱۳۲۸ء) نے تمام روس سے خراج فراہم کرنے کا حق حاصل کر لیا۔ آہستہ آہستہ ایوان سوئم (۱۵۰۵ء-۱۴۶۲ء) نے روس کو تاتاریوں سے آزاد کرا دیا۔ قسطنطنیہ کی شکست کے بعد سوفیا پیلی لوگ، یونانی شہنشاہ کی بھتیجی ایوان سوئم کے عقد میں آئی۔ اس کے بڑے لڑکے ''ایوان خوفناک'' کے عہد میں ہم روس کی وسعت کے ساتھ ساتھ کلچر کے حصول کے لیے اس کی ٹھوکریں بھی دیکھتے ہیں۔ روس، یورپ سے دو بڑی چیزوں کے باعث جدا رہا تھا۔ اوّلاً نشاۃ الثانیہ اور اصلاح۔ ثانیاً، حکومت اور کلیسا۔ جو دونوں انتہائی درجہ کے قدامت پسند تھے۔ اس زمانے کے اکثر انشا پرداز پادری تھے۔ ''ایوان خوفناک'' بذاتِ خود ایک حد تک ادب سے متعلق ہے۔ مرتد شاہزادے کربسکی کے نام اس کے مکتوبات اچھی نفسیاتی تحریر کی صورت میں ہیں۔

اس عصر کی قابلِ ذکر کتب میں Chetyi Minei اور (Calender ؟) کا رتبہ بلند ہے۔ پہلے رومانوف (زار) کے انتخاب سے روسی کلیسا میں ایک اضطراب پیدا ہو گیا۔ جو روسی ادب پر بغایت درجہ اثر انداز ہوا۔ اس کھلبلی کا باعث بڑے پادری نی کون کی اصلاحات تھیں جو قدامت پسندوں کو بہت ناگوار گزریں اور انھوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ان مخالفوں کا لیڈر ایک پادری ایواکوم تھا۔ یہ ایک زبردست ایمان و یقین اور قوت ارادی کا مالک تھا۔ مختلف جیلوں میں قید کاٹنے کے بعد اسے سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔ مگر یہ مصائب و آلام اس کی جبین عزم پر شکن تک نہ لا سکے۔ آخر کار

اس کو ۱۶۸۱ء میں زندہ جلا دیا گیا۔

اس پادری کے سوانح حیات جو اس نے خود قلمبند کیے ہیں۔ دیگر معلومات کے علاوہ اس زمانے کی تہذیب، تمدن اور رواج پر بہت روشنی ڈالتے ہیں۔

الیکسن منی لووچ کے عہد میں تھیٹر کی طرف توجہ دی گئی۔ روسی تھیٹر کا بانی ایک جرمن ڈاکٹر گریگری تھا۔ اس کے اوائلی ڈرامے انجیل کی آیات سے متعلق ہیں جو ۱۶۷۲ء میں ماسکو کی سٹیج پر کھیلے گئے۔ ڈاکٹر گریگری کی سعی ناکام رہی اور روسی تھیٹر بہت کم عرصہ کے لیے زندہ رہا۔ اٹھارویں صدی میں روسی تھیٹر پھر نئے سرے سے معرضِ وجود میں آیا۔ اسی دوران میں روس پر مغرب کی نشاۃ الثانیہ اثر انداز ہوئی۔ چنانچہ اس زمانے کے ادبا نے سلیس اور قابل فہم زبان کو اختیار کیا۔ ایسی تصانیف میں The story of Sava Crutsva روسی فاڈسٹ کی کہانی Rruslam Dazareveter اور Boua Kroleuich قابل ذکر ہیں۔

یہ ہیں گیارھویں صدی سے لے کر سترھویں صدی تک کی ادبی سرگرمیوں کے نتائج جن کا اختصار ہم نے اوپر کی سطور میں درج کیا ہے۔ یہ نتائج انگلینڈ، فرانس اور اطالیہ کی ادبی ترقیوں کے مقابلے میں کچھ بھی وقعت نہیں رکھتے۔ دراصل روس ابھی تک گمراہی میں گرفتار تھا۔ سیاسی لحاظ سے اس نے ایک حد تک یہ ترقی ضرور کی کہ وہ تاتاریوں کے پنجے سے رہا ہو گیا اور قازان، سائبیریا، امتراخان یوکرینا کے وسیع علاقوں کا اس سے الحاق ہو گیا۔ مگر بایں ہمہ سرزمین روس ابھی تک بالکل غیر زرخیز تھی اور وہ کسی قوی ہل چلانے والے کی منتظر تھی۔ یہ ہل چلانے والا پطرسِ اعظم تھا جس کی آمد کے ساتھ ہی ''پیٹرز برگ زمانے'' کا آغاز ہوتا ہے۔

پطرسِ اعظم کی اصلاحات نے نہ صرف ملک کی بگڑی ہوئی حالت کو سدھارا بلکہ زبان اور تلفظ میں بھی ایک قابل قدر اصلاح کی۔ اس نے ۱۷۰۳ء میں پہلی مرتبہ روس سے ایک اخبار Vyedom sti جاری کیا۔ وہ خود اس اخبار کا سرگرم قلمی معاون تھا۔ اب غیر ملکی تصانیف روسی زبان میں منتقل کی جانے لگیں۔

اپنی سرگرمیوں پر کلیسا کا اثر دور کرنے کے لیے پطرس اعظم نے Patriarchate کا خاتمہ کر دیا۔ مگر اس کے باوصف پادریوں میں اس کے کئی معاون و ممد ثابت ہوئے۔ ان معاون پادریوں میں تھیوفین پروکوپووچ کا نام قابلِ ذکر ہے، جو ایک بلند پایہ انشا پرداز تھا۔ اس نے شاعری اور ڈرامے کی

طرف کافی توجہ دی۔ اس کا طرزِ تحریر سیمون پالوتسکیسے ملتا جلتا ہے۔ مگر ذکاوت کے لحاظ سے اس سے کہیں بلند ہے۔ اس عصر کے انشا پردازوں میں ایوان پوسوشکوف بھی کافی مشہور ہے جس نے معاشری اور معاشی مضامین پر بہت سے مقالے سپرد قلم کیے ہیں۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف On Fovebty & Riches ہے۔

پطرسِ اعظم کی وفات پر روسی سائنس اکادمی اور ماسکو یونیورسٹی کا افتتاح ہوا۔ یہ دونوں دراصل پطرس اعظم کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہیں۔ اب ادب صحیحہ کا ارتقا شروع ہوا۔ پرنس اے ڈی کنیتی مئیر اور مچل لومونوسوف کے افکار نے روسی ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

کینتی مئیر (۴۴ء-۱۷۰۹ء) رومانین تھا۔ لندن اور پیرس میں عہدہ سفارت پر مامور رہ کر اس نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا۔ روس واپس آنے پر اس نے روزمرہ کی زبان میں روسی حالات پر طنزیہ مقالے لکھنے شروع کیے جو حقیقت نگاری کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس کی تحریروں میں فرانسی ادب کے اثرات جابجا نمایاں ہیں۔

لومونوسوف (۶۵ء-۱۷۱۱ء) یہ کسان کا لڑکا تھا۔ ماسکو میں آ کر اس نے بڑی غربت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور باقی ماندہ تعلیم غیر ممالک میں مکمل کی۔ واپسی پر اسے اکاڈمی کا پروفیسر بنایا گیا۔ اپنی تصنیف ''روسی گرائمر'' سے اس نے زبان میں ایک قابل قدر اصلاح کی۔

اسی عصر کا مشہور تمثیل نگار الگزنڈر سماراکوف (۷۷ء-۱۷۱۷ء) ہے۔ یہ روسی تھیٹر کا ڈائرکٹر بنایا گیا۔ اس کے نو المیہ ڈرامے گو سقیم ہیں، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں اس نے عامیانہ تفصیلوں اور دیگر عیوب سے کافی احتراز کیا ہے۔ سماراکوف نے فرحیہ اور طنزیہ ڈرامے اور کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

کیتھرائن ثانی کے عہد میں روسی ادب و ماحول پر فرانسیسی اثر بہت بڑھ گیا۔ اس ملکہ کی والٹئیر اور ددرو سے بڑی آزادانہ خط کتابت تھی۔ گو وہ نسلاً جرمن تھی۔ لیکن اس نے بہت سی کامیڈیاں روسی زبان میں لکھیں۔ اب فرانسیسی ادب بڑی سرعت سے روسی فضا میں داخل ہونے لگا۔

کیتھرائن کے عہد حکومت کے اختتامی زمانے میں ہم روسی ادب پر نئے اثرات چھائے ہوئے دیکھتے ہیں۔

نکولائی ایم کیرام زین (۱۸۲۶ء-۱۷۶۶ء) نے جذبات نگاری کو متعارف کرایا۔ اس نے ''احساسات'' کو سمجھنے میں دستگاہ وافی حاصل کر لی۔ دراصل اس وقت جذباتی تحریروں کی بہت مانگ

تھی۔ ان فروع کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کیرام زین فی الحقیقت ایک بلند پایہ ادیب اور نثار تھا۔ اُس کی ادبی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اس نے ''یورپی سفیر'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ بھی جاری کیا۔

روس میں اب خواندہ افراد کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ یورپ کے جدید نظریات اور افکار نے سرزمین روس کو بہت زرخیز پایا۔ ویلی، زوکووسکی (۱۸۵۲ء-۱۷۸۳ء) نے جو ایک اچھا شاعر تھا، گرے، مور، بائرن، برگر، گوئٹے، شلر اور دیگر شعرا کا کلام روسی زبان میں منتقل کیا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس نے گرے کی مشہور نظم کا روسی زبان میں ترجمہ کیا۔ جس میں اس نے اصل زبان کی جملہ لطافتیں اور خوبیاں برقرار رکھی ہیں۔

زوکووسکی، روسی شاعرانہ زبان کا مخترع تھا۔ اس نے اس قابل بنا دیا کہ وہ گائی جا سکے۔ اس کے علاوہ اس نے زبان میں اور بہت سی خوبیوں کا اضافہ کیا۔ اس کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسی زبان ہر لحاظ سے یورپی زبانوں کا مقابلہ کرنے لگی۔ اب صرف ایک ایسے ادیب یا شاعر کی ضرورت تھی جو زبردست ذکاوت وفراست کا مالک ہو۔ یہ ضرورت الگزنڈر پوشکن نے پوری کر دی۔

الگزنڈر پوشکن

روس کے ادب جدید کا آغاز انیسویں صدی سے ہوتا ہے۔ اس وقت کی فضا سیر حاصل افکار سے معمور تھی۔ لوگوں کی نبض کار یکی تمثیل (نپولین کے حملے) سے دھڑک رہی تھی۔ قوم کے سینے میں احساسِ بیداری کروٹیں لے رہا تھا اور ایک دنیائے نو کے دروازے کسی خوش گوار بادِ نسیم سے کھل رہے تھے۔

اگر انگلستان کی نشاۃ الثانیہ تمثیل نگاری کی صورت میں نمودار ہوئی تو روس کی مردہ زمین نے پوشکن ایسے سحر طراز شاعر کو جنم دیا جس کے کیف آور گیت ایک عرصے تک فضائے ادب کو زندگی بخشتے رہے۔

الگزنڈر پوشکن ۲۴ مئی ۱۷۹۹ء کو ماسکو میں پیدا ہوا اور آتش نفس شاعر بائرن کی عمر تک پہنچ کر اس جہاں سے کوچ کر گیا۔ گو اس نوجوان شاعر کو اپنی عمر کی بہت کم بہاریں دیکھنا نصیب ہوئیں، مگر اس عرصے میں اس نے بین المِلّی شہرت حاصل کر لی۔

پوشکن کا دادا عربی النسل تھا۔ جو پیٹر اعظم نے ایک بوتل شراب کے عوض قسطنطنیہ میں خریدا تھا اور جس نے کچھ عرصہ بعد ایک جرمن خاتون سے شادی کر لی تھی۔ اس قسم کی عجیب روایت کے وارث شاعر

نے فرانسیسی معلموں اور ایک روسی خادمہ سے تعلیم حاصل کی اور تھوڑے عرصے کے بعد ہی یعنی اٹھارہ سال کی عمر میں یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم کی سند حاصل کر لی۔ گو وہ زمانۂ تعلیم میں ذہین ثابت نہ ہو سکا مگر اس وقت کے اشعار بھی اس کی عظمت پر شاہد ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہونے پر وہ تین سال تک مختلف مقامات پر گھومتا رہا۔ پوشکن فطرتاً آزاد منش واقع ہوا تھا چنانچہ وہ حکومت کے عتاب سے نہ بچ سکا اور کچھ عرصے کے لیے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس زمانے میں اس کا اشہبِ فکر مختلف میدانوں میں چکر کاٹتا رہا۔

۱۸۲۶ء میں واپسی پر وہ پیٹرز برگ میں اقامت پذیر ہوا جہاں اس کی پرستار دوشیزہ لڑکیوں اور حکام کے سنسروں نے اسے گھیر لیا۔ تیس سال کی عمر میں اس نے ایک سولہ سالہ لڑکی سے شادی کی جو حسن میں اپنی مثال صرف آپ تھی۔ اس حسینہ کی ضروریات بہم پہنچانے کی خاطر شاعر بڑی تن دہی اور جاں فشانی سے کام کرنے لگا۔ صرف اس لیے کہ اس کی محبوب رفیقۂ حیات کو معاشرے میں ممتاز حیثیت حاصل ہو سکے۔

پوشکن، ڈینٹے، شیکسپئر اور گوئٹے کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔ گو بعض نقاد اس کے کلام میں بعض خامیاں بھی نکالتے ہیں تاہم اس میں کسی کو کلام نہیں کہ وہ روس کا سب سے پہلا اور بلا شک وشبہ سب سے بڑا قومی شاعر و مفکر ہے۔ خود پوشکن کو اپنی عظمت کا احساس تھا۔ وہ اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے:

نہیں، میں مر نہیں سکتا

میری روح زندہ ہے، گو میرا جسم مٹھی بھر خاک میں تبدیل ہو گیا ہے۔

میں زندہ ہوں، مشہور ہوں اور رہوں گا۔ جب تک اس آسمان تلے کوئی شاعر زندگی کے سانس لے گا۔

میرا نام زبان زدِ خاص و عام ہو گا۔

قوم کی قوم میری محبت میں گرفتار ہو گی۔

اس لیے کہ میرے نغمات نے ان کے لطیف جذبات بیدار کر دیے اور افتادہ لوگوں کے لیے رحم کی التجا کی۔

پوشکن نے شکسپیئر کے افکار سے متاثر ہو کر آزاد بحر میں طبع آزمائی کی اور ایک تمثیل لکھی۔ اس تمثیل کا نفسِ مضمون روس کی مضطرب فضا ہے۔ گو قابل ادیب نے اپنے کرداروں کے نفسیات بیان کرنے

میں کمالِ فن کاری کا نمونہ دکھلایا ہے مگر پھر بھی یہ صحیح تمثیل ہونے کے بجائے ایک تمثیلی نظم ہی کہلائی جا سکتی ہے۔ وہ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک شعریت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پوشکن ایک اعلیٰ تمثیل نگار نہ تھا بلکہ مستند و عظیم شاعر تھا۔

پوشکن کا ہر گیت صنعت کا بہترین نمونہ اور بجائے خود ایک طویل تبصرے کا محتاج ہے۔ بہر حال یہی کہنے پر اکتفا کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ہر شعر عروسِ شعرستان کا حسین زیور ہے۔ پوشکن کا سحر فطری ہے وہ ایک معمولی چیز کو ایک ایسے پُر از شعریت و وجد آفریں انداز میں بیان کرتا ہے جو صرف اسی کا حصہ ہے۔ یہ سحر آفریں تخلیقی قوت پوشکن کا ایجاد کردہ سنگِ پارس تھی۔ جس نے اس کے ہر شعر کو کندن ایسی تابانی بخشی ہے۔

پوشکن کے کلام میں آورد کو بالکل دخل نہیں۔ اس کے اشعار پڑھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے تمام افکار آمد کا نتیجہ ہیں۔ دراصل پشکن کے ہاتھوں میں انتہائے کمال ایک کھلونا تھا جس کے ساتھ وہ ایک عرصے تک کھیلتا رہا۔ اس کے تمام کلام یعنی منظوم بیانات، گیتوں اور غزلوں میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے، جس سے کسی تکلف یا آورد کا پتہ چل سکے۔ زمانے کے بیسیوں انقلاب آئیں، ہزاروں نئے شاعر پیدا ہوں، مگر پوشکن کی عظمت لازوال ہے اور لازوال رہے گی۔

پوشکن نے شاعری کے علاوہ نثر کی طرف بھی توجہ دی۔ اس کی نثر بھی نظم کی طرح بے شمار خوبیوں کی حامل ہے۔ پوشکن نے روس کی ادبی زبان میں بہت سی خوبیوں کا اضافہ کیا۔ اس نے نظم و نثر اور تمثیل و افسانہ نگاری میں بہت سی نئی جدتیں داخل کیں۔ دراصل روس کے موجودہ ادب کی بیشتر خوبیاں اسی زبردست شاعر کی سرگرمیوں کی رہین منت ہیں۔

پوشکن کی ذکاوت متنوع تھی۔ مسائل زندگی کے متعلق تشائم نظریات اکثر اوقات آزادۂ دل انداز کی شکل اختیار کر لیتے تھے جو اٹھارویں صدی میں فرانس کی ذہنی خصوصیت سے مشابہت رکھتا ہے۔ بحیثیت مجموعی پوشکن، دوستوویسکی کے الفاظ میں ''ایک جامع روح وفکر کا مالک تھا''

پوشکن کی ادبی خدمات مجملاً یہ ہیں کہ اس نے روسی زبان کا بنظرِ امعان مطالعہ کرنے کے بعد اپنی ذکاوت اور صنعت سے اس میں چار چاند لگا دیے۔ اظہار کی زبردست قوت، شیریں بیانی، سلیس زبان، شگفتگی اور مرصع عبارت، یہ ہیں اس کی تحریر کی چند نمایاں خوبیاں۔۔

اس نمبر میں اس کا ایک افسانہ ''حکم کی بیگم'' شامل کیا جا رہا ہے۔ یہ روس کے رومانی ادب میں بہت

بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ آرٹ کے نقطۂ نگاہ سے یہ افسانہ تمام قسم کے فنی عیوب سے پاک ہے۔ اس میں پوشکن کی ذکاوت کے دونوں پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ اس میں مغربی سپرٹ اور سرزمین روس سے گہری محبت جھلک لیتی ہے، یہ خیالی داستان پوشکن کی زبردست قوتِ متخیلہ پر شاہد ہے۔ گو اس فسانے کا نفسِ مضمون از حد خیالی ہے مگر اس کے باوصف اس میں ایسے نفسیاتی عناصر موجود ہیں جو اسے حقیقت کے قریب لے جاتے ہیں۔ کہانی کا عقبی منظر حقیقت نما ہے جو الگزنڈر دوئم کے عہد کی اعلیٰ سوسائٹی کی بڑی صاف تصویر پیش کرتا ہے۔ بوڑھی بیگم اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی کلچر کو ظاہر کرتی ہے۔

۱۰ فروری ۱۸۳۷ء کو پوشکن ایک ڈوئل لڑتے ہوئے مہلک طور پر زخمی ہوا اور دو دن کے بعد مر گیا۔

لیئر منطوف نے اس کی موت پر مندرجہ ذیل اشعار رقم کیے جو بہت مشہور ہیں:

خاموش ہو گئیں شیریں راگنیاں!

اُن کی آخری گونج بھی مفقود ہو گئی!!

اس کی آرام گاہ تنگ و تار ہے۔

مغنّی کے لب سی دیے گئے ہیں!!!

نکولائی گوگل

۱۸۳۰ء سے روسی ادب میں رومان نگاری اور ناول نویسی نے خوب زور پکڑا۔ ایسے بے شمار ادیب پیدا ہوئے جنہوں نے مغربی مصنفین کی نقالی کی۔ کچھ بھی ہو مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان لوگوں نے زندگی اور روسی مناظر کی تصویر کشی کرنے کی کامیاب سعی کی۔ اسی عصر میں روس کے ادبی پردے پر گوگل نمودار ہوتا ہے جس نے اپنے زمانے کی ادبی سرگرمیوں میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لیا اور اپنی زبردست ذہانت و ذکاوت سے ایک ایسے سکول کی بنیاد ڈالی جو روسی ادب میں ہمیشہ قائم رہے گا۔

نکوس ویسلی وچ گوگل انووسکی، پولتاوا میں ۱۹ مارچ ۱۸۰۹ء کو پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم ایک کتب خانے کے محافظ سے حاصل کی۔ ۱۸۲۱ء میں وہ ایک سکول میں داخل ہوا جوان ہی دنوں کھلا تھا۔ اس تعلیم گاہ میں گوگل نے سوائے ڈرائنگ کے اور کچھ نہ سیکھا مگر اس نے ادب کا کافی مطالعہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سکول میں اس کے بینچ کے دراز میں قریب قریب ہر روسی شاعر کا دیوان پڑا ہوتا تھا۔ ۱۸۲۸ء میں اس نے اپنا نصاب ختم کیا اور ۱۸۲۹ء میں پیٹرزبرگ جا کر کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہو گیا۔ مگر اس نے

اس ملازمت کو فوراً ہی چھوڑ دیا اور باہر سیر و سیاحت کے لیے چلا گیا۔ کچھ عرصہ ادھر اُدھر گھومنے کے بعد وہ پھر پیٹرز برگ آیا اور ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں اس نے تھیٹر میں داخل ہونا چاہا مگر ناکام رہا۔ تھوڑے عرصے تک وہ ایک سکول میں روسی ادب اور روسی تاریخ پڑھاتا رہا مگر آخر کار اس نے یہ سب کچھ چھوڑ کر ادب کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ وہ ۱۸۵۲ء میں ایک مہلک بیماری میں مبتلا رہ کر وفات پا گیا۔

گوگل کی مشہور تصانیف یہ ہیں:

E'venings on a Farm Near Dikonka Mirgorod, Arabesgues, The Portrait, The Revisor (Or The Inspector General), The Greatcoat, The Dead Souls.

Evenings اور Mirgorod کا بیشتر حصہ رومانی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اول الذکر کتاب ہنسی اور مذاق سے معمور ہے۔ اس میں مصنف دنیا کو بھول کر خوشگوار فضا تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ ان ہر دو تصانیف میں گوگل نے اپنا کوئی ذاتی مشاہدہ یا اپنا تخلیق کردہ خیال پیش نہیں کیا۔ اس نے ان کے اوراق میں صرف ان چیزوں کو قلم بند کیا ہے جو اس نے اپنے دادا یا دوسرے لوگوں کی زبانی سُنی تھیں۔ مگر اس نے ان قصے کہانیوں کو بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کی تحریر نہایت مرصع اور شگفتہ ہے۔ ان دو تصانیف میں ہم موسیقی کا عنصر بدرجہ اتم موجود دیکھتے ہیں۔

اسی قسم کی مرصع اور شستہ نثر گوگل کی رومان Taras Bulba میں بھی پائی جاتی ہے جو Mirgorod کا ایک افسانہ ہے۔

Revisor ایک طنزیہ کامیڈی ہے۔ گاؤں کے بدکردار پولیس افسروں کو اطلاع ملتی ہے کہ انسپکٹر جنرل ان کے گاؤں میں خفیہ طور پر آ رہا ہے۔ غلطی سے یہ لوگ ایک روسی خیلتا کوف کو انسپکٹر جنرل سمجھ کر اس کی بہت خاطر تواضع کرتے ہیں۔ اسے دعوتیں دیتے ہیں، غرضیکہ خیلتا کوف اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان جاہل افسروں کی جیبیں خالی کر کے بھاگ جاتا ہے۔ اس ڈرامے کا پردہ افتتاحیہ اس اطلاع پر گرتا ہے کہ انسپکٹر جنرل صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

روسی ڈراموں میں یہ کامیڈی بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ گوگل نے اس کی تخلیق میں بڑی فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے کرداروں میں زندگی ہے۔ مکالمہ نہایت اچھا ہے۔ ہر لفظ مزاح کی چاشنی میں ڈوبا ہوا ہے۔ گوگل نے لکھا ہے "میں اپنی اس کامیڈی میں روس کے تمام عیوب بیان کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" یہ

حقیقت ہے کہ گوگل اپنے اس ارادے میں پوری طرح کامیاب ہوا ہے۔

یہ کامیڈی لکھنے کے فوراً بعد وہ اطالیہ چلا گیا۔ یہاں رہ کر اس نے اپنا شاہکار ناول The Dead Souls قلم بند کیا۔ یہ ناول جسے گوگل ''رزمیہ داستان'' کہتا ہے، پلاٹ اور عشقیہ کہانی سے بالکل خالی ہے مگر اس کے باوصف یہ یورپی لٹریچر میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ گوگل نے اس ناول کی تصنیف و تخلیق پر بہت وقت صرف کیا۔ بعد ازاں اس نے اس کو بڑھا کر روسی ''ڈیوائن کامیڈی'' کی شکل میں تبدیل کرنا چاہا مگر وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

گوگل اس تصنیف میں اپنے اس تیز احساس کو پیش کرتا ہے جو صرف عیوب، بھدے پن اور پستی کو دیکھتا تھا۔ ہماری قلیل عرصے کی موجودگی کی ماندی و خستگی کے پس پردہ وہ کسی ناقابل فہم شیطانی قوت کو جلوہ گر دیکھتا ہے۔ فی الحقیقت گوگل کا آرٹ اس قوت سے (جس کی موجودگی وہ نہ صرف اپنے گرد و نواح کی دنیا میں بلکہ خود اپنے وجود میں محسوس کرتا تھا۔) ایک مسلسل جنگ کی صورت اختیار کر کے رہ گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے اپنی ''منتقم حقیقت نگاری'' اور اپنے ظالم قہقہوں سے اس قوت سے برسر پیکار دیکھتے ہیں۔

Dead Souls کا ہیرو چچی کوف اخلاقی غیر ذمہ داری اور عامیانہ خود اعتمادی کا اجتماع ہے۔ وہ غلام (یعنی ''مردہ روحیں'') خرید کرنے کے لئے ایک زمیندار سے دوسرے زمیندار کے پاس جاتا ہے کہ انہیں بنک میں گروی رکھ کر روپیہ حاصل کرے اور اس طرح چٹکی بجانے کے عرصے میں دولت مند ہو جائے۔ اس تجارت کے دوران میں وہ ہر نوعیت کے آدمیوں سے ملتا ہے جن کی مدد سے گوگل نے اس کتاب میں اس زندگی کا ایک بہت بڑا منظر تیار کیا ہے، جس کو اس کی آنکھوں نے اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ یعنی فواحش، پستی اور اوسط درجہ زندگی کی ایک تصویر۔ یہ ناول انسانی غلاظت کی عظیم ترین رزمیہ داستان ہے۔

اکثر اندروں بیں لوگوں کی طرح گوگل اپنے نقائص سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی ادبی مخلوق دراصل ایک مسلسل کوشش تھی کہ وہ ان نقائص کا مظاہرہ کرے اور ان کا تمسخر اڑائے۔ مگر وہ اس کے ساتھ ہی اپنی فنی خوبیوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

گوگل پہلا شخص تھا، جس نے زار کی ظالمانہ حکومت کے مظالم کو عوام سے روشناس کرایا Cloak میں کا ہیرو جو ایک معمولی ملازم ہے، حکومت کی سنگدلانہ بربریت کے بوجھ تلے نہ صرف اپنے وقار بلکہ اپنے

تشخص کو کھو دیتا ہے۔ یہ کردار گوگل کے دیگر تخلیق کردہ کرداروں میں بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں تعدیہ (Qn Ection) بدرجہ اتم موجود ہے۔

گوگل مذہبی سودا کے حملے کی تاب نہ لاکر ۴۳ سال کی عمر میں اس جہاں سے کوچ کر گیا۔

طالسطائی

کاؤنٹ لیو طالسطائی، روس کا عظیم الشان مفکر، انشا پرداز، تمثیل نگار اور خلائق دوست انسان ۱۸۲۸ء میں اپنی جاگیر یاسنایا پولیانا میں ''طولا'' کے شہر کے پاس پیدا ہوا۔ پیدائش کے فوراً بعد ہی اس کی ماں فوت ہوگئی، اور وہ ابھی نو سال ہی کا تھا کہ اس کا باپ بھی کوچ کر گیا۔ چنانچہ اس کی پرورش ایک دور دراز کی رشتہ دار عورت کے ہاتھوں ہوئی۔ اس بڑھیا کی شفقت و محبت نے ہونہار طالسطائی کے کردار واطوار پر گہرا اثر کیا۔ گھر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طالسطائی قازان کی یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اس تعلیم گاہ میں چند سال مختلف نصابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس یونیورسٹی کو چھوڑ کر سینٹ پیٹرز برگ میں چلا گیا۔ جہاں وہ سماجی زندگی سے خوب لطف اندوز ہوا۔ اس کے بڑے بھائی نکولس نے طالسطائی کو اس طرح رنگینیوں میں زندگی بسر کرتا دیکھ کر اسے مجبور کیا کہ وہ فوج میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ سینٹ پیٹرز برگ کو چھوڑ کر فوج میں داخل ہونا طالسطائی کی کتاب حیات میں ایک نئے باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ باہر کے دلکش مناظر تازگی بخش اور پُر از مہمات فضا اور دیہاتی زندگی نے نوجوان طالسطائی کی خوب ربوبیت کی۔ اسی حسین فضا میں اس نے اپنا قلم اٹھایا Childhood جو ایک لحاظ سے اس کے سوانح حیات کا اجتماع ہے، اس کے قلم کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد وہ Boyhood & Youth ضبط تحریر میں لایا۔

۱۸۵۲ء میں طالسطائی کاکیش کو خیر باد کہہ کر کریمیا چلا گیا اور ''سی بسٹو پول'' میں ۱۸۵۴ء تک فوجی ملازمت میں رہا۔ Tales of Sebastopol میں اس نے اپنی صناعانہ قابلیتوں اور نفسیاتی عطیات کا بڑی شان سے مظاہرہ کیا۔ اس تصنیف نے اسے ادب کی صفِ اول میں لاکر کھڑا کر دیا۔ یہ کتاب شائع کرانے کے بعد وہ کچھ عرصے کے لئے یورپ چلا گیا۔ جہاں وہ تعلیم کی تھیوری کا مطالعہ کرتا رہا۔ ۱۸۶۰ء میں اس کا بڑا بھائی نکولس فوت ہوگیا۔ اس المناک واقعہ سے بہت متاثر ہوا۔ گھر واپس آنے پر اس نے اپنی جاگیر میں دیہاتی بچوں کے طریقۂ تعلیم میں اپنے نظریات کو داخل کرنے کی سعی کی۔

۱۸۶۲ء میں اس نے شادی کی اور جاگیر کے انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

۱۸۷۰ء کے آخری زمانے میں طالسطائی کی زندگی میں ایک زبردست ہیجان پیدا ہوا۔ وہ اپنی زندگی میں تسکین قلب کا سامان نہ پا سکا، چنانچہ طالسطائی صناع، طالسطائی واعظ میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن چونکہ وہ خود میں اپنے خاندان سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی ہمت نہ پاتا تھا، اس لیے اس نے کسانوں میں رہ کر اخلاقیات کی تعلیم دینا شروع کی۔

جس قدر روس کی سیاسی زندگی ابتر ہو رہی تھی، اسی قدر طالسطائی کی ''مثالیت'' اور اس کے نظریات روشن سے روشن تر ہو رہے تھے۔ انجام کار طالسطائی نے خود کو ایک نئے عقیدے کے بانی کی حیثیت میں پیش کیا۔ اس چیز نے اسے دنیا کے عظیم ترین مفکروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اس کا آئیڈیل پاکیزہ اور سادہ زندگی تھا۔ اس کا مسلک صلح کُل تھا۔ وہ دیہاتی زندگی اور دیہاتیوں کی تعلیم کا زبردست حامی تھا۔ چنانچہ عالم پیری میں اس نے چھوٹے چھوٹے کسان بچوں کو تربیت دینا اپنے فرائض میں داخل کر لیا تھا۔

طالسطائی کے مذہبی خیالات کا منتہائے ارتقاء ۱۹۱۰ء میں وقوع پذیر ہوا۔ جب وہ گھر بار کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر کسی نامعلوم مستقبل کے راستے پر گامزن ہوا اور ایک غیر معروف ریلوے سٹیشن پر بے جان پایا گیا۔ اس کی موت پر تمام رُوس نے ماتم کیا۔ اس وقت ایک مشہور روسی نقاد نے لکھا:

> ''تمام دنیا طالسطائی کی مداح تھی۔ مگر اس کے بہت کم پیرو تھے۔ اس کے اپنے خاندان میں بہت کم افراد اس کے نظریات کے عامل تھے۔ ہر شخص اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان تھا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن سے وہ نفرت کرتا، اسے پیار کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اشتراکی، لبرل، مزدور، علمی طبقے کے افراد غرض یہ کہ ہر ایک اس کی عظمت کا قائل تھا۔ اس لیے کہ وہ اس میں دنیا کی بیداری کا زبردست عنصر پاتے تھے''۔

روس، طالسطائی کی گراں پایہ ہستی پر جس قدر بھی فخر کرے بجا ہے۔ یہی وہ ذات تھی جس نے زار کی باجبروت شخصی حکومت کے ہوتے ہوئے اس وقت حریت و آزادی کا علم بلند کیا، جب اہلِ روس نے غلامی ہی کو مدارِ حیات تصور کر کے حکمرانوں کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا تھا۔ آج دنیا میں جہاں کہیں آزادی کی رُوح پائی جاتی ہے وہ کچھ نہ کچھ اسی مفکر اور حریت نواز شخصیت کی تعلیم کی شرمندۂ احسان ہے۔

طالسطائی کی نسبت مسٹر میتھیو آرنلڈ کی رائے ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنی روزی کماتا تھا۔وہ دوسرے مزدوروں کی طرح نصف فصل بطور اجرت لینے پر مزدوری کیا کرتا تھا۔وہ جسمانی طور پر نہایت تنومند تھا۔وہ جوتے بنانا بھی جانتا تھا۔

طالسطائی کا عقیدہ تھا کہ انسان اپنی اصلاح کا فطری طور پر خود ذمہ دار ہے۔وہ کسی کی دولت پر نازاں نہ ہوتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ امیر لوگ غریبوں کے حق چھین کر متمول ہو جاتے ہیں۔وہ مزدوروں کو قرار واقعی اجرت نہیں دیتے اور ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے گلچھرے اڑاتے ہیں۔وہ کہتا تھا کہ کسی کو دولت اکیلے ہی صرف کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ اس میں سے ناداروں کو حصہ ملنا چاہیے۔اس کی خواہش تھی کہ لوگ تضیع اوقات کے بجائے فنون جنگ سیکھیں تا کہ غیر ملکی حملہ آوروں سے ملک کی حفاظت کر سکیں۔طالسطائی کے زریں اصول بھلا دینے کے لائق نہیں۔وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کارآمد اور بیش قیمت بن جاتی ہے، جب اسے دوسروں کی خدمت میں بسر کیا جائے۔طالسطائی نے زندگی کا ہر ایک پہلو نہایت صراحت سے کھول کر رکھ دیا ہے۔یہی نہیں بلکہ ہر قول کو عملی صورت میں پیش کیا ہے۔

''Childhood Boyhood and Youth'' طالسطائی کی اوائلی تصنیف میں، ہم اس کی نیچر کے دو پہلو دیکھتے ہیں۔

اوّلاً۔حیوانوں کی زندگی سے محبت۔

ثانیاً۔ایک اعلیٰ اخلاقی سٹینڈرڈ کی جستجو۔یہ دو اصول جن میں کافی بُعد ہے طالسطائی کی عام زندگی میں ایک دوسرے کے متوازی نظر آتے ہیں۔بعض اوقات ان میں تصادم بھی ہو جاتا ہے۔اس تصنیف میں طالسطائی نے اپنے بچپن لڑکپن اور شباب کے دلچسپ واقعات نہایت فن کاری سے بیان کیے ہیں۔اس کتاب میں ''عشق ومحبت'' کے عنوان سے ایک باب بہت دلچسپ ہے۔ہم اس باب کی چند افتتاحیہ سطور کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

''میں اس موسم سرما میں یہ عشق ومحبت کے جھگڑوں میں مصروف رہا۔ایک دفعہ میں ایک نہایت خوب صورت خاتون کے دامِ حسن میں گرفتار ہو گیا۔یہ لڑکی مدرسہء شہسواری میں تعلیم حاصل کرتی تھی اور منگل اور جمعہ کے روز گھوڑے پر سوار ہو کر سکول کو جایا کرتی تھی۔میں ان دنوں اس کی جھلک دیکھنے کے لیے سکول چلا جاتا لیکن ہمیشہ اس بات کا خوف رہتا کہ مُبادا وہ مجھے دیکھ لے چنانچہ اسی خوف کی وجہ سے میں ہمیشہ دور کھڑا رہتا اور جس

راستے سے اس کا گزر ہوتا وہاں سے فی الفور ہٹ جاتا۔ اگر وہ اتفاقیہ میرے قریب سے گزرتی اور مجھ پر نظر ڈالتی تو میں بہت بے پروائی سے منہ موڑ لیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مجھے اچھی طرح سے اس کا رخ زیبا دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اب تک معلوم نہیں ہے کہ وہ لڑکی واقعی خوبصورت تھی یا نہیں۔ ڈبکو اس لڑکی کو جانتا تھا۔ ایک روز میں مدرسہ شاہ سواری میں دربان کی اوٹ لے کر چھپا کھڑا تھا کہ ڈبکو بھی وہاں آ پہنچا۔ اسے متری کی زبانی اس لڑکی سے میرے عشق کا حال معلوم ہو چکا تھا اس لیے اس نے مجھ سے کہا۔ ''چلو میں اس سے تمہارا تعارف کرادوں'' میں اس کی یہ بات سن کر کانپ اٹھا اور اتنا ڈرا کہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور آیندہ اس بات سے مجھے مدرسے جاتے خوف معلوم ہوتا کہ کہیں ڈبکو نے اس لڑکی سے میرا ذکر نہ کر دیا ہو۔ میں نے پھر کبھی مدرسے کے اندر داخل ہونا تو کجا دربان کے قریب پہنچنے کی بھی جرات نہ کی کہ شاید اس لڑکی سے دوچار ہونا پڑے۔''

باقی کتاب بھی اسی قسم کے دلچسپ واقعات سے پر ہے۔

War And Peace طالسطائی کی سب سے بلند مرتبہ تصنیف ہے۔ یہ محض ناول ہی نہیں بلکہ ایک رزمیہ داستان ہے۔ پر از زندگی رومان سے معمور۔ یہ ہجوم کی افراط وتفریط میں ایک زبردست انفرادی مطالعہ ہے۔ نپولین کی جنگی سرگرمیوں کے زمانے کے متعلق مختلف لوگوں کے آرا و افکار اور اس زمانے میں بہت سے خاندانوں کی تاریخ زندگی۔ یہ ہے ''جنگ اور امن'' کا نفسِ مضمون۔ تھیکرے کی تصنیف Vanity Fair اس ناول سے ایک گونہ مماثلت رکھتی ہے مگر عام کیرکٹر کے اعتبار سے ''جنگ اور امن'' اور اس کتاب میں کوئی مطابقت نہیں، اس لیے کہ نفسیات اور تخیل کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

''جنگ اور امن'' کے اوراق کا مطالعہ کرتے وقت قاری کی نظروں کے سامنے بے شمار مختلف النوع کردار گزر جاتے ہیں۔ اینڈری، وولکونسکی، نکولس، روستوف اور پیری بیزوکوف، ہمیں طالسطائی کی بہت سے مختلف پہلو رکھنے والی نیچر کی یاد دلاتے ہیں۔ گو صنفِ نازک کے معاملے میں طالسطائی کا قلم اپنے حریف افسانہ نگار تورگنیف کے قلم سے کسی حد تک کمزور تھا۔ مگر پھر بھی نتاشا میریا اور دیگر عورتوں کے کردار نہایت دلکش اور حقیقت نما ہیں۔

اس داستان کا ہیرو نپولین جیسا کوئی بڑا آدمی نہیں بلکہ ایک جاہل کسان پلاتن کیراتیف ہے، جسے

پیری بیز وکوف فرانسی فوج کی حراست میں پہلی بار ملتا ہے۔اس پلاتون کیراتوف میں طالسطائی اپنے تمام آئیڈیل جمع کر دیتا ہے یعنی دنیا سے حد درجہ محبت، بدیوں سے پرہیز وغیرہ وغیرہ۔پیری پلاتون کی پاکیزہ روح سے بہت متاثر ہوتا ہے۔اور تمام عمران اصولوں کا پابند رہتا ہے۔پیری کی زندگی کا ارتقا ہمیں خود طالسطائی کی زندگی کے ارتقا کی یاد دلاتا ہے۔

تاریخ سے طالسطائی کا سلوک بہت عجیب ہے۔وہ تاریخ کی عظیم الشان شخصیتوں مثلاً نپولین اور الگزنڈر اوّل کے کارناموں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔اس کے بجائے وہ یہ خیال پیش کرتا ہے کہ تاریخی عمل، عوام کی خوابیدہ حرکات کا نتیجہ ہوتا ہے۔

''جنگ اور امن'' کا اخلاقی تخیل طالسطائی کی دوسری تصنیف Anna Krenına میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔اس کتاب کے اوراق پر طالسطائی سینٹ پیٹرزبرگ کے دو اعلیٰ خاندانوں کی زندگی کی تصویر کھینچتا ہے۔اینا ابھی نوعمر لڑکی ہوتی ہے کہ وہ کرینن سے شادی کر لیتی ہے۔ شادی پر علاوہ دولت کے اسے سماجی زندگی میں ایک اچھی پوزیشن حاصل ہو جاتی ہے۔لیکن چند سال گزرنے پر وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی زندگی ناقابل برداشت ہے۔اب وہ ایک متوسط الحال نوجوان افسر درونسکی سے بدیں خیال محبت کرتی ہے کہ وہ اپنی پہلی زندگی سے چھٹکارا حاصل کرے۔مگر وہ ایسا کرنے کی ہمت خود میں نہ پا کر چلتی گاڑی کے نیچے آ کر خودکشی کر لیتی ہے۔

اینا کی داستان کے عین ساتھ ساتھ طالسطائی ایک دوسرے خاندان کی مسرت بیان کرتا ہے۔اس خاندان کا ایک ممتاز فرد لینن ''جنگ اور امن'' کے پیری کی طرح اخلاقی ارتقا سے گزر کر یہ نتیجہ برآمد کرتا ہے کہ لگاتار محنت و مشقت اور نیچرل ماحول ہی ایسی دو چیزیں ہیں جن کی کسی انسان کو خواہش کرنی چاہیے۔اس کتاب کا مواد انجیل سے مستعار لیا گیا ہے یعنی خدا نیچر کا قانون ہے اور جو شخص نیچر کے خلاف چلے گا وہ سزا کا مستوجب ہوگا۔چنانچہ اینا اس کی مثال ہے۔

طالسطائی کے مذہبی خیالات میں ہیجان پیدا ہونے کے بعد ہم اس کی آئندہ تصانیف میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھتے ہیں۔ان میں قنوطیت غالب نظر آتی ہے۔زندگی کی وہ پہلی سی مسرت ان میں بالکل مفقود ہے۔اب طالسطائی کا یہ خیال ہوتا ہے کہ کلچر انسانی نیچر کی خرابیوں کا نتیجہ ہے اور یہ کہ زندگی کا اصل مقصد صرف ایثار اور محبت ہے۔طالسطائی، معلم اخلاقیات کا چغہ اتار کر خود کو آرٹسٹ کی حیثیت میں پیش کرتا ہے۔

The Deat of Ivan Ilyich ایک ایسے شخص کی المیہ داستان ہے جو جانتا ہے کہ اسے مرنا ہے۔ وہ دنیا میں اکیلا ہوتا ہے۔ چونکہ کوئی شخص اس سے ہمدردی کا اظہار نہیں کرتا اس لیے وہ بخوبی سمجھتا ہے کہ وہ دنیا میں محض ایک ناکارہ اور غیر ضروری انسان ہے۔ موت سے عین پہلے اس کے تاریک ماحول میں روشنی کی ایک شعاع داخل ہوتی ہے اور وہ دوسری زندگی پر ایمان لاتے ہوئے بڑی خوشی سے خود کو فرشتہء اجل کے حوالے کر دیتا ہے۔

The Powor of Darkness ایک بہت ہیبت ناک تمثیل ہے۔ اس کا دوسر ڈرامہ Frirnds of Civilization علمی طبقے پر ایک طنز ہے۔

Kruotzer Sonata، اس افسانے کا مضمون ''محبت اور خاندان'' ہے۔ اس میں طالسطائی ایک مذہبی جنونی کی طرح نہ صرف خاندان اور محبت سے نفرت کا اظہار کرتا ہے بلکہ عورت کو بھی منفور ٹھہراتا ہے۔ اس کا آئیڈیل یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی لعنتوں سے بچنے کے لیے انتہائی زہد واتقا کی ضرورت ہے۔

Father Sergious کا مضمون بھی اس افسانے جیسا ہے۔ Ressarrection طالسطائی کا آخری ناول ہے۔ اس میں وہ اپنے عقائد کی تبلیغ کا زبردست مظاہرہ کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی پرانی صناعانہ چاشنی بھی پوری طرح برقرار ہے۔ اس کتاب میں ریاست، قوانین، کلیسا اور مصلح اخلاق کی بڑی گرم جوشی سے مخالفت ہے۔

نخلیو دوف ایک صاحب دولت آدمی عدالت کی کرسی پر بیٹھا اپنے سامنے کھڑی ہوئی مجرم لڑکی کو پہچان لیتا ہے۔ یہ کسی زمانے میں نخلیو دوف کے شہوانی جذبات کا شکار ہوئی تھی۔ ضمیر کی ملامت سے متاثر ہو کر وہ سب کچھ چھوڑ کر اس لڑکی کے ساتھ سائبیریا میں چلا جاتا ہے، جہاں اسے جلاوطنی کے ایام کاٹنے ہوتے ہیں۔ لڑکی نخلیو دوف کی شادی اور معافی کی درخواست کو رد کر دیتی ہے اور اپنی قید کے ایام پورا کرنے کے بعد کسی اور شخص سے شادی کر لیتی ہے لیکن اس دوران میں نخلیو دوف کی ندامت، محبت اور ایثار اسے نجات کا راستہ بتا دیتے ہیں۔

طالسطائی نے اپنے اوائل عمر کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ جن میں قازان یونیورسٹی کی تعلیم، کاشت کی معلومات، استنبول کی فوجی مشاقی کا نہایت وضاحت سے ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی عیاشیوں، اخلاقی لغزشوں، اپنے نامناسب طیش، ناجائز عادات، کھیل تماشوں کی شرکت، ناحق کے

جھگڑے، فساد اور اپنے ذوق مصوری کا نہایت خندہ پیشانی سے اعتراف کیا ہے اور آخر میں بتایا ہے کہ کس طرح وہ ذرائع ہاتھ آئے جن سے اس کے ضمیر نے کسبِ ضیا اور روح نے لطافت حاصل کی اور اپنی مستور و محجوب حقیقتوں سے واقف ہو گیا، جس کے بعد کامیاب زندگی کا دور شروع ہوتا ہے۔

طالسطائی نے ان ناولوں کے علاوہ جس کا اوپر ذکر کیا ہے، بے شمار مقالے اور افسانے تحریر کیے ہیں جو سب کے سب مفید ہیں۔ ہم یہاں اس کے دو افسانوں کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

طالسطائی کی ادبی اور مذہبی سرگرمیوں کے لیے ''تعارف'' کے محدود اوراق متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم کوشش کریں گے کہ فرصتِ آئندہ میں روس کے اس عظیم الشان وہبی مصور اور زبردست صناع کی تصانیف پر ایک زبردست تبصرہ اس رسالے میں شائع کرائیں۔ ان شاء اللہ۔

دوستووسکی

دوستووسکی کی ادبی سرگرمیوں کی تفصیل ایک مستقل کتاب کی محتاج ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں ایک نہایت ہی مختصر تبصرہ درج کرتے ہیں، جو اختصار کے باوصف اس روسی انشا پرداز پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالے گا۔

انیسویں صدی کے آخری نصف میں روسی ادب کے پردے پر دو عظیم الشان مفکر نمودار ہوتے ہیں، جن کی شہرت روس کی سرحدوں سے گزرتی ہوئی، دنیا کے ہر گوشے میں پھیل جاتی ہے۔ ہماری مراد لیو طالسطائی اور تھیوڈر دوستووسکی سے ہے۔ نفسیات، کیرکٹر، زندگی اور طرز انشا کے لحاظ سے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ان کے افکار میں اگر کچھ تطابق ہے تو وہ یہ ہے کہ دونوں کا مطمح نظر ایک ایسے راستے کی تلاش ہے جو انسان کو ایک اعلیٰ اخلاقی زندگی کی طرف لے جائے۔ فی الحقیقت طالسطائی اور دوستو وسکی دونوں مختلف راستوں سے ایک ہی منزل مقصود کی طرف گام زن تھے۔ دونوں کے افکار اجتماعی طور پر روسی کیرکٹر کی ایک واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔

ان دو انشا پردازوں کی تصانیف، ان کی زندگیوں سے اس قدر گہرے طور پر وابستہ ہیں، ان کی تحریروں میں ان کے تجربات و مشاہدات کا عکس اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے کے بغیر ان کے افکار کا سمجھنا قریب قریب ناممکن ہے۔

لیو طالسطائی نے اپنے بچپن کے ایام ایک نہایت ہی خوش گوار ماحول میں بسر کیے۔ اس کی جوانی

فوجی سرگرمیوں میں بسر ہوئی۔اس کا خاندان بہت متمول تھا لیکن بچپن ہی میں اس کے دماغ میں اس سوال نے جگہ پکڑلی ''زندگی کیا ہے اور انسان کو اچھی زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیے''؟ چنانچہ دولت کے خلاف اس کے ضمیر کی کشمکش،اس کی زندگی کا ایک اہم ترین جزو ہے۔اس کے بالکل برعکس دوستووسکی کی زندگی غیر مختتم مصائب ونوائب کا اجتماع تھی۔وہ غریبوں کے گھر پیدا ہوا اور تادم آخر مفلسی کے پنجوں میں جکڑا رہا۔چونکہ اس نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام غربت زدہ ماحول میں بسر کیے،اس لیے وہ غربا کی تکالیف اور ان کی ضروریات سے آگاہ تھا۔وہ بے گناہ پکڑا گیا اور اسے تین سال سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں قید میں رہنا پڑا۔ان تکالیف نے دوستووسکی کے ذہن پر بہت اثر کیا اور اسے انسانی زندگی کے عمیق ترین نفسیات کا عکاس بنا دیا۔طالسطائی خیرات دیا کرتا تھا لیکن اس کے برعکس دوستووسکی خیرات لیا کرتا تھا۔طالسطائی سادہ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔دوستووسکی نے نہ صرف سادہ بلکہ نہایت ہی سادہ فاقہ مست زندگی بسر کی۔لیکن ان دونوں کے دلوں میں ایک ہی جذبہ موجزن تھا۔وہ دونوں خدا کی پادشاہت تک رسائی حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔

تھیوڈور دوستووسکی ۱۸۲۱ء میں ماسکو کے ایک معمولی ہسپتال میں پیدا ہوا اور ایسے خاندان میں جو بہت ہی مفلس تھا۔چنانچہ اسے تادم آخر افلاس کی زندگی بسر کرنا پڑی۔سکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ انجینئرنگ کالج میں داخل ہوا۔گو اس کی تعلیم ریاضیات اور سائنس میں ہوئی تھی۔اس نے انشا پردازی کو اپنا پیشہ بنانے کا ارادہ کیا۔چنانچہ اس نے اپنی تعلیم کے دوران ہی میں ایک افسانہ Poor Folk لکھا جو ادبی حلقوں میں بنظر استحسان دیکھا گیا۔اس ادبی افسانے کو مشہور شاعر نکرلیوف نے اپنے ادبی رسالے میں جگہ دی۔

۱۸۴۰ء میں یعنی یورپ کی انقلابی تحریک کے بعد سینٹ پیٹرز برگ میں ایک اشترا کی مجلس قائم کی گئی۔دوستووسکی اس حلقے کا رکن بن گیا۔مگر فوراً ہی یہ مجلس خلاف قانون قرار دی گئی اور اس ادارے کے تمام اراکین کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔قیدیوں میں دوستووسکی بھی شامل تھا۔آخر وقت میں جب کہ یہ تمام نوجوان گولی کا نشانہ بنائے جانے والے تھے،زار کے حکم سے ان کے لئے موت کے بجائے تین سال بامشقت قید کی سزا تجویز کی گئی۔یہ دہشت ناک واقعہ اس نے اپنے ایک خط میں بیان کیا ہے جو اس نے سائبیریا جاتے وقت اپنے بھائی کو لکھا تھا:

''ہم نے صلیب کو بوسہ دیا اور اس کے بعد ہمیں وہ قمیصیں پہنائی گئیں جو ہمارا کفن ہونے

والی تھیں ۔ہم میں سے تین موت کے ستون سے باندھ دیئے گئے ۔میں صف میں چھٹا تھا۔ہم تین تین کر کے مارے جانے والے تھے۔اس لئے میری باری لازماً دوسرے تینوں میں تھی ۔میری زندگی اور موت میں صرف چند لمحے باقی تھے ۔اس وقت میرا دل تمھاری اور تمھارے بیوی بچوں کی یاد سے معمور تھا۔میرے عزیز بھائی! ان آخری لمحات میں تمھاری اور صرف تمھاری یاد مجھے ستا رہی تھی۔دفعتاً سپاہیوں کو(جو گولی چلانے والے تھے)واپسی کا حکم ملا اور وہ تینوں جو ستون کے ساتھ بندھے ہوئے تھے کھول دیے گئے۔اس کے بعد ہمیں زار کا فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس میں اس نے ہماری جان بخشی کی تھی ۔اب سزائے موت چار سال کی قید میں تبدیل کردی گئی ہے[1]۔"

دوستو وسکی کے ساتھیوں میں سے ایک سردی اور موت کے لرزے کی تاب نہ لاکر پاگل ہو گیا۔خود دوستو وسکی کی کیفیت جنون سے کچھ کم نہ تھی ۔ان چند لمحوں کی کیفیت اس نے کئی ناولوں میں ضمناً بیان کی ہے۔دراصل دوستو وسکی کا فلسفہء حیات اور اس کے احساسات اس ہولناک واقعے کے بعد کبھی ایک طبعی انسان کے سے نہیں ہو سکتے تھے۔

دوستو وسکی نے چار سال سائبیریا کے قید خانے میں بسر کیے۔زندان کی اس زندگی کو اس نے نہایت ''بے دردی'' سے اپنی تصنیف Czime and Punishment میں بیان کیا ہے۔۱۸۵۹ء میں وہ سینٹ پیٹرز برگ واپس آیا اور آتے ہی ایک سال میں Insulted & Inured لکھی۔اس کے بعد اس نے اپنے بھائی میخائیل کی شرکت میں ایک رسالہ'' زمانہ'' جاری کیا۔اس میں اس۔ ز اپنی قید کے حالات House of the dead کے عنوان سے شائع کرائے۔اب وہ کافی مشہور ہو چکا تھا اور اس کا رسالہ بھی ہر دل عزیز ہو گیا تھا۔لیکن بدقسمتی سے یہ رسالہ ۱۸۶۳ء میں ریاست کے حکم سے بند کر دیا گیا۔اس ضبطی کے بعد اس نے Epoch کے نام سے ایک اور رسالہ نکالا ۔مگر یہ بھی ضبط کر لیا گیا۔چنانچہ دوستو وسکی قرض خواہوں کے تقاضوں سے تنگ آ کر یورپ بھاگ گیا،مگر اسی سال پھر روس واپس چلا آیا اور crime& punishment لکھ کر اپنے قرضے کا بوجھ ہلکا کیا۔پیٹرز برگ میں اس کی زندگی کے آخری چند سال خوش گوار تھے۔وہ ۱۸۸۱ء میں داعیء اجل کو لبیک کہہ گیا۔

poor folk یعنی دوستو وسکی کے پہلے ناول میں ہم وہ جوئے فکر دیکھتے ہیں جو بعد ازاں ایک طوفانی سمندر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔اس افسانے کا پلاٹ بہت سادہ ہے۔ایک معمولی کلرک اپنا

جان و دل ایک غریب لڑکی کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ لڑکی اس تنگ حال کلرک کی تاریک فضا میں ایک نورانی شعاع کا کام دیتی ہے۔ اس کی محبت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ جب یہ لڑکی کسی امیر نوجوان سے شادی کر لیتی ہے تو یہ واقعہ اس کے دل میں نفرت و حقارت کے جذبات بالکل پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ انتہائی ایثار اور الفت ظاہر کرتا ہے۔ اس ناول میں دوستوئسکی نے اپنا آئیڈیل پیش کیا ہے یعنی مظلوموں اور دھتکارے ہوئے انسانوں سے ہمدردی۔ یہ آئیڈیل اس کے تمام ناولوں میں بیان کیا گیا ہے۔

White Nights یہ افسانہ گو یکسر غم میں ڈوبا ہوا ہے، مگر فنی نقطۂ نظر سے کافی بلند ہے۔ یہ سینٹ پیٹر زبرگ کے تاریک ماحول میں محبت کی ایک دل کش سٹڈی ہے۔

The House of The Dead، اس ناول میں دوستوئسکی نے اپنی قید کے ایام کے مشاہدات و تجربات بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب روسی ادب میں ایک نہایت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اس کے اوراق میں دوستوئسکی انسانی روح کی اتھاہ گہرائیوں میں نفوذ کر کے بدترین مجرموں کے سینوں میں خدا کا نور تلاش کرتا ہے۔ یہ ناول قیدیوں کی پر از مصائب زندگی کی بھیانک تصاویر کے باوصف رجائیت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

Crime & Punishment غربت زدہ لوگوں کی المناک داستان ہے جو ایک بڑے شہر کی غم ناک فضا میں اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے نفسیات، دوستوئسکی نے انتہائی ہمدردی سے بیان کیے ہیں۔ Crime & Punishment، دوستوئسکی اپنی اس شاہکار تصنیف میں بہت اہم اخلاقی مسائل پیش نظر رکھتا ہے۔

ایک غریب طالب علم راشلنی کوف اپنی بہن اور ماں کی خاطر ایک بوڑھی سود خور عورت کو ہلاک کرتا ہے۔ وہ قتل کرنے سے قبل سوچتا ہے:

> ''اگر نپولین اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ہزار ہا انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے تو کیا وہ اپنی ماں اور بہن کی خاطر ایک فضول اور ناکارہ سود خور عورت کو ہلاک نہیں کر سکتا ہے؟''۔

راشلنی اس مسئلے پر مزید غور نہیں کرتا اور اس بوڑھی عورت کو قتل کر دیتا ہے اور اس طرح انسانی عقائد کو اپنے پیروں تلے روند کر اپنا ایک خاص اخلاقی نظریہ قائم کرتا ہے۔ اصل crisis اس کے دل میں اس

عورت کو قتل کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ خیال کرتا ہے کہ اس نے ''ایک اصول'' کو کچلنے کے بجائے ''ایک عورت'' کو ہلاک کر دیا ہے۔ تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصل ارادے کو عمل میں نہیں لا سکا ہے اور یہ کہ جرم کا ارتکاب آسان ہے مگر اسے ایک نئی زندگی کا سنگ بنیاد بنانا بہت مشکل ہے۔

اس کے ہیرو کے یہ الفاظ ہیں:

''چونکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ اس لیے مجھے یہ حق حاصل نہ تھا کہ میں اس جرم کا مرتکب ہوتا جن لوگوں نے خون بہا کر اپنی زندگی کو فروغ دیا۔ وہ مافوق البشر شخصیتیں تھیں''۔

قتل کے بعد اس روحانی افسانے کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔ راشلنی کوف اپنے استدلال کا اس قدر قائل تھا کہ اس کے دل میں کسی قسم کی پشیمانی یا تصور کا احساس نہ پیدا ہوا۔ لیکن اس کی وجہ سے اس کی روحانی اذیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ اگر وہ خود کو مجرم نہ مانتا تھا تو بالفاظ دیگر اخلاقی قانون اور خیر و شر کا معیار جس کی خاطر اس نے سود خور بڑھیا کو قتل کیا تھا اور جسے وہ اپنی زندگی کا سنگ بنیاد بنانے کا خیال کرتا تھا در اصل ایک خام خیال کے مرادف تھا۔ چنانچہ اس احساس نے اس کے دل میں ایک خلا سا پیدا کر دیا۔ استدلال اور ضمیر کی آواز کے معرکے میں میدان موخر الذکر کے ہاتھ رہا۔ چنانچہ راشلنی کوف نے اپنے ضمیر کی ملامت سے متاثر ہو کر اقبال جرم کر لیا اور زندان کی تکالیف خندہ پیشانی سے قبول کر لیں۔ راشلنی کوف کے اصول کی غلطی Crime & punishmnt کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو شعور اور جذبات کے وہ کیفیات ہیں جو ہر دلیل سے راشلنی کوف کی گمراہیاں عیاں کرتی ہیں۔

Idiot، انسان کی ذہنی دیوانگی کی دلچسپ تصویر ہونے کے علاوہ ایک عجیب و غریب انسان کا کردار پیش کرتی ہے۔ پرنس میشکن (مجذوب) اس ناول کا ہیرو، ایک نہایت ہی سادہ لوح، نرم دل اور حساس انسان ہے جو ہر زندہ چیز کا پرستار ہے۔ یہ ناول زندگی اور انسانی فطرت کی مصوری کے اعتبار سے دوستو وسکی کا بہترین ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔

The Possessed or Devils ایک نہایت ہی الجھے ہوئے پلاٹ کا ناول ہے۔ جس میں انقلابی حلقوں کی سرگرمیاں بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ دوستو وسکی روس کی مقدس مشن یعنی سیاسیات اور مذہب کا قائل تھا۔ اسے اشتراکیت سے اس لیے نفرت تھی کہ وہ اس میں مذہبی اصول اور اخلاقی

مادیت کا فقدان دیکھتا تھا۔

کریلوف (اس ناول کا ہیرو) ایک انقلابی پارٹی کا سردار، مضبوط ارادی قوت اور زبردست شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے انقلاب کے خواب دیکھتا ہے "جب نئی زندگی، نیا انسان ہوگا۔ عرض یہ کہ ہر چیز نئی ہوگی...... پھر وہ تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرسکیں گے۔"

اس انقلابی پارٹی کے اراکین اپنے مقاصد میں اخلاقی اور جسمانی لحاظ سے ناکام رہتے ہیں۔ دوستووسکی کی یہ تصنیف "عدمیت" کے فلسفہء حیات اور ضمناً یورپ کی مادیت کے خلاف لکھی گئی ہے۔ روسی انشاپرداز نے اس مسئلے پر دو پہلوؤں سے غور کیا ہے۔ ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ ایک وہ جو عام تہذیب اور تمدن سے متعلق ہے۔ دوسرا وہ جس کا تعلق شعور اور انسانی تشخص کے ذاتی ضروریات سے ہے۔

دوستووسکی کا آخری شاہکار The Brothers Kara Mazov نامکمل صورت میں ہے۔ اسے اس کے تخلیق کردہ افسانے کا صرف نصف حصہ کہنا چاہیے۔ دوستووسکی نے اس ناول میں جو اس کی تمام تصانیف میں سب سے ضخیم وجسیم ہے، روسی زندگی اور روسی کیرکٹر کا تجزیہ کیا ہے۔ گو پلاٹ بظاہر سادہ ہے مگر بہت الجھا ہوا ہے۔ بوڑھا کیراموزوف (ایک شہوت پرست) کے تین لڑکے ہیں۔ متری، ایفان، اور الیوشا پہلے دو لڑکوں میں باپ کی شہوت پرستی موجود ہوتی ہے لیکن الیوشا، رحم دل اور مستقل مزاج ہوتا ہے۔ باپ بیٹے میں ایک لڑکی کے بارے میں جھگڑا، اس داستان کا افتتاح ہے۔ اس سلسلے میں بوڑھا کیراموزوف مارا جاتا ہے۔ چنانچہ عدالت میں قتل کا مقدمہ چلتا ہے۔ شہوانی جذبات کے اک ہجوم میں الیوشا کی پاکیزہ روح نمودار ہوتی ہے جو اپنے گرو۔ زوسیما کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ اس کا مطمح نظر یہ ہے:

"خدا کی تمام مخلوق سے محبت کرو۔ ریت کے ہر ذرے سے!"

دوستووسکی کا طرز انشا بہت پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے۔ اس کی تمام تصانیف میں ایک ہذیانی کیفیت پائی جاتی ہے۔ روسی نقادوں کا بیان ہے کہ اس نے اپنی تحریروں میں ہر جگہ فصاحت کا خون کیا ہے۔ ادبی خوبیاں دوستووسکی کے ناولوں میں بہت کم ہیں۔ اس سقم کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ وہ غربت اور مصائب و نوائب کی موجودگی میں اپنے طرز انشا کو پختہ نہیں بنا سکا۔

دوستووسکی کے ناول محض قصے کہانیاں نہیں۔ دراصل اس نے ناول نویسی کے فن کو جو ہمیشہ سے محض

دلچسپی فراہم کرنے کے لیے وقف رہا تھا بلند ترین مقام پر پہنچا کر اسے حق کا پیغام بر بنا دیا اور اس طرح آرٹ اور مذہب کو ایک جان کر دیا۔

ضخیم ناولوں کے علاوہ دوستوو سکی نے مختصر افسانے بھی قلم بند کیے۔ مگر یہ محدود تعداد ہیں۔ ان میں ایک دلچسپ افسانہ جو رفیق شاہد لطیف کا ترجمہ کردہ ہے اس شمارے میں شامل کیا جارہا ہے۔

تورگنیف

ایفان سرگے تورگنیف، روس کے ایک مشہور رئیس خاندان میں ۲۸ اکتوبر ۱۸۱۸ء کو پیدا ہوا۔ گھر میں اس نے ابتدائی تعلیم ایسے معلموں سے حاصل کی جن میں سے ایک بھی روسی نژاد نہ تھا۔ روسی ادب سے پہلی مرتبہ تورگنیف کو اس کے گھر کے ایک نوکر نے متعارف کرایا۔ یہ خیراسکوف کی تصانیف کا بہت مداح تھا۔ ۱۸۳۴ء میں تورگنیف ماسکو کی تعلیم گاہ میں داخل ہوا لیکن ۱۸۳۵ء میں پیٹرز برگ چلا گیا اور فلسفے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جرمنی گیا اور تین سال تک برلن کے دارالعلوم میں لیکچر سنتا رہا۔ جرمنی سے واپس آ کر وہ ملازم ہو گیا۔ مگر طبیعت کی نامناسبت نے اسے یہ ملازمت ترک کرنے پر مجبور کیا اور ۱۸۴۳ء میں اس نے استعفاد دے دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی زندگی انشا پردازی کے لیے وقف کر دی۔ اس کی زندگی کا اکثر حصہ فرانس کی حسین سرزمین میں گزرا۔

شروع شروع میں تورگنیف کو شاعری کا شوق تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں اس نے بائرن اور دوسرے یورپی شعراء کے کلام کو اپنی زبان میں منتقل کیا جو کسی قدر مقبول ہوئے۔ اسی زمانے میں اس نے بائرن کے فلسفیانہ ڈرامے سے متاثر ہو کر ایک رومانی تمثیل steus سپرد قلم کی۔ اس تمثیل نے اس کے دل میں یہ شوق پیدا کر دیا کہ وہ روسی اسٹیج کے لیے ڈرامے لکھے۔ چنانچہ اس نے چند مزاحیہ ڈرامے لکھے جو برے نہیں ہیں۔

ملازمت ترک کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ایک نظم لکھی جسے مشہور نقاد بیلنسکی نے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ مگر اس صنف میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور اس نے شاعری کا خیال قریب قریب ترک ہی کر دیا۔ ۱۸۴۵ء میں اس کی پہلی کتاب ''شکاری کے مشاہدات'' شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت سے دنیائے ادب پر اس کی ساری ذکاوتیں اور خوبیاں روشن ہو گئیں۔ مگر یہ تصنیف تورگنیف کو روسی ماحول سے رضامند نہ رکھ سکی اور ۱۸۶۴ء میں وہ وطن کو چھوڑ کر فرانس چلا گیا اور پیرس میں رہنے لگا۔ ۱۸۵۲ء میں وہ کچھ عرصہ کے لئے گوگل کی تعزیت کے سلسلے میں روس واپس ہوا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا

کہ اسے چند روز جیل خانے میں گزارنے پڑے، جیل خانے سے رہائی پر وہ پھر یورپ چلا گیا اور مادام وی آردو گارشیا، ایک مشہور مغنیہ کی نیاز مندانہ خدمات میں مصروف رہا۔ مارچ ۱۸۸۲ء میں وہ ایک مہلک مرض میں گرفتار ہوا۔ مشہور ڈاکٹر شارکوٹ کی تشخیص کے مطابق یہ حلق کی سوزش تھی۔ چنانچہ وہ ایک طویل عرصے تک بستر کے ساتھ جکڑا رہا۔ مہینوں گزر گئے۔ مگر جیسا کہ تورگنیف خود کہتا ہے ''وہ کوئی غیر متحرک سی چیز'' بنا لیٹا رہا۔ دودھ کی غذا اسے مفید ثابت ہوئی چنانچہ ستمبر کے آغاز تک اس میں اتنی طاقت عود کر آئی کہ اس نے Beyond Death کو مکمل کر دیا۔ یہ افسانہ بعد ازاں Clara milicb کے عنوان سے شائع ہوا۔ ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ جنوری ۱۸۸۳ء میں اس پر عمل جراحی کیا گیا۔ جب آپریشن کے کچھ روز بعد داد ے اس سے ملنے کے لیے آیا تو روسی انشا پرداز نے اسے بتایا کہ وہ آپریشن کے دوران میں میز پر لیٹا اپنے درد کا تجزیہ کر رہا تھا اور ایسے الفاظ سوچ رہا تھا کہ جس سے اس وقت کے احساسات بیان ہو سکیں، جب اس کے جسم میں نشتر داخل ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ''ایسا معلوم ہوا کہ چاقو کیلے کو کاٹ رہا ہے۔''

آپریشن کے دو ہفتے بعد تورگنیف کی طبیعت قدرے بحال ہو گئی۔ اس وقتی صحت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا ''میں اپنے آپ کو اس قدر تندرست محسوس کر رہا ہوں کہ میرا ناچنے کو جی چاہتا ہے۔'' مگر اچانک مرض خطرناک صورت اختیار کر گیا اور ایک معما سا بن کر رہ گیا۔ دراصل اس کی ریڑھ میں ورم ہو گیا تھا۔ درد کو کم کرنے کے لیے اسے افیون کا جوہر دیا جاتا تھا۔ اس نشہ آور دوا کے کثرت استعمال نے اس کے دماغی اعصاب پر بہت اثر کیا چنانچہ وہ اس قدر زور سے چیختا رہتا کہ اس کی چیخیں بازار میں بخوبی سنائی دیتی تھیں۔ وہ مرنے کی خواہش کرتا تھا۔ اس غرض کے لیے اس نے کئی مرتبہ زہر طلب کیا۔ اس کے دماغی اضطراب اور خلل کو وہ طول طویل اور غیر مربوط تار ظاہر کرتے ہیں جو اس نے اپنے مختلف دوستوں کو بھیجنے کی خاطر لکھوائے۔

جب یہ طوفان کچھ کم ہوا تو ایوان تورگنیف نے اپنی محبوبہ مادام وی آردو کی مدد سے ایک افسانہ An End لکھا۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تورگنیف کی فن کاری ایک دائرے پر گھوم کر پھر اپنے اصل مقام پر آ گئی ہے۔ افسانہ لکھنے کے چند ماہ بعد اس کی طبیعت یکا یک پھر خراب ہوئی اور سنبھلنے نہ پائی۔ مرض کی تکلیف سے تنگ آ کر اس نے کئی مرتبہ خودکشی کا ارادہ کیا۔ ماپساں اس کی موت سے پانچ روز پیشتر اس سے ملاقات کرنے کے لیے آیا۔ تورگنیف نے اس سے التجا کی کہ وہ دوستی کا حق ادا کرتے

ہوئے اسے پستول لادے۔

اب جسمانی لحاظ سے تورگنیف کا مضبوط اور توانا جسم ہڈیوں کا ڈھانچارہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، اور باہیں چھڑیوں کی طرح پتلی ہوگئی تھیں۔ اپنی یہ حالت دیکھ کر اس نے یہ کہا ''نڈے ایسی ٹانگوں کے ساتھ انسان کیوں کر زندہ رہ سکتا ہے؟''

اگست کے آخری دن یعنی جمعہ کے روز لوئی (مادام وی آردو کی بڑی لڑکی) مریض کے کمرے میں آئی، تورگنیف نے اسے پہچان لیا۔ مگر بایں ہمہ اس کا دماغ دھند میں ملفوف تھا۔

''دیکھولوئی''، تورگنیف نے اس سے کہا'' دیکھو کس قدر تعجب کی بات ہے کہ میری ٹانگ اس کونے میں معلق ہے! کمرہ تابوتوں سے بھرا ہے، مگر انھوں نے مجھے تین دن اور جینے کی مہلت دے دی ہے۔''

اتفاق سے اس کا کہنا درست نکلا۔ پیر کے روز سہ پہر کے وقت اس کی سانس اکھڑ گئی۔ وہ خاموش لیٹا ہوا تھا دو بجے کا وقت تھا کہ اس نے اپنے بازو آخری بار پھیلائے اور سرد ہوگیا۔ روسی ادب کا درخشندہ ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

تورگنیف، قدرتی مناظر اور اپنے کرداروں کے نفسیات بیان کرتے وقت دور از کار مبالغہ بندی سے کام نہیں لیتا۔ وہ صرف ذاتی مشاہدے کی حدود کے اندر رہ کر فن کی آرائش کے سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس کی تصانیف میں ہمیں پراسرار پلاٹ نہیں ملتے۔ اس کی تمام تحریریں صرف چند تاثرات، تصاویر یا عام زندگی کے کچھ مرقعے ہیں جو اس نے نہایت متانت اور سنجیدگی لیکن اس کے ساتھ ہی کمال فن کاری سے پیش کر دیے ہیں۔ ان قلمی تصویروں میں جو تورگنیف کی شہرت کا باعث ہوئیں (Singers) شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ وہ اپنی تمام زندگی میں پھر ایسے شذرات کا مجموعہ تیار نہ کر سکا جو فن کاری کے لحاظ سے ''سنگرز'' کا ہم مرتبہ ہوتا۔

تورگنیف کا فن قدرتی عطیات کا بے مثل اجتماع ہے۔ اس کی نظر و فکر ہر چیز میں نفوذ کرتی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات کی تصویر کشی کرتے وقت بھدے نقوش سے ہمیشہ پرہیز کرتا ہے۔ وہ نہ زیادہ چابک دست مصور ہے اور نہ ایک زبردست تجزیہ کرنے والا۔ وہ ایک اعلیٰ دماغ کا حقیقت نگار ہے جس کی حقیقت نگاری شعریت کی نہایت ہی شیریں چاشنی میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ زندگی کا مصور ہے اور یہ مصوری کرتے وقت وہ نیچر کی تمام خوبیاں برقرار رکھتا ہے وہ اصلیت سے کبھی اغماز نہیں کرتا۔

تورگنیف کی تحریروں میں اس قدر متانت اور ضبط ہے کہ اس پر زبان کی خوبیوں سے موضوع یا

تصورات کی خامیاں پوری کرنے کا الزام کبھی نہیں لگایا جا سکتا۔ اپنی زبان اور الفاظ کی دولت وہ اس سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ کہیں بھی ایک زائد حرف یا جملہ نظر نہیں آتا اور محض اختصار اور ایجاز کے نقطہء نظر سے اس کی تصانیف اسلوب بیان کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہیں۔ تورگنیف زبان اور مضمون میں اتنی مناسبت اور ہم آہنگی اس وجہ سے پیدا کر سکا کہ وہ اپنے فن میں کامل تھا اور قبل اس کے وہ زبان کے زیور سے آراستہ کیے جائیں، اس کے پلاٹ اور کیرکٹر ایسی شکل اختیار کر لیتے تھے کہ یہ زیور ان کے عیبوں کو چھپانے کا کام نہ دے بلکہ ان کے حسن کو ابھارنے کا۔ پلاٹ کی ساخت اور ناول کو شکل دینے میں تو رگنیف ہر جگہ استاد مانا جاتا ہے۔

اب ہم تورگنیف کی چند مشہور تصانیف کا ذکر کریں گے۔

Sports Mans Sketches، یہ کتاب موضوع اور طرز انشا کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ اس کا موضوع کسان کی زندگی ہے۔ اس کتاب میں تورگنیف نے قوم کو کسانوں کی اصلی حالت سے آگاہ کیا۔ اس موضوع پر بہت سے انشا پرداز طبع آزمائی کر چکے تھے اور روسی زندگی کا کوئی پہلو نہیں تھا جو ان کی نظر سے چھپا ہو مگر تورگنیف کے نرالے انداز نے اس تصنیف کی اہمیت کو بہت بلند کر دیا۔ اس کا نقطہء نظر کسانوں کی ہمدردی یا حمایت نہیں۔ زمینداروں کی زیادتیاں بظاہر اس کو متاثر کرتی معلوم نہیں ہوتیں حق اور انصاف کے اعلیٰ معیار سے بھی اس کو کوئی سروکار نہیں۔ پھر جتنا اثر روشن خیال لوگوں پر اس کی اس کتاب کا ہوا، اس کا مقابلہ کوئی اور تصنیف نہیں کر سکتی۔

Father & Childeru، یہ داستان بازاروف کی سیرت اور اس کے عقیدوں کے مضبوط اور کمزور، غلط اور صحیح پہلو دکھاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں پرانا فلسفہء حیات اور پرانے طرز کے لوگ بھی بڑی خوبی سے بطور پس منظر کے رکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کا تخیل ٹرین میں ایک شخص سے گفتگو کرتے وقت تورگنیف کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ اس تصنیف میں سب سے زیادہ دل چسپ بازاروف کا جنسی فلسفہ ہے۔ وہ عشق کو ایک ڈھکوسلا سمجھتا ہے وہ کسی اخلاقی قاعدے اور اصول کو صحیح اور قابل تقلید نہیں جانتا۔ کسی خوب صورت عورت کو دیکھ کر اس کا یہی جی چاہتا ہے کہ اسے معمل میں لے جا کر اس کی چیر پھاڑ کرے۔ ایسے خیالات کا مالک ہوتے ہوئے بھی وہ ایک عورت کے دام عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس وقت کے عشق کی جو بھی کیفیت تھی وہ اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ مرتے وقت اس کی آخری خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو کسی طرح آخری بار دیکھ لے۔ اس تصنیف کے نفس مضمون کی تفصیل میں جانے

سے ہمیں طوالت کا خوف دامن گیر ہے۔

غالباً بازاروف (عدمی) ہی ایسا واحد قوی کردار ہے، جس کے نفسیات تورگنیف نے بڑے وثوق سے بیان کیے ہیں۔ اس تصنیف کے معاشری، سیاسی پہلو میں تورگنیف کا مخصوص رنگ پوری طرح جھلکتا ہے۔ جس سے اس کے دیگر طویل افسانے اگر محروم نہیں تو پوری طرح بہرہ ور بھی نہیں۔ دراصل اس کتاب کا مضمون ۱۶۴۰ء کے جذباتی نسل اور ۱۸۶۰ء کے عملی لوگوں کے مابین ایک جنگ ہے۔

Smoke ایک عشقیہ داستان ہے۔ اس میں قومی مسائل کا ذکر صرف ضمناً کیا گیا ہے مگر ایسے طنزیہ انداز میں کہ بیکار لوگوں کی بکواس معلوم ہوتا ہے۔ ناول کا ہیرو ایک شریف الطبع، تعلیم یافتہ اور کسی قدر حوصلہ مند آدمی ہے۔ یہ روسی زمینداروں کا ایک اچھا نمونہ ہے مگر انھیں کی طرح عملی استعداد سے بالکل محروم ہے۔ ہیروئن ایک حسین، ذہین، جذباتی اور چالاک عورت ہے۔ جس کی روسی طبیعت پر یورپی تہذیب کا اثر کچھ مفید ثابت نہیں ہوا ہے۔ یہ عورت خاندانی مگر مفلس لڑکی تھی۔ لتوی نوف (ہیرو) اس کی غربت کے زمانے میں اس سے ملا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ اریناؔ (ہیروئن) کے ماں باپ ان کی شادی پر رضامند نہ ہوئے۔ چند سال کے بعد جب لتوی نوف کی ارینا سے پھر ملاقات ہوئی تو وہ بالکل ہی اور رنگ میں نظر آئی۔ اس نے کسی اور شخص سے شادی کر لی تھی۔

Smoke کے ہیرو اور ہیروئن روسی سوسائٹی کے کوئی غیر معمولی مظہر نہیں۔ ارینا کی سیرت میں جو خود غرضی، امارت، عیش پسندی اور اعلیٰ اخلاق کی طرف سے بے پروائی ہے امیر روسی عورتوں میں عام پائی جاتی ہے۔ تورگنیف کی اپنی عمر کا بیشتر حصہ ایک خاتون مادام وی آردو کی خدمت گزاری میں صرف ہوا تھا۔ جس کی سیرت اور شخصیت اس ناول کی ہیروئن سے بہت مشابہ تھی اور لتوی نوف کی سرگزشت تورگنیف کی آپ بیتی سے ملتی جلتی ہے۔

تورگنیف کی ہردل عزیزی اور شہرت کا باعث اس کے مختصر افسانے بھی ہیں جو یورپی لٹریچر میں فکر انسانی کی بہترین تخلیق تسلیم کیے گئے ہیں۔ عشق و محبت کی ان داستانوں کا انجام جو تورگنیف اپنے خاص رنگ میں بیان کرتا ہے۔ ہمیشہ دردناک ہوتا ہے اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ اس آتش نفس مغنیہ کی محبت میں گرفتار تھا، جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ بڑھاپے میں تورگنیف کی طبیعت قنوطیت کی طرف مائل ہو گئی۔ چنانچہ اس کی آخری تصنیف ''سنیلا'' (مشہور اشعار کا مجموعہ) اس کی شاہد ہے۔

اکثر اہل روس کو اس کی شکایت ہے کہ تورگنیف نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ دوسرے ممالک میں

گزارا۔ اس وجہ سے وہ روسی ماحول اور وہاں کی تہذیب وتمدن کو اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔ اس کے چند سوانح نگاروں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جس سوسائٹی میں تورگنیف نے اپنی زندگی گزاری اس نے اسے روسی زندگی سے دور کر دیا۔ اسی تحت میں ایک سوانح نگار لکھتا ہے:

''اُن تمام اوقات میں جب تک کہ تورگنیف دوسرے ممالک میں رہا وہ کسی قسم کی اخلاقی ترقی حاصل نہ کر سکا، اور اس کے اہل وطن رفتہ رفتہ اس کے لیے اجنبی ہوتے گئے۔''

ایم ایفانوف کے خیال کے مطابق تورگنیف کے ایک فرانسیسی خاندان اور سوسائٹی کے ساتھ تعلقات اس کے اخلاق اور اس کی قوت متخیلہ پر برا اثر ڈالنے والے ثابت ہوئے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''اگر کہیں اسے سکون نصیب ہو سکا تو صرف اپنے وطن میں۔ وہ ایک مدت تک گمراہ رہا اور اس کی گمراہی نے اس کی فطرت پر بہت برے اثرات چھوڑے۔ ہم واقف ہیں کہ کس قسم کے عیش اس نے دوسرے ملک والوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے کیے۔ ان لوگوں کی دوستی میں خلوص کا نام تک نہ تھا۔ ان کی ہر بات سے ظاہر داری عیاں تھی۔ اصل پوچھو تو تورگنیف باوجود اس کے کہ وہ خاندان دیاردو کے ساتھ رہتا لیکن ان کے لئے ایسا ہی اجنبی تھا جیسا کہ فرانس کے کسی رستوران کے آدمیوں کے لئے۔''

لیکن یہ ایک حد تک درست نہیں کہ تورگنیف اور اس کے فرانسیسی دوستوں کے تعلقات خلوص پر مبنی نہ تھے۔ اگر ہم تورگنیف کے ان خطوط کا مطالعہ کریں جو اس نے ایم دیاردو کو لکھے تو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ اس کی نظر میں ان لوگوں کی کتنی وقعت تھی اور اس نے کس بلند آہنگی سے ان کے خلوص اور سچی محبت کا اعتراف کیا ہے۔ اس میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں کہ تورگنیف کی ادبی اہلیت پر ایم دیاردو کا شروع سے اور اس کے بعد فلائبیر کا کس قدر بہتر اثر پڑا۔ اس کے ثبوت میں ہم اس کے لکھنے کا دل کش انداز پیش کر سکتے ہیں جو اس کے مقامی ہم عصروں میں ناپید ہے۔ آخر یہ دل کش انداز تورگنیف کو کہاں سے ملا؟ اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یہ دل کش انداز اس کے فرانسیسی دوستوں کا مرہون منت تھا۔

تورگنیف ایک جگہ خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اگر میں روس میں رہتا تو ہرگز Les Recits Dnocnassar نہ لکھ سکتا۔ آخر اس قسم کی باتوں کا اظہار تورگنیف نے بار بار کیوں کیا ہے۔ اس کا جواب ایم ایفانوف بھی دینے سے قاصر ہے لیکن تورگنیف نے اس چیز کو صاف کر دیا ہے وہ لکھتا ہے:

''روس میں رہ کر میرے لیے ادب سے دلچسپی حاصل کرنا ناممکن تھا۔ وہاں پر اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو جاہل مطلق تھے۔ بھلا ان کو ادب اور ادبی زندگی سے کیا سروکار، اور جو دو چار تھے وہ بھی مختلف مقامات پر تھے۔ اس کے علاوہ روسی فضا اس کام کے لیے کچھ موزوں بھی نہ تھی۔ وہاں کے باشندوں کی زندگی میں اضمحلال تھا۔ آئے دن نئے نئے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان حالات میں یا تو میں اپنے آپ کو عام رو کے سپرد کر دیتا یا اپنی فطرت کے ساتھ بغاوت کرتا چاہے ایسا کرنے میں میری ہستی ہی نیست و نابود کیوں نہ ہو جاتی۔''

ظاہر ہے کہ اتنے ثبوت اس بات کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ تورگنیف اور اس کے فرانسیسی دوستوں کے تعلقات خلوص پر مبنی نہ تھے اور اہل فرانس سے تورگنیف کو کچھ نہ ملا (تورگنیف کی ادبی زندگی پر اس کے فرانسی احبا کا اثر۔ از رفیق شاہد لطیف)۔

ہم یہاں تورگنیف کا کوئی طویل افسانہ پیش نہیں کر سکے جس کا ہمیں افسوس ہے۔ ''کتا'' ایک مختصر افسانہ ہے جو تورگنیف کی تمام ادبی خوبیوں کو پیش نہیں کر رہا۔ ہم قارئین سے وعدہ کرتے ہیں کہ فرصت آئندہ میں اس روسی انشا پرداز کا ایک شاہکار افسانہ Diary of Super Fluous Man کا ترجمہ پیش کریں گے۔

گارشن

گارشن مغربی روس میں پیدا ہوا۔ اس نے پیٹرزبرگ کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں اس نے اپنی پہلی کہانیاں سپرد قلم کیں۔ ۱۸۷۷ء میں جب وہ ابھی طالب علم ہی تھا وہ بلگیریا کی جدوجہد آزادی کی تڑپ سے بے قرار ہو کر فوج میں داخل ہوا۔

اس جنگ میں رہ کر اس نے سپاہیوں کے نفسیات کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ وہ تمام افسانے جن میں گارشن نے جنگ کی تصویر کھینچی ہے، ٹالسٹائی کے جنگی افسانوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ دوران جنگ میں وہ زخمی ہو کر پیٹرزبرگ چلا آیا۔ جہاں پر اس نے اپنی ادبی زندگی شروع کی۔ اس کی موت کا سبب ذہنی مرض تھا۔

گارشن کا افسانہ Four Days، جو ایک نوجوان فوجی رضا کار کا روزنامچہ ہے۔ آرٹ کے نقطۂ نظر سے بہت بلند ہے۔ اس میں اس فوجی رضا کار کا زخمی ہو کر اپنے دشمن ترک سپاہی کی لاش کے ساتھ

پڑے رہنے کا منظر بہت رقت آمیز ہے۔زخمی سپاہی کی تکالیف کی عکاسی، جنگ کی وحشت خیزیوں کے متعلق اس کے خیالات کی قلم بندی کمال فن کاری سے کی گئی ہے۔ بلاشبہ گارشن کو انسانی فطرت سمجھنے کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔

گارشن اس زمانے میں زندہ تھا جب روس میں دو ادبی سکول تھے۔ایک Realistic یا Posetiyestic اور دوسرا Idealistic، مگر وہ ان سکولوں کی موجودگی سے متاثر نہ ہوا۔اس کے ذہن میں قدیم اخلاقی آئیڈیل برقرار رہا ہے۔لیکن ہم اس کی تحریروں میں Rationalism اور Idealism کے مابین ایک عجیب سا تثنیہ پاتے ہیں۔اس کے ہیرو اپنے فہم وادراک اور دل کی آواز پر کان دیتے ہیں لیکن ان کے المیہ انجام کا باعث یہ ہوتا ہے کہ وہ کردار کا صحیح راستہ تلاش کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

The coward اسی قسم کا ایک افسانہ ہے جس میں انسان کا دل تو جنگ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔لیکن بیک وقت اس کا ادراک اس کا ابطال پیش کرتا ہے یہی مضمون Diary of private ivuan کا ہے۔

گارشن کے آخری افسانے The Red Floner میں دنیا کی بے اعتنائی اور سرد مہری کے خلاف ایک زبردست احتجاج کی صدا بلند کی گئی ہے۔ایک شخص خود میں اپنے ہم جنسوں کی مشکلات کو دیکھنے کی تاب نہ پاتے ہوئے ازخودرفتہ ہو جاتا ہے۔پاگل خانے میں اس کا مضطرب دماغ نیکی اور بدی کے متعلق ایک نیا نظریہ قائم کرتا ہے۔وہ ایک گل لالہ میں، جو پاگل خانے سے ملحقہ باغ میں اگا ہوتا ہے، دنیا کی تمام بدیوں کا تجسم دیکھتا ہے۔ اس دیوانے کے دماغ میں اس بدی کا خاتمہ کر دینے کا خیال گارشن نے نہایت وضاحت سے قلم بند کیا ہے۔اس کے علاوہ اس کے امراض کے تشخیصی نفسیات بہت بلند ہیں۔

ایک افسانے میں گارشن آرٹ کی قدر و قیمت پر بحث کرتا ہے۔اس کا خیال یہ ہے کہ حقیقی آرٹ کو انسان کے دل میں نہ صرف حسن سے متعلقہ جذبات پیدا کرنے چاہئیں۔ بلکہ نیکی اور سچائی کے بھی۔ اپنے متشائم طرز تحریر کے باوصف گارشن انسانیت اور اس کی ترقی مستقبل کے بارے میں کافی یقین رکھتا تھا۔

چیخوف

روسی افسانہ نگاری کے تیسرے دور کا سالار کارواں انطون چیخوف ایک غریب گھرانے میں ۷

اجنوری ۱۸۶۰ء کو پیدا ہوا۔ اس نے ۱۸۸۴ء میں طبابت کی سند حاصل کی مگر اس کو اپنا ذریعہ معاش نہ بنایا۔ اس لیے کہ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنی تصانیف سے زیادہ کما سکتا ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں اس نے چند مزاحیہ افسانے لکھے۔ مگر جوں جوں تجربہ بڑھتا گیا ہنسی کھیل کی جگہ غور و فکر نے لے لی اور اس نے دنیا کا نہایت متانت سے مطالعہ کیا۔ چیخوف کے افسانوں کے مترجم مسٹر گارنٹ اپنے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''اس کے مضامین وہی ہیں جو وہ اپنے گرد و پیش سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس کے کردار بہادرانہ کارناموں کے مظہر نہیں ہوتے بلکہ ان افراد کا نمونہ ہوتے ہیں جن کو وہ روزانہ دیکھتا ہے۔''

چیخوف کے افسانے اسے دنیائے ادب کی صف اول میں جگہ دلواتے ہیں۔ اس کی شاہراہ دوسرے افسانہ نگاروں سے بالکل علیحدٰہ تھی۔ اس کا کام فطرت انسانی کی عکاسی کرنا تھا۔ اس کا دماغ ایک آئینہ تھا۔ جس میں وہ فطرت انسانی کا صحیح عکس دیکھ کر اسے دنیا کے سامنے پیش کر دیتا۔

چیخوف کے زمانے میں روس کی اخلاقی حالت بہت پست تھی۔ سیاسی طور پر روس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جب گرد و پیش کے یہ حالات ہوں تو چیخوف کے بربطِ فکر سے سوائے المیہ نغموں کے اور کون سی صدا اٹھ سکتی تھی۔ ایک روسی نقاد چیخوف کے فن کو بدیں الفاظ پیش کرتا ہے:

''روس کے خاموش مناظر کی طرح مغموم و الم انگیز، روس کے موسم خزاں کے مانند مختلف رنگوں کا مرکب، مشرقی غروب آفتاب کا سا نازک و لرزاں، موسم گرما کی خاموش رات سا پُر اسرار و عمیق نیلگوں آسمان اور کھلے میدان کا گیت۔ المیہ زندگی و مبہم مسرت کا ترانہ۔ یہ ہے چیخوف کا آرٹ۔''

چیخوف کے مختصر افسانے روسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے کردار روز مرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا تخیل شاعرانہ مبالغے سے پاک ہے۔ اس کے افسانوں میں بے جا طوالت نہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں دنیا کے تمام نشیب و فراز اور انسانی دل کی تمام کیفیتیں ایک ہی پلاٹ میں بیان کرنے کے بجائے زندگی کی صرف ایک قاش پیش کرتا ہے۔ یہی چیخوف کا کمال ہے اور اسی کمال نے اسے زندگی کا بہترین مصور بنا دیا۔

اکثر اوقات اسے مختصر افسانہ نگاری کے فن کے لحاظ سے فرانسیسی انشا پرداز ماپساں کا ہم پلہ قرار دیا

جاتا ہے۔ مگر ان دونوں مفکروں کے عمیق مطالعے کے بعد یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ ان کے نفسیات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ماپساں کی نظرِ فکر انسان میں حیوانی جذبات دیکھتی ہے اور چیخوف انسانیت کے عمیق ترین گڑھوں میں محبت اور امید کا متلاشی ہے۔

چیخوف بنی نوع انسان کی مشکلات کے متعلق کیا جواب دیتا ہے؟

کیا وہ معلم اخلاق تھا؟

کیا اس نے کسی نئے مذہب کی بنیاد ڈالی؟

کیا وہ کسی پر الزام لگاتا ہے؟

اس کا جواب نفی میں ہے۔ چیخوف صرف ایک مصور تھا نہ کہ معلم۔ اس نے ہمیں وہی پیش کیا جو اس نے اپنے گرد وپیش سے مطالعہ کیا۔ مگر ایسا کرتے وقت وہ ہمیشہ اس زندہ چنگاری کی جستجو کیا کرتا تھا جو سرشت انسانی میں نہاں ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ دنیاوی مصائب ونوائب صرف کچھ عرصے کے لیے قائم رہتے ہیں اور زندگی اس قابل ہے کہ زندہ رہا جائے۔ اگر اپنی خاطر نہیں تو آنے والی نسلوں کی خاطر سہی۔ اس لیے اسے یقین تھا کہ چند صدیوں کے بعد روس سے مصائب کے بادل دور ہو جائیں گے اور فضا مسرت وانبساط کے نغموں سے معمور ہوگی۔

چیخوف کے اکثر افسانوں میں ہم غربت زدہ جاہل اور مفلس لوگوں کی تاریک تصویریں دیکھتے ہیں۔

''غریب طبقے اور مزدوروں اور کسانوں کی زندگی ایک سیاہ رات ہے جو جہالت وغربت اور مختلف تعصبات کا مرکب ہے''۔ چیخوف اپنے ایک افسانے میں ان غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کرتا ہے۔ اس کے بیشتر کردار قوت عمل کے فقدان، نازک فطرت یا ضبط نفس کے انحطاط میں گرفتار ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ لوگ اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا تسکین قلب کے لیے شراب کا دامن تھام لیتے ہیں۔ ان کرداروں کا کوئی لائحہ عمل نہیں ہوتا وہ اکثر کام سے دل چراتے ہیں۔ اگر وہ کچھ کر سکتے ہیں تو صرف یہ کہ تمام وقت تخیل کی بلندیوں میں پرواز کرتے رہیں یا خوابوں کا ایک باریک جال بنتے رہیں۔ ان کی خواب نما زندگی سرابوں سے معمور ہوتی ہے جو جلد یا بدیر دھوکہ دے کر ان نظری انسانوں کو حقیقی زندگی کے بے پایاں ریگستانوں میں تنہا چھوڑ دیتی ہے۔ وہ عریاں حقیقت کو اس وقت دیکھتے ہیں جب ان کے حسیات وجذبات مردہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ تب وہ بے چارگی میں

محسوس کرتے ہیں کہ کتاب زندگی از سرِ نو شروع نہیں ہو سکتی۔

فن صحیحہ کا مالک ہوتے ہوئے چیخوف کی قلمی تصاویر میں زندگی نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ معاشرے کے جملہ عیوب، گھریلو زندگی اور دہقان کی خشک اور غیر دلچسپ زندگی ایسے اہم موضوعات پر چیخوف کا باکمال قلم جس روانی سے چلتا ہے وہ کسی اور صناع کو نصیب نہیں ہے۔

چیخوف کی نظروں میں سرمایہ داری ایک خونی آنکھوں والے دیو کے مشابہ تھی جو کارخانہ داروں اور مزدوروں دونوں پر بیک وقت حکومت کر رہا ہو چنانچہ اس کے افسانوں میں افسر، ڈاکٹر، پادری اور سوداگر کی تصویر ہمیشہ تاریک اور بھیانک پیش کی گئی ہے۔

چیخوف جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے صرف ایک حقیقت بیان مصور تھا۔ اس کا مطمح نظر زندگی کو اسی شکل میں پیش کرنا تھا جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ شاہراہ حیات سے ہٹ کر کسی خاص چیز کی تعلیم دینا۔ اس کی نظر میں ہر انسان کی قدر و قیمت تھی اور وہ اسے ذریعہ تعلیم تسلیم کرنے سے یکسر منکر تھا۔

چیخوف کے متشائم نظریہ حیات کی چاشنی اس کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں بھی موجود تھی۔ مگر معاشرے کی تنگ نظری اور دیگر سیاسی مصائب سے ان کے اذہان کی عنان توجہ عوام سے ہٹ کر انفرادیت کی طرف مبذول ہو گئی۔ ان میں سے بہت کم چیخوف کے مانند عالی حوصلہ جنگی ثابت ہوئے۔

انطون چیخوف کی زندگی تادم آخر پرسکون رہی۔ اسے اپنی زندگی میں کسی غیر معمولی حادثے سے دو چار نہ ہونا پڑا۔ افسانوں کے علاوہ اس نے مختلف تھیٹروں کے لیے ڈرامے لکھے جو اس کے مختصر افسانوں کی طرح بہت مقبول ہوئے مگر ان ڈراموں کی تعداد افسانوں کی نسبت بہت کم ہے۔

انیسویں صدی کے آخری چند سالوں تک روس میں کوئی قابل ذکر تمثیل نگار موجود نہیں تھا۔ اگر اس زمانے میں چند ڈرامے لکھے گئے تو وہ فنی لحاظ سے بہت کمزور ہیں۔ دراصل اس وقت ڈراما نویسوں نے صرف لوگوں کے تفنن طبع کے لیے انسانی زندگی کی کچھ نقلیں رقم کی ہیں جن میں ڈرامائی عناصر کو بالکل دخل نہیں ہے۔ سب سے پہلے لیمن ساف نامی ایک ادیب نے چند المیہ ڈرامے لکھے اس کے بعد سمروکاف متعدد مزاحیہ ڈرامے ضبط تحریر میں لایا۔ مگر وہ فنی اعتبار سے سقیم ہیں۔ اس کے بعد روس کے مایہ ناز شاعر پشکن نے شکسپیر کے افکار سے متاثر ہو کر ایک تمثیل لکھی۔ گو قابل مصنف نے اپنے کرداروں کے نفسیات کا بیان کمال فن کاری سے کیا ہے۔ مگر پھر بھی اس کی وہ تصنیف تمثیل نہیں کہلائی جا سکتی۔

وہ ایک تمثیلی نظم ہے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پشکن ایک اعلیٰ درجے کا تمثیل نگار نہیں بلکہ

ایک مستند غنائی شاعر تھا۔ پشکن کے بعد اوستروسکی نے ڈرامے میں حقیقت نگاری کا عنصر داخل کر دیا۔ دراصل حقیقت نما ڈراموں کو روس میں رواج کرنے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ مگر اس نے اپنے بعد کوئی قابل جانشین نہ چھوڑا، جو اس کی متعارف صنف کو بام رفعت پر پہنچا سکتا۔ اوستروسکی کے بعد جو تمثیل نگار بھی ہوئے وہ بالکل نااہل تھے۔ چنانچہ تمثیل نگاری روس کے مفکر اعظم طالسطائی کے ظہور تک دبی رہی۔

کاونٹ لیو طالسطائی نے متعدد کتابیں اور بے شمار مضمون لکھے۔ جو ادب حاضرہ میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ اس نے چند بلند پایہ ڈرامے بھی سپرد قلم کیے جو حلقہ ءادب میں بہت مقبول ہوئے۔ طالسطائی کے تین ڈرامے سٹیج ہو چکے ہیں۔ اس کا نصب العین کسانوں کی قابل رحم حالت کی عکاسی کرنا اور انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنا ہے۔

روسی ڈرامے میں پہلا انقلاب چیخوف کی پہلی تمثیل ''سی گل'' سے پیدا ہوا ہے۔ چیخوف شاید تمثیل نگاری کی طرف کبھی توجہ نہ کرتا، اگر وہ ایک پر از اسقام ڈرامے کو نہ دیکھتا۔ چیخوف اس ڈرامے کے عیوب کو برداشت نہ کر سکا۔ آخر اس تکدّر نے اس کی عنان توجہ تمثیل نگاری کی طرف مبذول کر دی اور اس کے کچھ عرصے بعد '' آن دی ہائی روڈ'' نامی ایک ڈرامہ سپرد قلم کیا، مگر وہ چند وجوہ کی بنا پر سٹیج نہ ہو سکا۔

چیخوف نے ہمت نہ ہاری اور جلد ہی ''ایوانوف'' کے عنوان سے ایک ڈراما سٹیج کے لیے پیش کیا۔ گو''ایوانوف'' کو سٹیج پر کافی مقبولیت حاصل ہوئی، مگر در حقیقت یہ تمثیل جملہ خوبیوں کی حامل نہ تھی۔ یہ صرف چیخوف کی ابتدا تھی۔ اپنے ڈرامے کی مقبولیت دیکھ کر چیخوف نے فوراً ہی ایک اور ڈرامہ لکھنا شروع کیا۔ مگر اس کے متعلق حوصلہ شکن تبصرے دیکھ کر اس نے اسے وہیں کا وہیں رہنے دیا اور کچھ عرصے کے لئے متین و سنجیدہ تمثیل نگاری سے کنارہ کش ہو کر چند ایک ایکٹ کی کامیڈیاں لکھیں جن میں ''ریچھ'' اور ''نسبت'' بہت مشہور ہیں۔

یہ ایک ایکٹ کے تمثیلچے چیخوف کے مخصوص مزاحیہ رنگ اور ظرافت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ابھی تک مختلف سٹیجوں پر کھیلے جا رہے ہیں۔

۱۸۹۴ء میں چیخوف نے ایک بار پھر سنجیدہ تمثیل نگاری کی طرف توجہ دی اور ایک ڈراما ''سی گل'' لکھا۔ اس کے بعد ''انکل وینیا''، ''چیری اور رچرڈ'' اور ''تھری سسٹرز'' شائع ہوئے اور سٹیج پر خوب چمکے۔

۴ جولائی ۱۹۰۴ء کو اس باکمال انسان نے موضع بیڈن ویلر میں وفات پائی اور ماسکو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

میکسم گورکی

سخت حبس اور ناخوش گوار موسم کے بعد ایک تازگی بخش طوفان کی طرح کسی زندان کے آہنی دروازے سے، زرد رو اور لاغر قیدیوں کے رہائی کی مانند جو کھلی ہوا میں سانس لینے لگیں، گورکی کے افکار روسی معاشرہ میں داخل ہوئے۔

چیخوف اور دیگر ادبا کسی مضبوط آئیڈیل اور زندگی کی نئی راہ تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ ان کی تمام تصانیف ان کی اس کمزوری پر چغلیاں کھاتی ہیں۔

ہر وہ جماعت جس سے تمنائیں وابستہ کی جاسکتی ہوں یکے بعد دیگرے رد کردی گئی تھی۔ وہ قیمتی ہیرا جسے ہم گورکی سے تشبیہ دیتے ہیں، سماج کے تاریک ترین گڑھوں میں پایا گیا۔ گورکی اپنے عصر کا بچہ تھا۔ اس کی زندگی خود اس کے ہاتھوں کی تعمیر کردہ ہے۔ ہم اس کی تصانیف میں مطالعہء کتب کا خفیف ترین عنصر بھی نہیں پاتے۔

جوان، سادہ میدانوں کی تازہ ہوا کی طرح جان بخش، پرازمسرت۔ عزم وخشم سے معمور، نئے افکار اور روشن الوان کا اجتماع، یہ ہیں گورکی کے افسانے۔

میکسم گورکی ۱۸۶۸ء میں بمقام نزہنی نود گورڈ و پیدا ہوا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو قریب قریب سب انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ وہ زندہ ہے اور ابھی تک اپنے افکار پیش کر رہا ہے۔

گورکی کی تصانیف اور اس کی زندگی پر مختصر تبصرہ اسی شمارہ میں کسی جگہ درج کیا جارہا ہے۔

چریکوف

روسی ادب میں انشاپردازوں کی تصانیف میں جو انیسویں صدی کے آخری نصف میں پیدا ہوئے، غم واندوہ کا عنصر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ ان میں غربا کے غیر مختتم مصائب ونوائب کا ذکر عام ہے۔ ہم زندگی کے متعلق مسرت کا اظہار ان میں بہت کم پاتے ہیں۔

گورکی کے znanihi school نے اچھے اچھے ادیب پیدا کیے۔ جن میں چریکوف کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ چریکوف ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوا، اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طبابت کی سند حاصل کی۔ مگر انطون چیخوف کی طرح اسے اپنا ذریعہء معاش نہ بنایا۔ چیخوف تو سرے سے ہی طبابت سے کنارہ کش ہو گیا تھا مگر چریکوف کچھ عرصے تک ایک گاؤں میں ڈاکٹری کرتا رہا۔ بعدازاں وہ اپنے پیشے کو

چھوڑ کر ادب کی طرف رجوع ہوا اور اپنی پہلی تصنیف ''ڈاکٹر کی نوٹ بک'' سے دنیائے ادب میں ایک سنسنی پیدا کر دی۔

چریکوف نے ڈراما نویسی میں اچھا نام پیدا کیا۔ اس کا ڈراما jew نہ صرف روس میں مقبول ہوا بلکہ غیر ممالک میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اپنے افسانوں اور ڈراموں میں چریکوف وہ کردار پیش کرتا ہے، جن کا اس نے اپنی طبابت کے دوران میں مشاہدہ کیا تھا۔ وہ اپنے ان کرداروں کے نفسیات کو بڑے سلیقے سے بیان کرتا ہے۔ اس کی اکثر تصانیف مارکس کے نظریات سے بحث کی صورت میں ہیں۔ اس نمبر میں چریکوف کا ایک مشہور و مقبول افسانہ ''گرفتار بلا'' کے عنوان سے شامل کیا جا رہا ہے۔

الگزنڈر کوپرن

حقیقین میں الگزنڈر کوپرن کا نام ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا اور فوجی تعلیم حاصل کی مگر بہت جلد اپنی فوجی زندگی سے اکتا کر اس نے ادب کی طرف توجہ دی۔ اس کے پہلے ناول The Duel نے سماج میں ایک سنسنی پیدا کر دی۔ کوپرن کی زندگی غیر منظم اور ہیجانی تھی۔ اس نے زندگی کا مطالعہ شراب خانوں، غربا کے مکانوں، کسانوں کے جھونپڑوں اور کارخانوں سے کیا۔ اسی مطالعہ کی خاطر اس نے اپنا بیشتر وقت ماہی گیروں، چوروں اور رہزنوں کے ساتھ رہ کر بسر کیا۔ اس کے تمام مضامین حقیقی زندگی سے براہ راست لیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا طرز (Style) وضاحت اور تازگی کا اجتماع ہے۔ اس کی تمام تحریروں میں رجائیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ کوپرن کی تصانیف اس کے ہم ادبا کے ماندہ افکار کا ایک دلچسپ اور عجیب تقابل پیش کرتی ہیں۔

The duel اور اس کے دیگر افسانے جو فوجی زندگی سے متعلق ہیں فوجیوں کی بد کرداری کی ایک نہایت واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان فوجیوں کی تصویر، جن کا مطمح نظر تاش کھیلنا، شراب پینا اور اپنی نفسیاتی خواہشات کی تکمیل تھا۔ Moloch نامی افسانہ کارخانوں کی زندگی کا ایک عکس ہے جہاں ہر ایک سرمایہ داری کے بھیانک دیو کا شکار ہوتا ہے۔ Moloch میں ہم ایک غریب لڑکی کو نہایت ہی غلیظ فضا میں دم توڑتے دیکھتے ہیں۔

قدیم یونانیوں کی طرح کوپرن زندگی سے بڑے والہانہ طور پر محبت کرتا ہے۔ وہ تمام نیچر کے دامِ الفت میں گرفتار ہے۔ وہ ہر درخت، ہر پھول اور ہر زندہ چیز کا پرستار ہے ناروی ادیب نٹ سن میم کی طرح

وہ نیچر کو پیش نظر رکھ کر زندگی کی حمد وثنا کے گیت گاتا ہے اور ہر شہر کے مصنوعی کلچر سے متنفر ہے۔

کوپرن اپنے ایک ضخیم ناول pit میں قاری کے لیے ایک شہر کی نہایت بھیانک تصویر پیش کرتا ہے۔ مگر یہاں ہمیں زندگی کی حسین جھلکیاں بھی اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ کوپرن اسی ناول میں ایک جگہ لکھتا ہے:

''انسان ایک عظیم الشان مسرت اور ایک غیر مختتم تخلیقی حرکت کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں اسے خدا کے مانند ہونا چاہیے کہ وہ ہر شے کے لیے اپنی غیر محدود محبت قائم رکھ سکے۔ درخت ، آسمان، انسان، کتے، غرض اس حسین دنیا کے ہر ذرے کے لیے۔''

کوپرن محبت کا مغنی ہے۔ محبت جو موت سے کہیں طاقتور ہے، جو زندگی کا بیک وقت آغاز وانجام ہے۔ روس کے کسی انشا پرداز نے کوپرن کی طرح حقیقی عینی محبت کی تصویر کشی نہیں کی۔ Garnet Ncklau میں اس محبت کا زبردست مظاہرہ ہے۔

بائرن کی نصیحت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ اصلی سونے کو جلا کرنے اور چنبیلی کے پھولوں کو سپید رنگ دینے کی کوئی ضرورت نہیں، کوپرن ایک افسانہ Sulamite ضبط تحریر میں لایا۔ یہ افسانہ بہت پیارا ہے۔ اس کا نفس مضمون محبت کی شان دار تقدیس ہے اس لیکہ:

''محبت مقدس حسن ہے۔ اس لیے کہ وہ عورت جو محبت کرتی ہے ملکہ ہے۔ اس لیے کہ محبت موت ایسی طاقتور ہے۔''

''یاما'' نامی تصنیف کے بعد اس نے اپنے تازہ افکار پیش نہیں کیے وہ ''اینٹی بولشویک'' ہے۔ ''عسکر ابیض'' کی شکست کے بعد وہ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر روس چھوڑ کر فرانس کے کسی گوشے میں اقامت پذیر ہے۔

اس نمبر میں کوپرن کا ایک افسانہ شامل کیا جا رہا ہے۔

لیونائڈ اینڈریف

جب گورکی کی ادبی شہرت کم ہونا شروع ہوئی تو لیونائڈ اینڈریف کا ستارہ خوب چمکا۔ یہ ۱۹۰۵ء کے انقلاب سے چند برس پہلے کا واقعہ ہے۔ اس سے فوراً بعد ہی ادب کے انقلابی سکول کی جگہ ایک نئے سکول نے لے لی۔ جس کو ہم مافوق الطبیعی یا قنوطی سکول کا نام دے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس سکول کے

بیشتر ادبا ایسے افسانے یا ڈرامے ضبط تحریر میں لائے جن میں مافوق الطبعی مسائل زیر بحث تھے اور ان کے حل قنوطیت اور عدمیت کا پہلو لیے ہوئے تھے۔ان مصنفوں کی شہرت پہلے انقلاب کی ناکامی کے بعد کے زمانے میں انتہائی عروج پر تھی۔اینڈریف کی سب سے بلند تصانیف وہ ہیں جو اس نے ۱۹۰۵ء سے پہلے سپرد قلم کیں۔

پرانے فیشن کے نقاد اور قارئین Symbolists اور اینڈریف کے درمیان کوئی خاص فرق نہ دیکھ سکے۔ان کی نظروں میں یہ دونوں منفور تھے۔فی الحقیقت ان دونوں میں کوئی خاص باہمی تطابق نہیں ہے Symblists آپس میں Conseientious صنعت گری سے متحد ہیں اور اینڈریف بالکل صنعت گر نہیں ہے۔سمبولسٹ بہت اعلیٰ وارفع کلچر کے لوگ تھے جنھوں نے روسی علمی طبقے کی نشاۃ الثانیہ میں بیش از بیش حصہ لیا اور اینڈریف میں اس کے برعکس نہ صرف کلچر کا فقدان تھا بلکہ وہ اس سے متنفر بھی تھا۔

لیونڈ اینڈریف، موضوع اورن میں پیدا ہوا۔اس کا خاندان صوبے کے چھوٹے سے علمی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔باپ کی وفات کے بعد اینڈریف کی ماں کو انتہائی غربت کا سامنا کرنا پڑا۔مگر پھر بھی اینڈریف مڈل سکول کا امتحان پاس کر کے پیٹرز برگ کی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔تعلیم کے اس دوران میں اس نے محبت کے سلسلے میں خودکشی کا اقدام کیا اور اس طرح یونیورسٹی چھوڑ کر کچھ سال بیکار پھرتا رہا۔ روسی علمی طبقے کے ہر نوجوان کی طرح جو انقلابی خیالات سے دلچسپی نہ رکھتے تھے، اینڈریف کا بھی اپنی زندگی کے متعلق کوئی خاص مطمح نظر نہ تھا۔اس کی زندگی فی الحقیقت اپنی روح کے خلا کو پر کرنے کی ایک سعی تھی۔ایسی صورت میں اینڈریف کا شراب نوشی کی عادت اختیار کر لینا لازم تھا۔اس لیے کہ اس قسم کے لوگ ایسے نشے کے متلاشی ہوتے ہیں، جو انھیں حرکت دیتی رہے۔

اینڈریف غم زدہ اور تنہائی پسند تھا۔اس کے بہتیرے دوست تھے۔وہ بڑا با اخلاق اور خوش دل تھا۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی یہ خوش دلی اور شادمانی بالکل مصنوعی تھی۔اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک ناقابل بیان اضطراب موجود تھا۔

اینڈریف کی جوانی کے متعلق یہ داستان غالباً بہت دلچسپی سے سنی جائے گی کہ وہ ایک مرتبہ ریل کی پٹڑی پر لیٹ گیا۔گاڑی آئی اور اس پر سے گزر گئی۔دراصل خطرات سے کھیلنا اس کا شغل تھا۔

۱۸۹۳ء میں اینڈریف ماسکو میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گیا اور وکالت کی سند حاصل کی۔

مگر اس نے اس پیشے کو اختیار نہ کیا۔ اس لیے کہ اب وہ ادب کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں اس کے مختصر افسانے شائع ہوئے۔ سب سے پہلا شخص جس نے اینڈریف کی حوصلہ افزائی کی وہ میکسم گورکی تھا۔ اس کے افسانوں نے روسی نقادوں کی توجہ بھی اپنی طرف مبذول کی۔ چنانچہ اس کی پہلی تصنیف کے مطالعہ کے بعد ایک روسی ناقد نے اینڈریف کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

''ہم دیکھتے ہیں کہ افق ادب پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے جس کی تابانی مسحور کن اور پراسرار ہے''

۱۹۰۱ء میں اینڈریف نے Once Ponatime Htereliuld لکھا جو بلا شک وشبہ اس کا شاہکار ہے۔ اس میں وہ حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے گورکی کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔ جب اس کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا تو وہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا اور اینڈریف کو بہت شان دار کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ چند سال اینڈریف کی زندگی کا نہایت ہی پر از مسرت زمانہ تھا۔ اس کے قدر دان کافی تعداد میں تھے۔ اس کی شہرت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ خوب روپیہ کما رہا تھا۔ فرحت وانبساط کی اسی فروانی میں اس کے افکار میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی یعنی اس کی تحریریں حزن وملال کے رنگ میں رنگی گئیں۔

۱۹۰۲ء میں اس کے دو افسانے The Abyss اور In The Fog شائع ہوئے۔ ان میں اینڈریف کے پیش نظر جنسی مسائل ہیں۔ اس مضمون پر اس کے قلم نے حقیقت نگاری کی بہترین مثال پیش کی ہے۔ اس افسانے کے بعد کی تصانیف نے اسے اور بھی مشہور کر دیا۔ اب اینڈریف روس کی ایک عظیم الشان ادبی شخصیت تھا۔ تمام رسائل وجرائد اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ شہرت کے علاوہ اب وہ کافی دولت اور سرمائے کا مالک تھا۔ ۱۹۰۲ء میں اس کی زندگی میں ایک المناک حادثہ پیش آیا۔ اس کی نہایت ہی پیاری بیوی اسے داغ مفارقت دے گئی۔ گو اینڈریف.............

اپنی گذشتہ شادماں زندگی کو دوبارہ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ یہی وجہ ہے کہ غم کی تاریکی اس کے افکار واذکار کا ایک جزو بن کر رہ گئی۔ اب اسے نشے کے مستقل استعمال کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ وہ ہر وقت مخمور رہنے لگا۔ اس کے سینے میں اضطراب نے ایک غیر معمولی صورت اختیار کر لی۔ یہ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ وہ بحری زندگی اختیار کرنے کے لیے ملاح بنا۔ پھر اس پیشے سے اُکتا کر مصوری کی طرف رجوع کیا۔ بہر حال اینڈریف نے جو پیشہ بھی اختیار کیا، اس میں دستگاہ وافی حاصل کی۔ اس کا

ہر کام شان دار تھا۔ دراصل وہ زندگی میں صرف عظمت کا قائل تھا۔ اس کا یہ نظریہ اس کی تصانیف میں نمایاں طور پر جھلکیاں لیتا ہے۔

اینڈ ریف کے ابتدائی افسانوں میں ہم چیخوف اور گورکی کا رنگ غالب دیکھتے ہیں۔ اینڈ ریف کے ہیرو عموماً قدیم آئیڈیلوں کے کھنڈر دیکھتے ہیں۔ انھیں اپنا سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملتی۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی زندگی انہیں اپنی طرف راغب بھی کرتی ہے۔ ان میں خوشی کے دور کی تمنا اور نیک انجام کی خواہش مردہ نہیں ہوتی۔ اینڈ ریف صحیح معنوں میں Cosmoplitian ہے۔ اس کا غم دنیا کا غم ہے۔

آئیڈیل تک رسائی حاصل کرنے کی غیر ممکنیت اور سچائی کی جستجو نے اینڈ ریف کو اپنے افکار کی تشکیل کے لیے Symbolic طریقہ اختیار کرنے پر مائل کیا۔ زندگی اور انسان کے مشاہدے کو ایک ایکس ریز کی طرح وہ اس صورت میں پیش کرتا ہے کہ صرف ایسے ڈھانچے نظر آتے ہیں جن پر سے گوشت پوست علیحدہ کر دیا گیا ہو۔

اینڈ ریف کی تصانیف ریفارم اور پُر اسرار قوت یعنی زندگی، قسمت اور خدا کی نامعروف ہستی کے متعلق اس کے نظریات ہیں۔ وہ ان تین چیزوں کو ایک خوف سے تعبیر کرتا ہے۔ انسان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

اینڈ ریف کا آرٹ بہت عجیب و غریب ہے۔ وہ اپنے ہر افسانے میں کسی خیال کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس کے پیش کردہ کردار حقیقی زندگی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ وہ مصنوعی چہرے چڑھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ افسانوں کی طرح اس کے ڈراموں میں بھی یہی چیز موجود ہے۔ اینڈ ریف کے افکار جمالی حسیات پر اثر انداز ہونے کے بجائے اعصاب پر اثر کرتے ہیں۔ اس کی تصانیف میں Seven Thatwere Hauged, Tonards the Staks اور Geueruer قابل ذکر ہیں۔

اینڈ ریف نے اپنی پہلی تمثیل ''سوئے انجم'' ۱۹۰۵ء میں لکھی۔ اس کے بعد اس نے اور بہت سے ڈرامے لکھے مگر وہ اس کے افسانوں کے مقابلے میں فنی نقطہ نظر سے سقیم ہیں۔ ان ڈراموں کا فلسفہ بھی فنا اور موت سے متعلق ہے۔ ''طمانچہ زدہ'' نامی تمثیل جو امریکہ کے کسی نگار خانے نے فلم بھی کی ہے، اس کے تمام ڈراموں میں قابل ذکر ہے۔ اس کے ڈراموں کا سٹیج پر بہت تپاک سے استقبال کیا گیا، اور ایک

ہی ڈراما مہینوں لگاتار دیکھنے سے بھی لوگوں کی طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔

سوسائٹی کے نقاد کے اعتبار سے اینڈریف نے بیرونی حوادث حیات میں کبھی دلچسپی نہیں لی، مگر کیرکٹر کے مدو جزر کو اس نے ذرا بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا اس لیے کہ اس کے ڈرامے نفسیات اور میلان ذہنی کی مرقع نمائی کے لئے وقف ہیں۔ فلسفے کے عمیق رموز کو ظاہر کرنے کے لیے اس نے مارس میٹرلنک کی استعارہ پوش تمثیلوں کا طرز انتخاب کیا ہے۔ مگر بسا اوقات اس کا استعارہ اس قدر لطیف ہو جاتا ہے کہ فہم کی گرفت میں نہیں آتا۔ اس کے تھیٹر میں شیفتگی پیدا کرنے کے لیے بیرونی عمل کی قطعاً ضرورت نہیں، صرف معمائے حیات پر گفتگو کرنا اور نفسیات کی اُلجھنوں کو وا کرنا کافی ہے۔

اس پرچے میں اینڈریف کا ایک دلچسپ افسانہ ''خاموشی'' شامل کیا جارہا ہے۔

سلوگب

ایف سلوگب کا اصلی نام فیڈر تیتر نی کوف ہے۔ یہ ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے پہلی مرتبہ اپنے اشعار کے مجموعے سے خود کو دنیائے ادب سے روشناس کرایا۔ ناول نویسی میں اسے اپنی تصنیف The Little Devils سے شہرت حاصل ہوئی جو اس نے ۱۹۰۵ء میں قلم بند کی۔ اس کے بعد اس نے بے شمار ناول، افسانے اور ڈرامے لکھے ہیں۔

میسرزکوسکی اور سلوگب دونوں کو روسی موڈرنزم کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ دیگر ماڈرنسٹوں کی نسبت سلوگب کی ذکاوت نے بالکل مختلف طریق پر ترقی کی۔ اینڈرسن کی کہانی کے روایتی لڑکے کی طرح اس نے اپنی آنکھ میں ''شیطان کا آئینہ'' جڑلیا جس میں ہر ایک شے کا عکس بگڑ جاتا ہے۔

The Little Devil میں سلوگب ایک ایسے آدمی کا کردار پیش کرتا ہے، جو از حد کمینہ، تنگ دل اور بدکردار ہوتا ہے۔ اس کی زندگی سخت مصیبت زدہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی ادنیٰ خواہشات کو پورا کرنے کے لیے مسلسل تگ ودو کرتا رہتا ہے۔ آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی باندھے ہوئے وہ بالکل گمراہ ہو جاتا ہے اور اپنی حیوانی فطرت کے زیر تحت کام کرتا ہے۔ اس کی اس حیوانی فطرت کو ''ننھے شیطان'' کے لباس میں پیش کیا گیا ہے۔

گو اس قسم کا کردار چیخوف نے The Man in The Case میں اور اینڈریف نے Nopardon میں پیش کیا ہے مگر یہ دونوں افسانہ نگار سلوگب کا ساز جردست ''تقابل'' پیدا نہیں کرسکے۔

سلوگب کی تمام تصانیف حقیقت اور تخیل کا ایک عجیب اجتماع ہیں۔ اس کے چند افسانے جن میں Turandina بھی شامل ہے۔ صرف اناطول فرانس کے افسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

The Charms of Navai میں سلوگب زندگی کی بے ہودگیاں اور انعکاس عمل بیان کرتا ہے۔ اس کے تقابل میں اس نے ٹری روڈر کی جاگیر کے مافوق العادت اور پُراسرار واقعات بڑے دلچسپ پیرائے میں قلم بند کیے ہیں۔

Queen 0rtruda، اس ناول کا مضمون انتہائی درجہ عجیب وغریب ہے۔ اس میں سلوگب نے اشہب فکر کو انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا، جس کی وجہ سے قارئین کچھ تنگ آ گئے اور غالباً یہی تنفر اس بے رخی کا باعث تھا جو اس کی بہترین تصنیف Created Legrnd کو نصیب ہوئی۔

اس کی آخری تصنیف The Charmer of The Snakes گو ادبی لحاظ سے بہت کمزور ہے مگر اس میں کلام نہیں کہ اس میں شعریت کا عنصر ہر حالت میں کامیاب ہے۔

سلوگب دنیا کو دو حصوں میں منقسم کرتا ہے۔ ''ایک اچھی دنیا'' جس میں اتحاد سکون اور حسن ہے۔ دوسری ''بری دنیا'' جس میں تفرقہ، ہوس اور فواحش موجود ہیں۔ سلوگب کے نزدیک ہماری یہ دنیا مصائب کی تخلیق ہے، اور سکون واتحاد کی دنیا صرف انسانی قلوب میں پائی جا سکتی ہے۔

سلوگب کا فلسفہ زیادہ تر تلمیس نما عدمیت سے مشابہ ہے۔

اس نے بہت سی تمثیلیں سپرد قلم کی ہیں۔ مگر وہ اس کی دیگر تصانیف کی طرح کامیاب نہیں۔ ان ڈراموں کے متعلق صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ حسین تو ہیں، مگر یہ حسن صرف ظاہری ہے۔ سلوگب کا طرز انشا حد درجہ خیالی، ذومعنی اور تعجب خیز طریق پر جدت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ بہر حال وہ روس کا بلند پایہ غنائی شاعر اور مسلّم ادیب ہے۔ ہم اس نمبر میں اس کے دو مختصر افسانوں کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے قارئین اس کے طرز تحریر کا اندازہ لگا سکیں گے۔

روس کو مغربی تہذیب کا آخری بچہ کہتے ہیں۔ روس کی نشاۃ الثانیہ مغربی ممالک سے دو سو سال بعد شروع ہوئی۔ تاہم روس نے ایسے ادیب اور مفکر پیدا کیے ہیں، جن پر فکر انسان بجا پر طور نازاں ہے۔ مختصر افسانہ نگاری روسی ادب کا بہت بڑا اجزو ہے۔ دراصل افسانہ نگاری کی صنف میں روسی انشا پردازوں نے قابل تحسین طریق پر طبع آزمائی کی ہے۔ چونکہ روسی ادب تجارتی اغراض اور کتب خانوں کی مانگ سے بالاتر ہے، اس لیے فطری طور پر آرٹ کو ارض احمر میں انتہائی عروج حاصل ہوا ہے۔ جب ہم روسی

کتب کی فہرستیں دیکھتے ہیں، تو ہمیں یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ لاتعداد ناولوں کے ساتھ ساتھ مختصر افسانوں کے مجموعوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔

روسی ادب، ناول (Roman) مختصر ناول (Povyest) اور کہانی (Razska) میں منقسم ہے۔ Roman بالعموم ایسی داستان کا نام ہے جو تین چار جلدوں میں ختم ہوتی ہو۔ Povyest ایسا مختصر ناول ہے جو پچاس سے لے کر سو صفحات تک کا ہو۔ Razska پچاس یا اس سے کم صفحات کے افسانے کا نام ہے۔

روسی افسانوں اور ڈراموں میں حیات انسانی اور نظام عالم کے متعلق غور و فکر کے شواہد پائے جاتے ہیں۔ قصے کا موضوع بحث عموماً انسان ہوتا ہے۔ انسان کے باہمی تعلقات، اس کے خیالات و جذبات میلانات و رجحانات، عزائم و مقاصد رنج و خوشی، کشمکش حیات، اس کی جدوجہد اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے بحث ہوتی ہے۔ فلسفیانہ نظریات اور حکیمانہ نکات کی نہایت وضاحت سے تشریح کی جاتی ہے۔

روسی ادب دراصل محض مایوسی اور حزن کا ترانہ نہیں جیسا کہ اس کے چند نقادوں کا دعویٰ ہے۔ مگر روسی انشاپردازوں نے زندگی کو زیادہ شوخ رنگوں میں دکھا کر اکثر خود اپنی امیدوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں وہ کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں، جو ان کے دلوں پر گزر چکی ہے اور اس کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے کہ ہم یہ بار برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ وہ ہمیں دوزخ کی سیر کراتے ہیں اور بغیر جنت کا راستہ بتائے ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرز عمل سے شکایت ہے، مگر زیادہ تر ان لوگوں کو جن کے خیال میں ادبی تصنیفات کا اصل مقصد دلچسپ ہونا، جذبات میں گدگدی پیدا کرنا اور جب فرصت یا بے کاری کا وقت ختم ہو جائے تو یاد سے محو ہو جانا ہے۔ سنجیدہ ناول نویسوں کا نصب العین کبھی اور کہیں بھی ایسا حقیر نہیں ہوا ہے کہ وہ اس مذاق کا لحاظ کریں، لیکن روسی انشاپرداز اکثر ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں اور ناولوں اور افسانوں سے حتی الامکان خاص دلچسپی کا عنصر بالکل نکال دیا ہے۔ روسی ناول وغیرہ عبرت اور تعلیم کا ذریعہ ہیں اور صرف اس عبرت کا نہیں، جو ہمارے سامنے دوسروں کی حماقتیں ایک غیبی تنبیہ کی شکل میں پیش کرتی ہے، بلکہ اس عبرت کا جو ہمارے دلوں کو انسانی ہمدردی کی جولاں گاہ محبت اور ایثار کا سرچشمہ بننے کا حوصلہ دلاتی ہے اور صرف اس تعلیم کا نہیں جو ہمیں ''آسائش در گیتی'' حاصل کرنے کی ترکیبیں سکھاتی ہے، بلکہ اس تعلیم کا جو خودغرضی اور ذاتی کامیابی کی ذلیل خواہشوں کے پنجے سے رہا کر

کے دل کو زندگی اور جذبات کا مرکز بناتی ہے۔ اس میں اتنی ہمت پیدا کرتی ہے کہ روح کو نفس پر ترجیح دے سکے اور اپنے سکون اور آسودگی کو ہمیشہ قربان کرنے پر تیار رہے۔ بہترین روسی ناولوں کا مقصد زندگی کی صحیح تصویریں پیش کرنا ہے جن میں ایک صحیح اور سچا فلسفہ بھی مضمر ہو۔ جن سے ذہن میں وسعت ،دل میں درد، اخلاق میں محبت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اس بلند حوصلے کے ساتھ ناممکن تھا کہ وہ ہر بوالہوس کے مذاق کے مطابق اور محض لطف ودلچسپی کا سامان پیدا کریں۔"

روس کا باکمال افسانہ نگار حیات انسانی کے لامتناہی واقعات ومعاملات کے پیہم چکر سے تنگ آکر اپنا زبردست ہاتھ زندگی کے متحرک چاک کے کسی ڈنڈے پر رکھ دیتا ہے۔ جس سے تھوڑی دیر کے لیے اس کی رفتار تھم جاتی ہے اور وہ ضرورت کے مطابق اپنے افسانے کا مواد وسامان جمع کرنے کے بعد پھر اسے چھوڑ دیتا ہے، چرخ حیات کو اس انداز سے روکنے کی قوت زیادہ تر روسی افسانہ نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔

اعتذار

اس تعارف میں ایسے اکثر افسانہ نگاروں کا ذکر رہ گیا ہے جن کے افسانے اس اشاعت میں درج کیے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ سوویٹ ادب کے متعلق اس مضمون میں کچھ نہیں لکھا جاسکا۔ ارادہ تھا کہ اس موضوع پر ایک علیحدہ مفصل مقالہ لکھا جائے، مگر دفعتاً بیمار ہوجانے کے باعث ایسا نہیں ہوسکا۔ اگر صحت نے اجازت دی تو بہت جلد اس کمی کو پورا کردیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

حاشیہ: ۱۔ دوستووسکی کا ایک خط، مترجم، کفایت علی قادری۔

کتابیات

یہ تعارف لکھتے وقت روسی ادب کی ان مختصر تاریخوں سے استفادہ کیا ہے:۔

(i) History of Russian Literature By D.S .Mirsky

(ii) Contemporary Russian Literature By D.S .Mirsky Hnonsky

(iii) A Short History of Russian Literature By Snak

(v) Out Line of (iv) Russian Literature By Jahko Lavrin

Russian Literature By Hon Mauricebaring

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب اور مقالے بھی پیش نظر رہے ہیں:

(i) Maxim Gorky: A Critical Studay of His works By
Mus grove, scot, An Essay.

(ii) Maxim Gorky, An Article By Saadat .H. Manto
(Bombay Chronicle)

(iii) روسی ادب (اُردو)

(iv) Crime & Punishment

(v) دوستووسکی کا ایک خط (مترجمہ کفایت علی قادری۔ "ہمایوں")

(vi) Foma Gordyf

(vii) Revolution & Other Essays By Jack London

(viii) Tourgenev the Man His Art & His Age By
Avraham Tourgenev

پُشکن

رُوس کے ادبِ جدید کا آغاز انیسویں صدی سے ہوتا ہے۔ اُس وقت کی فضا سیر حاصل افکار سے معمور تھی۔ لوگوں کی نبض ''کاریکی تمثیل'' سے دھڑک رہی تھی، قوم کے سینے میں احساسِ بیداری کروٹیں لے رہا تھا اور ایک دنیائے نو کے دروازے کسی خوشگوار بادِ نسیم سے کُھل رہے تھے۔
جب گرد و پیش کے یہ حالات ہوں تو کسی نوجوان کے بربطِ فکر سے کس قسم کی راگنیاں بلند ہو سکتی ہیں؟

حیاتِ نو کا نغمہ!

بیداری کا گیت!

اگر انگلستان کی نشاۃ الثانیہ تمثیل نگاری کی صورت میں نمودار ہوئی تو ارض احمر کا غنچہء ادب غنائی شاعری کی شکل میں چٹکا۔ اگر انگلستان نے شیکسپیئر ایسا عظیم تمثیل نگار پیدا کیا تو روس کی مردہ زمین نے پشکن نامی ایک سحر طراز غنائی شاعر کو جنم دیا۔ جس کے کیف آور گیت ایک عرصے تک فضائے ادب کو زندگی بخشتے رہے۔

الگزنڈر پشکن ۲۴ مئی ۱۷۹۹ء کو ماسکو میں پیدا ہوا اور آتش نفس شاعر بائرن کی عمر تک پہنچ کر اس جہاں سے کوچ کر گیا۔ گو اس نوجوان شاعر کو اپنی عمر کی بہت کم بہاریں دیکھنا نصیب ہوئیں مگر اس عرصے میں اُس نے بین الملتی شہرت حاصل کر لی۔

پشکن کا دادا عربی النسل تھا جو پیٹر اعظم نے ایک بوتل شراب کے عوض قسطنطنیہ میں خریدا تھا اور جس نے کچھ عرصے بعد ایک جرمن خاتون سے شادی کر لی تھی۔

اس قسم کی عجیب روایت کے وارث شاعر نے فرانسیسی معلموں اور ایک رُوسی خادمہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور تھوڑے عرصے کے بعد ہی یعنی اٹھارہ سال کی عمر میں ایک اچھی یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم کی

سند حاصل کر لی۔ گو وہ زمانہ تعلیم میں ذہین طالبعلم ثابت نہ ہو سکا۔ مگر اس وقت کے اشعار بھی اُس کی عظمت پر شاہد ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ تین سال تک مختلف مقامات پر گھومتا رہا۔ پشکن فطرتاً آزاد منش واقع ہوا تھا۔ چنانچہ وہ حکومت کے عتاب سے نہ بچ سکا اور کچھ عرصے کے لیے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس زمانے میں اس کا اشہبِ فکر مختلف میدانوں میں چکر کاٹتا رہا۔

۱۸۲۶ء میں واپسی پر وہ پیٹرز برگ میں اقامت پذیر ہوا جہاں اُس کی پرستار دوشیزہ لڑکیوں او رحکام کے سنسروں نے اُسے گھیر لیا۔

بتیس سال کی عمر میں اُس نے ایک شانزدہ سالہ لڑکی سے شادی کی جو حُسن میں اپنی مثال صرف آپ تھی۔ اس حسینہ کی ضروریات بہم پہنچانے کی خاطر شاعر بڑی تن دہی و جانفشانی سے کام کرنے لگا ——— صرف اس لیے کہ اس کی محبوب رفیقہ ءحیات کو مجلسی دائرے میں ممتاز حیثیت حاصل ہو سکے۔ چنانچہ انہی مالی مشکلات اور خانگی پریشانیوں نے شاعر کی صحت پر بہت برا اثر کیا۔

پشکن، ڈینٹے، شیکسپیئر اور گوئٹے کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔ گو بعض نقاد اس کے کلام میں بعض خامیاں بھی نکالتے ہیں، تاہم اس میں کسی کو کلام نہیں ہے کہ وہ ملتِ احمر کا سب سے پہلا اور بلا شک و شبہ سب سے بڑا قومی شاعر و مفکر ہے۔ خود پشکن کو اپنی عظمت کا احساس تھا۔ وہ اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے۔

نہیں! میں نہیں مر سکتا ———

میری روح زندہ ہے، گو میرا جسم مٹھی بھر خاک میں تبدیل ہو گیا ہے۔

میں زندہ ہوں، مشہور ہوں اور رہوں گا۔ جب تک اس آسمان تلے کوئی شاعر زندگی کے سانس لے گا۔

میرا نام زبان زدِ خاص و عام ہو گا ———

قوم کی قوم میری محبت میں گرفتار ہو گی!

اس لیکہ میرے نغمات نے ان کے لطیف جذبات بیدار کر دیے۔

اور افتادہ لوگوں کے لیے رحم کی التجا کی!!

پشکن کا کلام بعض اوقات بائرن کے آتشیں افکار سے ملتا جلتا ہے۔ وہ اپنے نغمات میں اکثر ملتِ

روس کو پیغام دیتا ہے کہ وہ خواب سے بیدار ہو، اور اپنے فرائض کو پہچانے۔

پشکن اپنی ایک نظم میں قوم کو مخاطب کرتے ہوئے غیرت دلاتا ہے:

''راحت پسند قومو!——

اگر سازِ عظمت تمھیں بیدار نہیں کرسکتا، تو جاؤ! گھاس پر زندگی بسر کرو!

کیا بھیڑوں کا گلہ حُریّت کا دعویٰ کرسکتا ہے؟

اُن کی تقدیر میں کھال اتروانا ہے یا ذبح ہونا!

اُن کے آباؤ اجداد نے اپنی نسلوں کو سوائے غلامی کی فرسودہ زندگی کے اور وراثت میں کیا دیا؟''

پشکن نے شیکسپیئر کے افکار سے متاثر ہوکر آزاد بحر میں طبع آزمائی کی اور ایک تمثیل سپرد قلم کی۔ اس تمثیل کا نفسِ مضمون روس کی مضطرب فضا ہے۔ گو قابل ادیب نے اپنے کرداروں کی نفسیات بیان کرنے میں کمال فن کاری کا نمونہ دکھایا ہے۔ مگر پھر بھی وہ صحیح تمثیل ہونے کی بجائے ایک تمثیلی نظم ہی کہلا سکتی ہے۔ وہ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک شعریت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پشکن ایک اعلیٰ تمثیل نگار نہ تھا بلکہ ایک مستند عظیم شاعر۔

پشکن کا ہر گیت صنعت کا بہترین نمونہ اور بجائے خود ایک طویل تبصرے کا محتاج ہے۔ بہر حال یہی کہنے پر اکتفا کیا جاسکتا ہے کہ اُس کا ایک ایک شعر عروسِ شعرستان کا حسین زیور ہے۔

اُس کے اشعار انتہائی حسن کی وجہ سے ناقابلِ ترجمہ ہیں اس لئے کہ انہیں ایک غیر زبان میں منتقل کرتے وقت یہی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں مترجم کے کھردرے ہاتھ اُن کی اصلی شکل کو مسخ نہ کردیں[1]۔ بہر حال اس کے ایک گیت کے چند اشعار کا ترجمہ میرے خیالِ ناقص میں یہ ہوسکتا ہے:

''میں نے تجھ سے محبت کی——

میری محبت کی راکھ میں اُسی محبت کی چنگاریاں اب تک موجود ہیں——

مجھے اس کا اعتراف ہے!

مگر اس خیال سے کہیں آزردہ نہ ہونا——

میں پھر تمہیں مغموم کرنا نہیں چاہتا!

میں نے والہانہ طور پر تجھ سے محبت کی!

اور اب دل سے دعا گو ہوں ———

کوئی اور تجھ سے مجھ ایسی محبت کرے!"

پشکن کا سحر فطری ہے۔ وہ ایک معمولی چیز کو ایسے پراز شعریت و وجد آفریں انداز میں بیان کرتا ہے جو صرف اسی کا حصہ ہے ——— یہ سحر آفریں تخلیقی قوت پشکن کا ایجاد کردہ سنگ پارس تھی جس نے اس کے ہر شعر کو کندن ایسی تابانی بخشی ہے۔

پُشکن کے کلام میں آورد کو بالکل دخل نہیں۔ اُس کے اشعار پڑھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اُس کے تمام افکار آمد کا نتیجہ ہیں۔ دراصل پُشکن کے ہاتھوں میں انتہائے کمال ایک کھلونا تھا جس کے ساتھ وہ ایک عرصے تک کھیلتا رہا۔

اُس کے تمام کلام یعنی منظوم بیانات، گیتوں اور غزلوں میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے کسی تکلف یا آورد کا پتہ چل سکے۔ زمانے کے بیسیوں انقلاب آئیں، ہزاروں نئے شاعر پیدا ہوں مگر پشکن کی عظمت لازوال ہے اور لازوال رہے گی۔

پشکن نے شاعری کے علاوہ نثر کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ اس کی نثر بھی نظم کی طرح بے شمار خوبیوں کی حامل ہے۔ ان کی ناولوں اور افسانوں میں جو پشکن نے سپرد قلم کئے ہیں "پسٹل شاٹ" اور "پوسٹ ماسٹر" شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۰ فروری ۱۸۳۷ء کو پشکن ایک ڈوئل لڑتے ہوئے مہلک طور پر زخمی ہوا اور دو دن کے بعد تشنگانِ ادب کو پیاسا چھوڑ گیا۔

کرمنطوف نے پشکن کی موت پر مندرجہ ذیل اشعار رقم کیے ہیں:

"خاموش ہو گئیں شیریں راگنیاں!

اُن کی آخری گونج بھی مفقود ہو گئی!!

اس کی آرام گاہ تنگ و تار ہے ———

مُغنّی کے لب سی دیے گئے ہیں!!!"

حواشی

۱: نپولین کا حملہ

۲: رشین لٹریچر از ہمیگو لیفرن

تورگنیف کی موت

اگر۱۸۸۱ء کے ہندسوں کو الٹ پلٹ کیا جائے تو روسی رومان نویس اور مفکر تورگنیف کا سن پیدائش (۱۸۱۸ء) نکل آتا ہے۔اس چیز میں شگون دیکھتے ہوئے تورگنیف کو یقین تھا کہ اُس کی موت یکم اکتوبر۱۸۸۱ءکو وقوع پذیر ہوگی۔مگر اُس کا یہ خیال صحیح نہ نکلا۔وہ ۱۸۸۳ء میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔

مارچ ۱۸۸۲ء میں تورگنیف ایک مہلک مرض میں گرفتار ہوا۔مشہور ڈاکٹر شارکوٹ کی تشخیص کے مطابق یہ حلق کی سوزش تھی۔چنانچہ وہ ایک طویل عرصے تک بستر کے ساتھ جکڑا رہا۔مہینوں گزر گئے مگر جیسا کہ تورگنیف خود کہتا ہے، وہ ''کوئی غیر متحرک سی چیز'' بنا لیٹا رہا۔

دودھ کی غذا اُسے مُفید ثابت ہوئی، چنانچہ ستمبر کے آغاز تک اس میں اتنی طاقت عود کر آئی کہ اُس نے Beyond Death کو مکمل کر دیا۔یہ افسانہ بعد ازاں Clara Mitich کے عنوان سے شائع ہوا۔

ایک سال اسی طرح گزر گیا جنوری ۱۸۸۳ء میں اس پر عمل جراحی کیا گیا۔جب آپریشن کے کچھ روز بعد دادے[1] اُس سے ملنے کے لیے آیا تو روسی انشا پرداز نے اُسے بتایا کہ وہ آپریشن کے دوران میں میز پر لیٹا اپنے درد کا تجزیہ کر رہا تھا اور ایسے لفظ سوچ رہا تھا کہ جس سے اُس وقت کے احساسات بیان ہو سکیں جب اُس کے جسم میں نشتر داخل ہوا تھا۔اُس نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''ایسا معلوم ہوا کہ چاقو کیلے کو کاٹ رہا ہے''

آپریشن کے دو ہفتے بعد تورگنیف کی طبیعت قدرے بحال ہوگئی۔ اس وقتی صحت کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے کہا ''میں اپنے آپ کو اس قدر تندرست محسوس کر رہا ہوں کہ میرا ناچنے کو جی چاہتا ہے ـــــ مگر اچانک مرض خطرناک صورت اختیار کر گیا اور ایک معتما سا بن کر رہ گیا۔ دراصل اس کی ریڑھ میں ورم ہوگیا تھا۔

درد کو کم کرنے کے لیے اُسے افیون کا جوہر دیا جاتا تھا۔ اس نشہ آور دوا کے کثرتِ استعمال نے اُس کے دماغی اعصاب پر بہت اثر کیا۔ چنانچہ وہ اس قدر زور سے چیختا رہتا کہ اُس کی چیخیں بازار میں بخوبی سنائی دیتی تھیں۔ وہ مرنے کی خواہش کرتا تھا۔ اس غرض کے لیے اس نے کئی مرتبہ زہر بھی طلب کیا۔ اس کے دماغی اضطراب اور خلل کو وہ طول طویل اور غیر مربوط تار ظاہر کرتے ہیں جو اُس نے اپنے دوستوں کو بھیجنے کی خاطر لکھوائے۔

ایک مرتبہ اُس نے روسی سفیر سے جو اُس کے بستر کے پاس کھڑا تھا جھنجلا کر کہا ''تم مجھے بیڑیاں کیوں پہنا رہے ہو؟'' اسی طرح اُس نے ایک رات گھنٹی کی زنجیر کھینچ کر گھر بھر کو جگا دیا اور جب مادام وائردو[2] اس کے پاس آئی تو تورگنیف نے رسی سے بندھی ہوئی پیتل کی گیند اس کی طرف پھینک کر چلاتے ہوئے کہا'' آہ! یہ ہے لیڈی میکبتھ!۔''

جب یہ طوفان کچھ کم ہوا تو ایفان تورگنیف نے اپنے دوست انین کوف سے کہا ''میں سمندر کہ تہہ میں غوطہ زن تھا، وہاں میں نے بہت بھیانک اور خوفناک مخلوق دیکھی ہے۔ یہ منظر آج تک کسی انسانی قلم نے بیان نہیں کیا ہے!۔''

اس کا خیال تھا کہ وہ صحت مند ہونے پر وہ تمام کیفیات صفحۂ قرطاس پر منتقل کرے گا۔

چند ماہ تک تورگنیف کی طبیعت خوش رہی۔ اس دوران میں ایک روز اس نے مادام وائردو کو اپنے پاس بلا کر نمناک آنکھوں سے کہا:

''میں ایک افسانہ لکھنا چاہتا ہوں جو میرے دماغ میں محفوظ ہے، لیکن یہ مجھ سے خود نہ لکھا جائے گا۔''

مادام وائردو نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا:

''تو آپ بولتے جایئے، میں لکھتی جاؤں گی، گو میں روسی زبان تیزی سے نہیں لکھ سکتی، لیکن اگر آپ نے ذرا تحمل سے کام لیا تو آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔''

''نہیں نہیں، اگر میں روسی زبان میں لکھواؤں گا، تو مجھے ہر جملے اور ہر لفظ پر غور کرنے کے لیے ٹھہرنا پڑے گا اور میں یہ چاہتا نہیں، میں یہ افسانہ ان مختلف زبانوں میں بولتا جاؤں گا جو مجھے اور تمہیں آتی ہیں۔ اس طرح مجھے اپنے اظہار میں دقت محسوس نہ ہوگی۔''

چنانچہ یہ افسانہ جو بعد میں An End کے عنوان سے شائع ہوا، لکھا گیا۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تورگنیف کی فن کاری ایک دائرے پر گھوم کر پھر اپنے اصل مقام پر آ گئی ہے۔

افسانہ لکھانے کے چند ماہ بعد اس کی طبیعت یکا یک پھر خراب ہوئی اور پھر سنبھلنے نہ پائی۔ مرض کی تکلیف سے تنگ آ کر اس نے کئی مرتبہ خودکشی کا ارادہ کیا۔ ماپیاں اس کی موت کے پانچ روز پیشتر اس سے ملاقات کرنے کے لیے آیا۔ تورگنیف نے اس سے التجا کی کہ وہ دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے اسے پستول لا دے۔

اب جسمانی لحاظ سے تورگنیف کا مضبوط اور توانا جسم ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور باہیں چھڑیوں کی طرح پتلی ہو گئی تھیں۔ اپنی یہ حالت دیکھ کر ایک روز اس نے یہ کہا

''ٹڈے ایسی ٹانگوں کے ساتھ انسان کیونکر زندہ رہ سکتا ہے؟''

اگست کے آخری دن، یعنی جمعے کے روز لوئی [3] مریض کے کمرے میں آئی۔ تورگنیف نے اسے پہچان لیا مگر بایں ہمہ اس کا دماغ دھند میں ملفوف تھا۔

''دیکھو لوئی'' تورگنیف نے اس سے کہا:

''دیکھو، کس قدر تعجب کی بات ہے کہ میری ٹانگ اس کونے میں معلق ہے۔ کمرہ تابوتوں سے بھرا ہے لیکن انہوں نے مجھے تین دن اور جینے کی مہلت دے دی ہے۔''

اتفاق سے اس کا کہنا درست نکلا۔

اتوار کے روز وہ بولنے لگا، مگر جس زبان میں وہ بولتا تھا وہ فرانسیسی تھی اور نہ روسی بلکہ روسی کسانوں کی خام زبان تھی جسے کوئی سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ میریانی [4] اور مادام شیموریت [5] سے مخاطب ہو کر کچھ کہتا تھا مگر وہ سمجھ نہ سکتی تھیں۔ مرنے سے کچھ عرصہ پہلے بغلگیر ہونے کے لیے اس نے ان کی طرف ہاتھ پھیلائے اور پریشان آنکھوں سے دیکھتے ہوئے یہ کہا:

''آؤ، میرے نزدیک آ جاؤ۔ مجھے محسوس کرنے دو کہ تم میرے نزدیک ہو۔ روسی زاروں کی طرح اب رخصت لینے کا وقت آ گیا ہے۔''

ایک لمحہ کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ اس نے مادام وائردو کو پہچان لیا ہے۔ چنانچہ فوراً اس سے مخاطب ہوا "یہ ہے سب سے بڑی ملکہ، یہ کس قدر مہربان ہے۔"

اب اس کے لبوں پر دہقانوں کی سیدھی سادی گفتگو تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو قریب المرگ دہقان تصور کر رہا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے الفاظ بکھرتے گئے اور اس کی گفتگو غیر مربوط ہو گئی۔

پیر کے روز سہ پہر کے وقت اس کی سانس اکھڑ گئی۔ وہ خاموش لیٹا ہوا تھا۔ دو بجے کا وقت تھا کہ وہ اپنے بازو آخری مرتبہ پھیلا کر سرد ہو گیا۔ روسی افقِ ادب کا درخشندہ ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

حواشی

۱: فرانس کے مشہور انشاپرداز۔ یہ تورگنیف کا دوست تھا۔

۲: مشہور فرانسیسی مغنیہ۔ اس سے تورگنیف کو بہت محبت تھی۔

۳: مادام وائرادو کی بڑی لڑکی۔

۴: مادام وائردو کی دوسری لڑکی۔

۴: کہا جاتا ہے کہ یہ تورگنیف کی اپنی لڑکی تھی۔

دوستوفسکی ـــــ پیدائش سے موت تک

(رُوس کے مشہور قصہ نویس کی زندگی کی داستان)

اُنیسویں صدی کے آخری نصف میں رُوسی ادب کے پردے پر دو عظیم الشان مفکر نمودار ہوتے ہیں، جن کی شہرت رُوس کی سرحدوں سے نکل کر دُنیا کے ہر گوشے میں پھیل گئی ـــــ ہماری مراد کاؤنٹ لیو طالسطائی اور فیڈرایم دوستوفسکی سے ہے ـــــ نفسیات، کردار، زندگی اور طرز انشا کے لحاظ سے دونوں میں بہت فرق ہے ـــــ نواب طالسطائی نے اپنا بچپن بڑے خوش گوار ماحول میں بسر کیا۔ اس کی جوانی فوجی سرگرمیوں میں گزری۔ اس کا خاندان بہت اونچا اور متمول تھا۔ اس کے برعکس دوستوفسکی کی زندگی نہ ختم ہونے والی تکلیفوں کا مجموعہ تھی۔ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا اور تادمِ آخر مفلسی کے پنجے میں جکڑا رہا۔ طالسطائی خیرات دیا کرتا تھا۔ دوستوفسکی خیرات لیا کرتا تھا۔

ایک مغربی نقاد طالسطائی اور دوستوفسکی کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"دوستوفسکی کو دولت سے محبت تھی یا وہ یہ سمجھتا تھا کہ اُسے دولت سے محبت ہے، مگر دولت کو اس سے قطعاً محبت نہیں تھی۔ طالسطائی دولت سے نفرت کرتا تھا یا وہ یہ سمجھتا تھا کہ اُسے دولت سے نفرت ہے، مگر دولت کو اس سے نفرت نہیں تھی۔ روپیہ پیسہ خود بخود اس کی طرف کھنچا آتا تھا"۔

طالسطائی صحت مند اور تندرست تھا مگر دوستوفسکی سدا بیمار رہا۔ وہ مرگی جیسے موذی مرض کا شکار تھا۔ اس کے پہلے دورے اسے سائبیریا میں پڑے تھے۔ یہ مرض اسے باپ سے وراثت میں ملا تھا۔

دوستوفسکی زندگی بھر مفلس رہا۔ قرض خواہ ہمیشہ اس کے پیچھے پیچھے لگے رہتے تھے اور وہ اُن کے آگے آگے بھاگتا رہتا تھا ــــــ

یہ سچ ہے کہ اُس کی زندگی بہت ہی دُکھ بھری تھی لیکن اگر وہ ضروریات زندگی سے بے نیاز ہوتا؛ اس کے پاس آرام کی زندگی بسر کرنے کے لئے دولت ہوتی، تو اس کی شہرہ آفاق تصانیف کبھی معرض وجود میں نہ آتیں ــــــ اگر اُس نے تکلیفیں نہ سہی ہوتیں تو دوستوفسکی کے نام سے آج کوئی بھی واقف نہ ہوتا۔ دراصل ''غریب لوگ''، ''مردوں کا گھر''، ''جرم اور سزا'' اور ''کیراموزوف برادران'' اس کے روحانی اور جسمانی دُکھ ہیں، جن کو اس نے اپنے مضطرب قلم سے کاغذوں پر منتقل کر لیا۔ وہ دُنیا کا سب سے بڑا ناول نویس اس لیے ہے کہ اس نے ظلمت کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگا کر روشنی کی کرنیں باہر نکالیں، جو سدا اپنا نور پھیلاتی رہیں گی۔

دوستوفسکی کی سیرت پر غور کرتے وقت ایک بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے، کہ اُسے زندگی میں ایک بار موت کے بالکل روبرو آنا پڑا۔ ان دنوں روس میں کارل مارکس کا اثر بڑھ رہا تھا۔ اشتراکی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ۲۳۔ اپریل سن اٹھارہ سو انچاس کو ایک اشتراکی انجمن پر پولیس نے دھاوا بولا اور سب ممبروں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں دوستوفسکی بھی شامل تھا۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ سماعت کے دوران میں، جو کافی دیر تک جاری رہی، دوستوفسکی اپنے بھائی مائیکل کو خط لکھتا رہا اور اپنے حالات سے باخبر کرتا رہا ــــــ ایک خط میں وہ لکھتا ہے:

''اپنی صحت کے متعلق میں تمہیں کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں دے سکتا ــــــ میرے سینے میں کچھ دنوں سے شدت کا درد ہو رہا ہے۔ ایسا درد پہلے مجھے کبھی نہیں ہوا۔ یہ تو خیر کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب میری سوچنے سمجھنے کی قوت، حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی ہے۔ جب رات کا اندھیرا چھاتا ہے تو مجھے بڑے لمبے اور خوفناک خواب آتے ہیں۔ کچھ دنوں سے برابر یہ احساس ہوتا ہے کہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک رہی ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ حوالات کی کوٹھری کے بجائے میں کسی سمندری جہاز کے کیبن میں بیٹھا ہوں۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میرے اعصاب بہت ہی کمزور ہو گئے ہیں۔ پہلے جب مجھے اس قسم کی تکلیف ہوا کرتی تھی، تو میں اس سے فائدہ اٹھایا کرتا تھا، لکھنا شروع کر دیتا تھا، کیونکہ ایسی حالت میں انسان زیادہ اور بہت بہتر لکھتا ہے۔ مگر میں

اب اس ڈر کے مارے نہیں لکھتا کہ میری صحت پر اس کا برا اثر پڑے گا''۔

تین ہفتوں کے بعد وہ پھر اپنے بھائی کو لکھتا ہے:

''خزاں کے دن قریب آ رہے ہیں، ساتھ ہی میری اداسیوں کے لمحات بھی ـــــ خیر کچھ بھی ہو لیکن اب تک تو میری صحت ٹھیک ہی رہی ہے ـــــ میرا خیال تھا کہ مجھے بہت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن میں اب دیکھتا ہوں کہ میرے اندر مقابلے کی قوت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ طاقت جلدی ضائع ہونے والی نہیں ـــــ پانچ مہینے گزر چکے ہیں کہ میں صرف ایک سہارے پر جی رہا ہوں۔ یہ سہارا میرا دماغ ہے۔ ابھی تک یہ انجن بالکل درست حالت میں ہے اور اپنا کام کیے جا رہا ہے لیکن سوچتے رہنا، اور ہر وقت سوچتے رہنا جبکہ باہر سے کوئی چیز بھی خیالات اور افکار کی مدد نہیں کرتی ـــــ یہ بہت بڑی اذیت ہے ـــــ سینے سے جو چیز بھی اُٹھتی ہے، دماغ میں چلی جاتی ہے۔ اور وہاں جا کر خیال بن جاتی ہے ـــــ یقین کرو کہ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہر چیز فکر کی صورت اختیار کر چکی ہے مگر اس کے باوجود دماغی کام دن بدن شدت اختیار کر رہا ہے۔''

سزائے موت

کئی مہینوں کی مسلسل تھکا دینے والی سماعت کے بعد اس سازشی مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا اور ہر ایک کو موت کی سزا ملی۔ دوستوفسکی لکھتا ہے:

''سزائے موت کا فیصلہ مجھے جیل کی کوٹھڑی میں سنایا گیا۔ اس پر عمل کب ہونے والا تھا، یہ نہ بتایا گیا۔ لیکن آدھے گھنٹے کے بعد ہی جیلر آیا اور مجھے تیار ہونے کا حکم دے گیا۔ بڑی نگہداشت سے مجھے صحن میں لایا گیا۔ جہاں میرے انیس ساتھی اور موجود تھے۔ اس وقت صبح کے کوئی سات بجے ہوں گے۔ ہمیں گاڑیوں میں بٹھایا گیا۔ ایک گاڑی میں چار چار۔ ہر ایک گاڑی کے ساتھ ایک ایک سپاہی بھی تھا ـــــ گاڑی کی شیشہ لگی کھڑکیاں برفباری سے دھندلی ہو رہی تھیں۔ اس لیے باہر کا منظر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آخر کار ہم سین نوفسکی کے چوک میں پہنچے۔

ایک اونچا سا مچان تھا، جس پر ہم سب کو چڑھا دیا گیا۔ دورویہ کھڑا کرنے کے بعد ہمیں پھر موت کا حکم پڑھ کے سنایا گیا ـــــ اس فیصلے میں متواتر بیس مرتبہ یہ منحوس لفظ دہرایا گیا

تھا۔

میرے پاس کھڑے ساتھی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا ''موت —— موت''۔

''میں نے بھی زیرلب کہا موت —— موت —— ''، لیکن ایک دم چونکا، نہیں، نہیں ہمیں ہلاک نہیں کیا جائے گا۔''

میرے ساتھی نے سامنے اشارہ کیا۔''وہ دیکھتے ہو سامنے کیا پڑے ہیں۔''

میں نے سہم کر کہا ''تابوت''۔

میرے ساتھی نے آہ بھری ''ہاں تابوت۔ جب ہم مر جائیں گے تو ان میں ہماری لاشیں ......''

دوسرے نے ٹھٹھری ہوئی آواز میں کہا۔''کتنی سردی ہے''۔

میں نے جواب دیا۔''مجھے تو محسوس نہیں ہوتی۔ بادلوں میں سے سورج نکل آیا ہے''۔

میرے پاس کھڑے ساتھی نے پھر ایک آہ بھری۔''سب سے پہلے پٹروسکی اور اس کے دو ساتھیوں کو گولی کا نشانہ بنایا جائے گا۔''

میں نے اپنے سامنے دیکھا۔''یہ کون آرہا ہے''۔

میرے ساتھی نے جواب دیا۔''پادری''۔

پادری آیا اور اُس نے ہم سب کو مخاطب کیا۔''میرے بچو! تم میں سے کون کون اپنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہے۔''

میں نے کہا۔''مجھے کوئی اعتراف نہیں کرنا ہے۔''

پادری نے میرے ساتھی سے پوچھا۔''تمہیں''

اُس نے جواب دیا۔''نہیں''

پادری نے دوسرے سے پوچھا۔''تمہیں میرے بچے''۔

اُس نے بھی جواب دیا۔''جی نہیں''۔

ایک دم کوئی بلند آواز میں چلایا۔''بندوقیں بھرلو —— '' اس کے بعد بندوقیں بھرنے کی آواز آئی۔

میرے ساتھی نے مجھ سے پوچھا!

"یہ تم کدھر دیکھ رہے ہو"۔

میں نے جواب دیا:

"وہ سامنے گرجے کے چمکتے ہوئے کلس کو دیکھ رہا ہوں—— سورج کی کرنوں میں کتنا چمک رہا ہے—— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کرنیں بھی وہیں سے آ رہی ہیں جہاں میں چند منٹوں کے بعد پہنچ جاؤں گا۔"

ایک دم پھر آواز بلند ہوئی "تیار ہو جاؤ—— ایک—— دو—— لیکن فوراً ہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور کوئی چلایا "ٹھہر جاؤ—— ٹھہر جاؤ——" گھڑسوار سپاہی آیا اور اس نے یہ اعلان کیا:

"بادشاہ سلامت نے ان سب کی جان بخشی کا حکم بھیجا ہے—— یہ فرمان ملاحظہ فرمایئے۔"

سبق کا مہلک اثر

"بعد میں معلوم ہوا کہ سزائے موت کا حکم ہمیں صرف ڈرانے کے لیے دیا گیا تھا تا کہ عمر بھر کے لئے سبق ہو جائے لیکن یہ سبق ہم میں سے بعض کے لیے بہت مہلک ثابت ہوا۔ گریگوریف کو جب بلی سے کھولا گیا تو اس کا دماغ صدمے کے باعث ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ ہم میں سے ہر ایک پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر آخر عمر تک باقی رہا۔ مچان پر چڑھانے سے پہلے ہمارے تمام کپڑے اتروا لیے گئے تھے اور سفید قمیصیں پہنا دی گئی تھیں جو ہمارا کفن ہونے والی تھیں—— بیس منٹ سے زیادہ دیر تک ہمیں خون منجمد کر دینے والی سردی میں کھڑا رکھا گیا—— جب ہم واپس جیل خانے میں آئے تو ہم میں سے اکثر کی انگلیاں اور کان سوجے ہوئے تھے۔ ایک کا پھیپھڑا متورم ہو گیا تھا۔ یہ ورم بعد میں دق کے خوفناک مرض میں تبدیل ہو گیا۔"

خیالات میں طوفان

جس شخص نے موت کو اس قدر قریب سے دیکھا ہو۔ صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ ہاتھ سے چھوا ہو اور اتنا بڑا صدمہ برداشت کیا ہو اس کے ذہنی تلاطم اور روحانی طوفان کا اندازہ وہی کر سکتا ہے، جس نے ایسے حالات کا سامنا کیا ہو—— وہ جوئے فکر جو ہمیں اس کی پہلی تصنیف "غریب لوگ" میں نظر آتی ہے، طوفانی سمندر کی صورت جبھی اختیار کرتی ہے، جب وہ سائبیریا میں چار سال جلاوطنی کے سیاہ ترین ایام

گزارنے کے بعد آتا ہے اور قلم ہاتھ میں لیتا ہے ـــــ سزائے موت، چار سال کی سزا میں تبدیل کر دی گئی تھی اور سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں اس آتشیں قلم ادیب کو دھکیل دیا گیا تھا ـــــ ان برفوں میں جانے سے پہلے اس نے اپنے بھائی کو ایک خط لکھا:

''پیارے بھائی!

میں بالکل افسردہ نہیں ہوں۔ میں نے غم کو اپنے پاس پھٹکنے تک نہیں دیا ـــــ زندگی ہر جگہ زندگی ہے، زندگی وہی ہے جو ہمارے اندر ہے نہ کہ وہ جو باہر ہے۔

میرے ساتھ اور بھی بہت لوگ ہوں گے ـــــ عوام کے درمیان معمولی انسان کی حیثیت میں رہنا، ہمیشہ اسی طرح زندگی بسر کرنا اور مصائب کی پروا نہ کرنا ـــــ یہ ہے زندگی ـــــ یہی ہے زندگی کا اصلی مقصد۔ میں اس چیز کو بخوبی سمجھ چکا ہوں۔ یہ خیال میرے گوشت پوست، رگ رگ اور نخ نخ میں سرایت کر گیا ہے اور یہ بالکل صداقت پر مبنی ہے۔

وہ سر، جو خیالات و افکار کی تخلیق کرتا تھا؛ وہ سر، جو آرٹ کی بلندیوں میں اپنا آشیانا بنائے تھا اور جو روح کی بلند ترین ضروریات سے آگاہ اور ان کا عادی تھا ـــــ وہ سر، اب میرے شانوں سے علیحدہ ہو چکا ہے ـــــ وہاں ان تخیلات کے دھندلے نقوش باقی رہ گئے ہیں، جو میں ابھی صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں کر سکا۔ یہ افکار ذہنی عذاب کا باعث ضرور ہوں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میرے دل میں ابھی تک وہ خون اور گوشت موجود ہے جو محبت بھی کر سکتا ہے، مصیبت بھی جھیل سکتا ہے، جو خواہش بھی کر سکتا ہے اور آخر یہی تو زندگی ہے۔

اگر کوئی شخص میرے متعلق اپنے دل میں کدورت رکھتا ہے، میں نے کسی سے جھگڑا کیا ہے یا میں نے کسی کے دل پر برا اثر چھوڑا ہے تو اس سے ملو اور میری طرف سے التجا کرو کہ وہ مجھے معاف کر دے ـــــ میرے دل میں ذرہ بھر میل نہیں ہے۔ اس وقت میری یہی خواہش ہے کہ میں اپنے احباب میں سے کسی کے گلے ملوں ـــــ اس سے دل کو اطمینان ہوتا ہے ـــــ میرا خیال تھا کہ میری موت کی خبر تمہیں ہلاک کر دے گی لیکن اب تمھیں کوئی فکر نہیں کرنا چاہیے میں زندہ ہوں اور اس وقت تک زندہ رہوں گا، جب ہم دونوں دوبارہ بغل گیر ہوں گے۔

ماضی کی طرف رخ پھیر کر دیکھتا ہوں کہ بہت فضول وقت ضائع ہوا ہے۔ بیشتر ایام خوابوں،

غلط کاریوں اور بیکار مشاغل میں گزرے ہیں۔ میں نے کئی بار ضمیر کے خلاف کام کیا ہے۔ یقین مانو میرا دل خون روتا ہے۔

زندگی نعمت ہے۔ زندگی مسرت ہے۔ ہر وہ لمحہ جو ضائع ہو چکا ہے شادمان عرصہء زندگی ہونا چاہیے تھا۔ اب کہ میں اپنی زندگی بدل رہا ہوں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری روح نئے قالب میں داخل ہو رہی ہے۔

لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ میرے ہاتھ قلم کو ترستے رہیں گے ــــــ میرا خیال ہے کہ چار سال کے بعد مجھے قلم پکڑنا نصیب ہوگا۔ اے کاش! مجھے صرف لکھنے کی اجازت دی جائے ــــــ کتنے افکار کتنے خیالات جو میں نے تخلیق کئے تھے، تباہ ہو جائیں گے ــــــ میرے ذہن کی یہ چنگاریاں یا تو بجھ جائیں گی یا میری رگوں میں ایک آتشیں زہر بن کر حلول کر جائیں گی۔"

مُردوں کا گھر

دوستوفسکی کے ذہن کی چنگاریاں سائبیریا کی برفانی سلیں بجھا نہ سکیں جیسا کہ دوستوفسکی کا خیال تھا۔ یہ سب چنگاریاں ایک آتشیں زہر بن کر اس کی رگوں میں حلول کر گئیں۔ چار سال سائبیریا کے برفانی قید خانے کی صعوبتیں جھیلنے اور چار سال تک جلاوطنی کی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد قانون کے پنجے سے روس کے اس عظیم الشان مفکر کو نجات حاصل ہوئی۔ اٹھارہ سو انسٹھ میں جب انھیں وطن لوٹنے کی اجازت ملی تو اس نے "مردوں کا گھر" نامی ناول لکھا جس میں اس نے اپنے ایام اسیری کا نقشہ بڑے زوردار انداز میں کھینچا۔ اس کتاب نے دوستوفسکی کو روس کے اکناف واطراف میں مشہور کر دیا۔

سن اٹھارہ سو اکسٹھ میں اس نے اپنے بھائی میکائیل کی مدد سے ایک رسالہ بعنوان "زمانہ" جاری کیا لیکن دو سال کے بعد ہی حکومت نے اُس کو ضبط کر لیا۔ اٹھارہ سو چونسٹھ میں دوستوفسکی نے ایک اور رسالہ جاری کیا مگر بھائی کی موت کے باعث اسے اس کی اشاعت بند کرنا پڑی ــــــ آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، بھائی کے خاندان کا سارا بوجھ اب اس کے سر پر آپڑا تھا۔ قرض خواہوں کا جھمگھٹا لگا رہتا تھا۔ پھر آپ کو قمار بازی کا بھی شوق تھا، تھوڑا بہت جو کچھ بھی آتا جوئے کی نذر ہو جاتا تھا ــــــ یہ زمانہ دوستوفسکی کے لیے بہت ہی خراب تھا۔ ایک لمحے کے لیے سکون میسر نہیں تھا۔ قرض خواہوں کے تقاضوں سے بچنے کے لیے وہ ایک بار روس چھوڑ کر یورپ بھاگ گیا، مگر فوراً ہی واپس چلا آیا، اس لیے کہ اسے اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی۔

اٹھارہ سو چھیاسٹھ میں اس نے ایک پبلشر سے کچھ روپیہ پیشگی لیا اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد اسے ایک ناول ''جرم اور سزا'' لکھ کر دے دے گا۔ وقت کم تھا یعنی بہت سا وقت دوستوفسکی فضول ضائع کر چکا تھا، اس لیے اس نے ایک سٹینو گرافر لڑکی منگوائی تا کہ جلدی جلدی ناول گھسیٹ ڈالے۔ اس لڑکی سے اس نے بعد میں بیاہ کیا ـــــ دوستوفسکی اور اس سٹینو ٹائپسٹ لڑکی کی ملاقات بہت دلچسپ ہے۔

انٹرویو

آینا انٹرویو کے لیے جب دوستوفسکی کے مکان میں سیڑھیاں طے کر کے داخل ہوئی تو اس نے سوچا'' یہ سیڑھیاں جو میں نے ابھی طے کی ہیں جانی پہچانی معلوم ہوتی ہیں ـــــ ارے ہاں ـــــ دوستوفسکی صاحب کے ایک ناول میں ان ہی کا تو ذکر تھا ـــــ اور یہ دروازہ ـــــ ہو بہو وہی ہے''۔ دستک دینے پر دروازہ کھلا اور ایک لم ڈھیل آدمی نے باہر نکل کر اینا سے پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

اینا نے جواب دیا۔

''مجھے دوستوفسکی صاحب سے ملنا ہے۔''

لمبی ڈاڑھی والے نے پوچھا ـــــ ''کیا کام ہے؟''

اینا نے جواب دیا۔'' مجھے میری استانی نے بھیجا ہے۔ دوستوفسکی صاحب نے ان سے کہا تھا کہ انہیں ایک سٹینو ٹائپسٹ کی ضرورت ہے۔''

لمبی ڈاڑھی والا۔'' ذرا ٹھہرو یہاں'' کہہ کر اندر چلا گیا۔ چند لمحات کے بعد لوٹا اور اینا کو مخاطب کر کے کہا۔'' اب تم آ سکتی ہو۔''

جب اینا کمرے کے اندر گئی تو لمبی ڈاڑھی والے نے اس سے کہا۔'' اب بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔''

اینا نے جواب دیا۔

'' مجھے میری استانی نے بھیجا ہے۔ دوستوفسکی صاحب نے ان سے کہا تھا کہ انھیں اپنے کام کے لیے ایک سٹینو ٹائپسٹ لڑکی کی ضرورت ہے ـــــ میں دوستوفسکی صاحب سے ملنے آئی ہوں۔''

لمبی ڈاڑھی والے نے کہا۔

'' میں ہی دوستوفسکی ہوں ـــــ میں نے تمھیں تھوڑی دیر باہر اس لیے روکا تھا کہ مجھے کپڑے تبدیل کرنے تھے۔''

اینادم بخود ہوگئی۔ ''آپ ـــــ آپ ہی دوستوفسکی ہیں۔''

دوستوفسکی: ''ہاں ہاں میں ہی ہوں ـــــ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے ـــــ سگریٹ پیوگی۔''

اینا: ''جی نہیں۔ میں سگریٹ نہیں پیا کرتی۔''

دوستوفسکی: ''خوب تو قصہ یہ ہے کہ میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے ـــــ تمھارا نام۔''

انیا: ''جناب میرا نام اینا فیدر وفنا ہے۔''

دوستوفسکی: ''اینا فیدر وفنا ـــــ اچھا نام ہے۔ میرا مطلب ہے برا نہیں ـــــ ہاں تو لو یہ سگریٹ پیو۔''

اینا: ''میں ـــــ میں سگریٹ نہیں پیا کرتی جناب۔''

دوستوفسکی: ''اوہ --- یہ تو بہت اچھی بات ہے --- اب سوال یہ ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے ـــــ مگر ٹھہرو۔ میں تمہیں ایک سیب دیتا ہوں ـــــ بڑا میٹھا ہے ـــــ ایک تم کھاؤ ایک میں کھاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے صندوق سے سیب نکالا اور اینا کو دیا جو ابھی تک دوستوفسکی سے مرعوب تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد دوستوفسکی چلایا۔

''میرے منہ کی طرف کیا دیکھتی ہو ـــــ کھاؤ ـــــ چاقو واقو یہاں نہیں ہے میرے پاس ـــــ دانتوں ہی سے کاٹو۔''

اینا: ''شکریہ''۔

دوستوفسکی: ''تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں دو سو روبل پیشگی لے کر ہضم کر چکا ہوں۔ اگر میں پندرہ دنوں میں ناول کے پہلے باب پبلشر کے حوالے نہ کر سکا تو ایک آفت برپا ہو جائے گی ـــــ تمھیں اس کا پورا پورا خیال ہونا چاہیے ـــــ سمجھتی ہو۔''

اینا: ''جی ہاں''

دوستوفسکی: ''صرف جی ہاں کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا ـــــ یہ ناول مجھے بہت جلد ختم کر دینا ہے ـــــ اور ـــــ اور ـــــ میں کیا کہہ رہا تھا ـــــ ہاں ـــــ لیکن یہ کیا؟''

اینا: ''کیا جناب؟''

دوستوفسکی: ''یہ تمھارے بال ـــــ تمھیں شرم آنی چاہیے، اینا ـــــ''

اینا: ''کیوں جناب''

دوستوفسکی: ''کیوں کی بھی اچھی رہی۔ سراسر تم نے مصنوعی بال لگا رکھے ہیں۔''

اینا نے جواب دیا:

''جی نہیں۔ یہ بال تو میرے اپنے ہیں۔''

دوستوفسکی: ''جھوٹ ــــ بالکل جھوٹ ــــ اتنے لمبے بال اصلی ہو ہی نہیں سکتے ــــ تم مجھے دھوکا دینا چاہتی ہو۔ اچھا۔ بھلا۔ میں دیکھتا ہوں۔''

یہ کہہ کر دوستوفسکی نے اس کے بال کھینچنا شروع کیے۔ وہ بے چاری آہستہ آہستہ ''سی سی'' کرتی رہی۔

جب دوستوفسکی کو اطمینان ہوگیا تو اس نے مسکرا کر کہا ''نہیں۔ یہ تو سچ مچ تمھارے اپنے ہی بال ہیں۔ خیر میرا اطمینان ہوگیا ہے۔ لو اب ایک سگریٹ پیو۔''

اینا: ''جی نہیں شکریہ۔ میں سگریٹ نہیں پیا کرتی۔''

دوستوفسکی: ''تو ہٹاؤ ــــ آؤ کوئی کام کی بات کرتے ہیں ــــ ہاں تو سارا فساد اسی ناول کا ہے جو مجھے بہت جلد لکھ کر اس کم بخت پبلشر کے حوالے کر دینا چاہیے۔ میں سچ کہتا ہوں اینا ابھی سے اس نے تقاضے شروع کر دیے ہیں۔ اگر میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا تو وہ میری زندگی اجیرن کر دے گا۔ تم نہیں جانتی ہو کہ یہ لوگ کیسے ظالم ہوتے ہیں۔''

محبت اور شادی

اینا فیدروفنا کچھ عرصے تک دوستوفسکی کی سیکرٹری رہی لیکن اس دوران میں دوستوفسکی کو اس سے بے پناہ محبت ہوگئی۔ چنانچہ ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اینا فیدروفنا نے اپنے سنکی شوہر کی بہت مدد کی۔ یہ اس کی انتھک اور مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ''جرم اور سزا'' لکھنے کے بعد دوستوفسکی قرضے کا بوجھ کسی قدر ہلکا کر سکا اور پیٹرز برگ میں اس کی زندگی کے بقایا دن نسبتاً آرام اور سکون کے ساتھ گزرے۔ اینا فیدروفنا نے دوستوفسکی کے لیے بہت کچھ کیا مگر وہ اس کی فضول خرچی اور جوئے کی عادت درست نہ سکی۔ اینا اپنی کتاب میں ایک واقعہ بیان کرتی ہے:

''میں حاملہ تھی۔ ایک روز میں نے اپنے شوہر سے جل بھن کر کہا ''کئی دنوں سے میری طبیعت اچھی نہیں ــــ سارا دن جی متلاتا رہتا ہے۔ آپ میرے پاس نہیں بیٹھتے اور جوا کھیلنے چلے جاتے ہیں ــــ اس وقت بھی ضرور جوئے خانے سے آئے ہوں گے۔''

جواب ملا: ''آیا تو وہیں سے ہوں لیکن میں تم سے کیا کہوں اپنا ـــــ آج میں نے کم از کم ـــــ کم از کم پانچ سو روبل جیتے ہوتے اگر وہ منحوس آدمی وہاں موجود نہ ہوتا۔''

میں نے کہا: ''آپ ہار کر ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں۔''

بولے: ''تم یقین کرو اب کی دفعہ یہ سب کچھ اس منحوس آدمی کی وجہ ہوا ہے جو بار بار میری طرف دیکھتا تھا۔''

میں نے جھلا کر پوچھا ''کون تھا وہ کم بخت؟''

جواب دیا: ''جانے کون بلا تھا ـــــ لیکن سچ کہتا ہوں ایسی منحوس شکل میں نے کبھی نہیں دیکھی ـــــ کانا تھا کم بخت ـــــ میں نے جب داؤں پر روپیہ لگایا تو اس نے اپنی ایک آنکھ سے میری طرف دیکھا ـــــ بس ـــــ ہار گیا۔''

میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا ''کل گنجا تھا۔ آج کانا ہے۔ پرسوں کوئی لولا لنگڑا ہوگا۔ آپ کو تو ایسے بہانے ملتے ہی رہیں گے ـــــ میں سچ کہتی ہوں آپ کبھی نہیں جیت سکتے۔''

یہ سن کر آپ اکڑ گئے ''ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ تم مجھے دس روبل اور دو تو، اگر شام تک تمھیں پانچ سو روبل بنا کر نہ لا دوں تو میرا نام دوستوفسکی نہیں۔''

میں نے کہا ''پندرہ روبل میرے پاس بچے ہیں۔ ان پر بھی آپ کی نظر ہے۔''

انھوں نے حسبِ معمول مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا ''نظر نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تک جو کچھ ہارا ہے واپس آ جائے اور مجھے یقین ہے کہ اب گیا تو ضرور بہت بڑی رقم جیتوں گا۔''

قہر درویش بر جان درویش مجھے کہنا پڑا۔ ''اچھا لے جایئے دس روبل، اگر ہو سکے تو میرے لیے لیمونیڈ کی ایک بوتل لیتے آیئے۔ کئی دنوں سے میرا جی اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔''

آخری تصنیف

قمار بازی اور فضول خرچی کی عادت جو پک کر طبیعت بن چکی تھی، اپنا سدھار نہ سکی، لیکن پھر بھی دوستوفسکی کے آخری ایام جو اس نے پیٹرز برگ میں گزارے اُس کی پہلی زندگی کے مقابلے میں بہت خوشگوار تھے ـــــ ''جرم اور سزا'' کی اشاعت کے بعد اُس نے ''کیراموزوف برادران'' نامی ناول لکھا۔ اس کے ایک برس بعد جب کہ اس کی شہرت اپنی معراج کو پہنچ چکی تھی دوستوفسکی روس کے عظیم

الشان شاعر پوشکن کی برسی پر روح پرور تقریر کرنے کے دوڈھائی مہینے بعد راہی ملک عدم ہوا ـــــ جنوری ۱۸۸۱ء میں اس کے پھیپھڑوں میں کوئی نقص پیدا ہوا جو بڑھتے بڑھتے خوفناک مرض کی شکل اختیار کر گیا۔ روزانوف کہتا ہے کہ، ہر مشکل وقت پر دوستوفسکی ''گوسپلز'' کے اس نسخے سے فال نکالا کرتا جو سائے بیریا میں اس کے پاس رہا تھا ـــــ اس نسخے سے ایک روز اس نے فال نکالی اور اپنی بیوی سے کہا ''سنتی ہو ـــــ اس کا یہ مطلب ہے کہ میں مرنے والا ہوں'' ـــــ اسی روز شام کو وہ مر گیا۔

اس کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اُٹھا ـــــ سوگ کرنے والوں میں ہر طبقے کے آدمی تھے۔ خاندانی عورتیں تھیں اور ساتھ ساتھ کسبیاں بھی تھیں۔ بڑے بڑے عالم تھے اور ان کے دوش بدوش جاہل کسان بھی تھے۔ بڑے بڑے عالم دین تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی تھے جنھیں مذہب سے کوئی واسطہ نہیں تھا ـــــ دوستوفسکی اب اس دنیا میں نہیں تھا ـــــ سچائی کی مشعل موت کی سرد پھونک نے بجھا دی تھی۔

☆☆☆☆☆

فرانسیسی ادب

اُنیسویں صدی کے مشہور فرانسیسی انشاپرداز

اُنیسویں صدی کے آغاز میں فرانسیسی ادب کی بیداری، روحانی[1] تحریک سے شروع ہوتی ہے جس کے ساتھ وکٹر ہیوگو اور الگزینڈر ڈوما ایسے باکمال انشاپردازوں کے نام وابستہ ہیں۔ ان نثاروں میں سے جو ہیوگو کے ہم عصر تھے قابل نقاد چارلس آگسطن سیں بیو بہت شہرت رکھتا ہے۔

چارلس آگسطن سیں بیو

سیں بیو ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۹ء میں وفات پا گیا۔ اُس نے اپنی ادبی زندگی ایک شاعر اور ناول نویس کی حیثیت سے شروع کی مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ ناول نویس کے بجائے ایک کامیاب نقاد ہے۔

سیں بیو پہلا ادبی نقاد تھا جس نے صحیح تنقید کے لیے عمیق مطالعے اور وسعتِ علم کو ضروری قرار دیا اور اس طرح تمام مروّجہ اُصولوں کو مسترد کر دیا۔ لارڈ مارلے کہتا ہے کہ فرانسیسی زبان سیکھنا صرف اسی صورت میں سودمند ہو سکتا ہے کہ یہ زبان سیکھنے کے بعد سیں بیو کی تنقیدوں کا مطالعہ کیا جائے۔

سیں بیو کے دلچسپ ترین مضامین Monday Talks میں ملتے ہیں جو کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے اخباروں میں آرٹیکل کی صورت طبع ہوا کرتے تھے۔ سیں بیو زیادہ تر صرف فرانسیسی انشا پردازوں کے افکار پر نقد و تبصرہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے کلاسیکل لٹریچر اور انگریزی ادیبوں کی کتابوں پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

سیں بیو نے ایک دفعہ کہا تھا:

''یہ میری خواہش رہی ہے کہ میں تنقید کے حسن میں ایک نیا اضافہ کرسکوں اور اس کے ساتھ ہی اس میں حقیقت کا عنصر بھی زیادہ سے زیادہ داخل کرسکوں۔''

اپنی زندگی میں سیں بیو کو ایک دفعہ ایک خشک مزاج ایڈیٹر سے واسطہ پڑا۔ بہت جھگڑوں کے بعد آخر ڈوئل تک نوبت آ گئی۔ چنانچہ دونوں میں ڈوئل ہوئی۔ اس نقاد کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں چھاتا۔ اس کی وجہ اُس نے یہ بیان کی کہ:

''مجھے مرجانا قبول ہے، مگر میں اس بارش میں بھیگنا نہیں چاہتا۔''

جارج سیں

ایمنڈائن لیوسیلی ارومادیوپن، فرانس کی مشہور ادیبہ جس کا قلمی نام جارج سیں ہے، ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئی اور ۱۸۷۶ء میں وفات پا گئی۔ اس کا نام میوسط اور چوپن کے ساتھ عاشقانہ تعلق کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس نے ایک سو کے قریب کتابیں لکھی ہیں۔

جارج سیں نے اپنی تصانیف میں بہت سے نئے الفاظ اختراع کیے ہیں جو اس کے بعد بہت سے مصنفوں نے اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے تک گسطاوٗ فلابرٹ کے ساتھ خط کتابت کرتی رہی۔ ان خطوط سے اس کی ادبی لیاقت واضح طور پر نمایاں ہے۔

اُس کی تحریر نہایت شگفتہ اور سلیس ہے۔ اُس کی پہلی کتاب بہت مشہور ہے جس میں اس نے اپنی اور چوپن کی داستانِ محبت بیان کی ہے۔

پراسپر میریمی

''کارمن'' نامی ایک مشہور رومان کا مصنف پراسپر میریمی ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۰ء میں سپردِ خاک کردیا گیا۔ اُس کا نام صرف اسی ایک رومان کا مصنف ہونے کی وجہ سے مشہور ہے جس کو بعد ازاں تمثیلی شکل میں سٹیج پر کھیلا گیا ہے۔

میریمی نے مختصر افسانے اور چند ناول بھی لکھے ہیں مگر انہیں ادب میں بلند مرتبہ حاصل نہیں ہے۔

ہانری دی بالزک

بالزک ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۰ء میں اس جہان سے رخصت ہوگیا۔ گو وہ اپنے آپ کو اس زمانے کی رومانویت سے علیحدہ تصور کیا کرتا تھا مگر یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ اس کی تحریر میں رومانی تحریک کا اثر بڑی حد تک موجود ہے۔

۱۸۴۲ء میں بالزک نے Human Comady لکھنے کی ایک سکیم تیار کی۔ اس کا ارادہ یہ تھا جیسا کہ وہ خود کہا کرتا ہے: ''میں انسانی دلوں کی ایک تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہوں۔'' چنانچہ بالزک نے ہیومن کامیڈی سپردِ قلم کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب لکھنے کا خیال اسے ڈینٹے کی ڈیوائن کامیڈی کا مطالعہ کرنے کے بعد پیدا ہوا۔

ہیومن کامیڈی مختلف حصوں میں منقسم ہے یعنی گھریلو زندگی کے مناظر، شہری زندگی کی تصاویر، سیاسی زندگی کا عکس، پیرسی زندگی کی تصویریں، فوجی زندگی کے منظر، فلسفیانہ مطالعہ اور تجزیہ نفسی۔ جیسا کہ بالزک کا خیال تھا یہ کتاب ایک سو تینتیس حصوں میں مکمل ہوتی مگر وہ ایسا نہ کر سکا اس لیے کہ وہ اس کے بیشتر مجوزہ حصے نہ لکھ سکا۔

آج تک کسی مصنف نے ایسے وسیع پیمانے پر اپنے افکار کی تخلیق کا خیال نہیں کیا اور نہ کوئی مصنف آج تک اس قسم کی ضخیم کتاب تحریر کر سکا ہے۔

بالزک کو فرانسیسی ادب میں وہی رتبہ حاصل ہے جو چارلس ڈکنز کو انگریزی ادب میں ہے۔ بالزک کی بے شمار قلمی تصاویر میں صنفِ نازک کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے۔

ہنری جیمز کہتا ہے:

''صنفِ نازک ہیومن کامیڈی کی روح رواں ہے۔ اگر اس کتاب میں سے عورتوں کے کردار نکال لیے جائیں تو یہ لاثانی شاہکار بالکل بھدا ہو جائے گا——''

سکاٹ کی طرح بالزک کی ادبی سرگرمیاں بھی مالی ضروریات کی زائیدہ تھیں۔ مگر یہ مالی مشکلات خود اسی کی پیدا کردہ تھیں۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ وہ اُسے وکالت کی تعلیم دے مگر بالزک نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی اور ادب کو اپنا ذریعہء معاش بنانے کا تہیہ کر لیا جس کی وجہ سے اسے شروع شروع میں بہت مفلسی کی حالت میں زندگی بسر کرنا پڑی۔ ۱۸۲۵ء سے لے کر ۱۸۲۸ء تک وہ روپیہ پیدا کرنے کی مختلف تجاویز پر عمل کرتا رہا۔ اس عرصے میں اس نے طابع، ناشر اور ٹائپ فونڈر کی حیثیت میں روپیہ کمانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اس سلسلے میں وہ ایک لاکھ فرانک کا مقروض ہو گیا—— یہ رقم وہ دس سال کی مسلسل کوششوں کے بعد ادا کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس قرض کے ادا کرنے میں جو محنت اسے برداشت کرنا پڑی وہ اس واقعے سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ وہ اکثر اوقات نصف شب سے لے کر دن کے چار بجے تک لکھنے میں مشغول رہا کرتا تھا۔

بالزک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُسے زندہ رہنے کا ذرا موقع نہیں ملا۔ وہ ہر وقت لکھنے میں مشغول اور قرض کی وجہ سے پریشاں رہتا تھا۔ اُس کی مالی مشکلات کی زیادہ تر وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ بہت فضول خرچ واقع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ، وہ ایسے اُمور پر بے دریغ روپیہ بہا دیا کرتا تھا جن کے متعلق وہ اچھی طرح علم و واقفیت نہ رکھتا تھا۔

گسطاوُ فلابرٹ

فلابرٹ نارمن نسل سے تھا۔ وہ ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۰ء سے لے کر ۱۸۵۶ء تک ایک کتاب ''مادام بوواری'' لکھنے میں مصروف رہا جو فرانسیسی ادب میں حقیقت نگاری کا بہترین شاہکار ہے۔

''مادام بوواری'' انیسویں صدی کے وسط کی شہری زندگی کی ایک تصویر ہے۔ یہی زندگی وہ ماحول تھا جس میں اُس نے پرورش پائی تھی، جسے وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ گو فلابرٹ طبقۂ اعلیٰ سے تعلق رکھتا تھا مگر وہ امراء کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ ''مادام بوواری'' میں اُس نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ طبقہ اعلیٰ کا کوئی فرد بغیر انفرادی صلاحیتوں کے جب اُس دُنیا کو چھوڑ کر جس میں وہ آباد ہے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، ہمیشہ نفرت انگیز ہوا کرتا ہے۔

''مادام بوواری'' کی چند نمایاں خصوصیتیں یہ ہیں:

تیز مشاہدہ، ان پیچوں کے سمجھنے کی قدرت جو عام مردوں اور عورتوں کے افعال کے محرک ہوتے ہیں، طرزِ نگارش کی خوبصورتی اور دو عام اشخاص میں تمیز کرنے کا فن۔

اسی کتاب کو شائع کرنے کی بنا پر فلابرٹ عدالت میں پیش ہوا۔ الزام یہ تھا کہ ''مادام بوواری'' مخربِ اخلاق کتاب ہے مگر یہ کتاب درحقیقت پر از اخلاق ہے جب کہ اس کا واحد سبق یہ ہے کہ انسان کو اپنی قسمت کی حدود کے اندر مطمئن زندگی بسر کرنی چاہیے۔

۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیانی عرصے میں فلابرٹ The Temptation of St. Anthony اور Salamm Bo لکھنے میں مصروف رہا جو ۱۸۶۲ء میں طبع ہو کر لوگوں کے سامنے پیش ہوئیں۔

فلابرٹ بھی مولئیر اور بالزک کی طرح فرانسیسی اکیڈمی کا رکن نہ تھا۔ گو ''مادام بوواری'' کے مصنف کو ادب میں حقیقت نگاری کے ایک ماہر کی حیثیت سے جگہ ملنی چاہیے مگر فلابرٹ عارضی طور پر ایک رومان نویس بھی تھا۔ وہ رنگ اور روشنی کا چاہنے والا تھا، اور اس کے علاوہ اسرار بھی اس کے لیے بہت

دلچسپی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے ''مادام بوواری'' تصنیف کرنے کے بعد Salamm Bo لکھی جس میں اس نے قدیم Carthage کی از سرِ نو تخلیق کی ہے۔ جب فلابرٹ نے یہ کتاب لکھنی شروع کی اس نے اپنے ایک دوست سے کہا:

''میں بدنما اشیا اور بے ہودہ ماحول سے سخت اُکتا گیا ہوں۔ اب میں کچھ عرصے کے لیے ایک نئے اور دلکش مضمون میں غوطہ زن رہ کر اس جدید دنیا سے دور رہنا چاہتا ہوں۔''

فلابرٹ کی وہ خط کتابت جو ایک عرصے تک جارج سیں کے ساتھ ہوتی رہی تھی اُس کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ یہ خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کس پایہ کا ادبی صناع تھا۔

فلابرٹ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے الفاظ کی نشست اور ان کی خوبصورتی پر بہت توجہ دیا کرتا تھا۔ وہ خوبصورت طرزِ نگارش کا اتنا مشتاق اور دلدادہ تھا کہ آخر میں اُس نے نفسِ مضمون بالکل نظر انداز کر دیا۔ اُس نے ایک دفعہ اپنے ایک دوست کو لکھا:

''میں ایک ایسی کتاب لکھنا پسند کروں گا جس کا نفسِ مضمون کچھ بھی نہ ہو جس کا وجود صرف طرزِ نگارش ہو، جیسا کہ کرۂ زمین ہوا میں بغیر کسی سہارے کے معلق ہے۔''

فلابرٹ کے افکار کا فرانسیسی ادب پر بہت اثر ہوا۔ زولا، دودے اور دی گونکور تر اُسی کے تتبع میں لکھنے والے ہیں۔

ایمل زولا

ایمل زولا کا باپ نصف اطالوی اور نصف یونانی تھا۔ زولا پیرس میں ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا۔ وہ ابھی کم سِن ہی تھا کہ والد کا سایہ اُس کے سر سے اٹھ گیا۔ افلاس کی بہت تکالیف جھیلنے کے بعد بمشکل اُسے ایک پبلشر کے یہاں منشی کا کام ملا جہاں اُسے فی ہفتہ ایک پونڈ ملا کرتا تھا۔ یہ ۱۸۶۲ء کا ذکر ہے مگر تین سال کے بعد ایک اخبار میں اس کا ایک افسانہ شائع ہوا جو بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ چنانچہ اس نے افسانہ نویسی کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۸۶۴ء میں اس نے اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا جو سب کے سب جذباتی و مثالی تھے۔

کچھ عرصے کے بعد زولا نے Rougan-Macquart کے نام سے ناولوں کا ایک سلسلہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں عام خاندانوں کے افراد کی زندگی کی تصویر کشی کرے۔ چنانچہ وہ اس مجوزہ سکیم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے تیس سال تک لگاتار لکھتا رہا۔

اس سلسلے کی ہر کتاب عمومی زندگی کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ Ventre de Paris میں بازاروں کا ذکر ہے، L، Axammoir میں شراب خانوں کا، La Bet Humaini میں ریل گاڑیوں کا تذکرہ ہے، Germinal کانوں میں مزدوروں کی زندگی پیش کرتی ہے۔ L' Argent دنیائے مالیات سے متعلق ہے، La Dabacls ۱۸۷۰ء کے دہشت خیز حادثات بیان کرتی ہے اور Lourdes میں مذہب کے توہمات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

زولا اپنے عزم کو مختصراً ان الفاظ بیان کرتا ہے:

''میں ایک خاندان کو پیشِ نظر رکھ کر اُس کے ہر فرد کا بغور مطالعہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کس طرف رجوع کرتے ہیں اور کس طرح وہ ایک دوسرے کے خلاف حرکات عمل میں لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنے کرداروں کو ایک خاص تاریخی وقت میں پیش کروں گا تاکہ مجھے ایک اچھا ماحول مل سکے ـــــــ یعنی تاریخ کی ایک ہلکی سی چاشنی۔''

زولا کا مقصد اپنے وقت کی صحیح تصویر کشی کرنا تھا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا، اس لیے کہ اس نے اپنی تصانیف میں صرف انسانی کمزوریوں اور برائیوں ہی کا تذکرہ کیا ہے۔

زولا بسیار نویس اور محنت کش تھا۔ اسے اپنی زندگی میں بہت مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ سب سے بڑی مایوسی جو اس فرانسیسی انشا پرداز کی راہ میں حائل ہوئی، یہ تھی کہ وہ اکادمی کا رکن بننے کی سعی میں ناکام رہا۔

زولا کی طرزِ نگارش بہت بلند نہیں ہے مگر اُس کے مختصر افسانوں میں ہمیں اُس کے تخیل کے نادر نمونے ملتے ہیں جنہیں ادب میں بہت ممتاز جگہ حاصل ہے۔

زولا کا ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا اور وہ پیرس میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

الفانسے دودے

دودے ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں اُسے مالی مشکلات کی بنا پر ایک اسکول میں ایک معمولی معلم کی نوکری حاصل کرنا پڑی۔ ایک سال کے بعد ہی وہ یہ ملازمت چھوڑ کر پیرس روانہ ہو گیا جہاں اُسے ایک اخبار کے عملے میں جگہ مل گئی۔ دو سال یا اس سے کچھ کم عرصے کے بعد وہ نپولین سوم کے سوتیلے بھائی کا سیکرٹری بن گیا اور اس حیثیت میں ۱۸۶۵ء تک کام کرتا رہا۔ اسی دوران میں اُس نے ادبی حلقے میں اپنی مشہور کتاب Roisen Exil سے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔

دودے کو اکثر فرانسیسی ڈکنز کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی تصنیف De Petit Chose، جس میں اس انگریزی ادیب کی پوری جھلک موجود ہے، اس امر پر شاہد ہے کہ وہ واقعی اس نام کا اہل تھا۔ اُس کی حقیقت نگاری کا راز اس حقیقت میں موجود ہے کہ اُس کی تصانیف کے اکثر کردار گردوپیش کی زندگی میں سے چُنے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر La Martelle اکادمی کے ارکان پر ایک حملہ ہے، جس کے بیشتر کردار و حادثات حقیقی زندگی سے منتخب کیے گئے ہیں۔

زولا کی طرح دادے بھی بہت محنت کش اور بسیار نویس تھا۔ وہ اکثر اوقات صبح چار بجے سے لکھنے میں مشغول ہوتا اور آٹھ بجے تک لکھتا رہتا۔ نو بجے لکھنا شروع کرتا اور بارہ بجے تک اپنے کام میں منہمک رہتا۔ دو بجے پھر قلم پکڑ کر چھ بجے تک لکھتا رہتا اور تھوڑا عرصہ آرام کرنے کے بعد وہ پھر آٹھ بجے سے لے کر نصف شب تک اپنے کام میں مشغول رہتا۔

دادے نے اپنی زندگی کے ایام بہت خوشی میں کاٹے۔ اُس کی ازدواجی زندگی پرازمسرت تھی۔ دادے پیرس میں ۱۷دسمبر ۱۸۹۷ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

الفرودی میوسط

وکٹر ہیوگو کے ادبی حلقے کا سب سے کم عمر ممبر تھا۔ شروع شروع میں نوجوان میوسط، اُس ادبی حلقے کو ایک شرابی کی نقل اتار کر محظوظ کیا کرتا تھا ـــــ اس وقت اُس کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی۔

میوسط پیرس میں ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک حد تک اچھی شہرت کا ادیب تھا۔ وکٹر ہیوگو نے شروع شروع میں نوجوان شاعر کی حوصلہ افزائی کی مگر میوسط کا رجوع بائرن کے سکول کی طرف تھا جس کا کلام اسے زبانی یاد تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی اکثر منظومات اُسی کے تتبع مین کہی ہیں۔

میوسط کی ابتدائی شاعری فکر کی گہرائیوں سے خالی ہے مگر ۱۸۳۲ء میں جب وہ جارج سیں کے ساتھ وینس میں بھاگ کر چلا گیا ـــــ اور اُس برقی زندگی کے بعد وہ دونوں ایک غم افزا حالت میں ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے، اُس کے تمام افکار بالکل بدل گئے۔ طبیعت میں سنجیدگی اور گہرائی خود بخود پیدا ہو گئی ـــــ محبت کے جذبات، غصہ اور حسد نے اس کے دل و دماغ کو تار تار کرنا شروع کر دیا۔

میسوسط نے بائرن کی طرح لوگوں کی ہمدردی کو منعطف کرانے کی خاطر اپنے مجروح دل کی قاشیں پیش کرنا شروع کیں۔ اس کے شدید ترین جذبات الفت گائے نہیں جا سکتے۔ میوسط خود کہتا ہے:

''اگر میں اِن جذبات کو گیت کی صورت میں پیش کرنے کی سعی کروں تو وہ اسے نازک پتیوں کی طرح کچل کر رکھ دیں گے۔''

میوسط کے افکار سحر انگیز، مترنم اور رومان آفریں ہیں ـــــ یہی وہ سحر خیز قدرت تھی جس نے اُسے اپنے زمانے کا بہترین شاعر بنا دیا۔ اُس کے گیت خالص حُسن کی وجہ سے فرانسیسی شاعری کے گوہر تصور کیے جاتے ہیں۔

تھیوفل گوئٹے

گوئٹے طاربز میں پیدا ہوا مگر جوان ہوتے ہی پیرس میں چلا آیا جہاں اُس نے بہت غریبی کی حالت میں زندگی بسر کرنا شروع کی۔ ان دنوں وہ اکثر اوقات دن کا بیشتر حصہ تصویر خانوں میں صرف کیا کرتا تھا۔ وہ ان تصویر خانوں کی دیواروں پر آویزاں تصاویر کو گھنٹوں بت بنا ہوا دیکھتا رہتا ـــــ غالباً وہ اپنی روح کو رنگوں اور حسنِ تشکیل کی غذا دیا کرتا تھا۔

ان تصاویر اور اصنام کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر گوئٹے نے تصویر کشی کا پیشہ اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے حسین خوابوں کی صحیح تعبیر کپڑے کے ٹکڑے پر پیش نہیں کی جا سکتی تو اُس نے برش اور رنگوں کو یک قلم موقوف کر کے لفظوں کی صنعت کی طرف توجہ دی ـــــ وہ آرٹ جس کا اُسے لاثانی ماہر ہونا تھا۔

ایک زمانے میں جب وہ صحافت نگاری سے گزر اوقات کر رہا تھا، وہ چند رومانی منظومات قلم بند کرنے میں مشغول تھا جن کا ہر ہر لفظ تصویر پر ایک مصور کے قلم کی جنبش سے کم نہیں ہے۔

گوئٹے کا آرٹ خواہ وہ نظم کی صورت میں ہو یا نثر کی صورت میں بالکل یونانی ہے۔ دراصل وہ یونانی آرٹ کا بہت دلدادہ تھا اور اس آرٹ کے متعلق اس نے اپنی چند تصانیف میں بہت کچھ لکھا بھی ہے۔

گوئٹے نے انگلستان کے مشہور جواں افکار شاعر کیٹس کی طرح ایک نظم لکھی ہے جس میں ہر ایک چیز سفید ہے (کیٹس نے اپنے سانیٹ کے لیے نیلا رنگ منتخب کیا تھا) یہ نظم ایک دوشیزہ کی تصویر ہے، سفید کپڑوں میں ملبوس، تالاب میں نہاتی ہوئی بطخوں کے پروں سے بھی زیادہ سفید! ـــــ چاندنی رات میں تیرتی ہوئی برفانی چٹان اور ـــــ موتیا کی سیمیں پنکھڑیوں سے بھی زیادہ سفید ـــــ یہ دوشیزہ اپنے پیانو کے پاس بیٹھ کر اپنے سفید ہاتھوں سے جو ہاتھی دانت کے بنے ہوئے پردوں سے بھی

زیادہ سفید ہیں، اُس ساز کو چھیڑتی ہے۔

آرٹ اور صرف آرٹ کی تخلیق گوئٹے کا منتہائے نظر تھا۔

چارلس بادلئیر

بادلئیر پیرس میں ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۷ء میں وہیں سپردخاک ہوا۔ چونکہ بادلئیر صاحبِ جائداد تھا اس لیے وہ اس قابل تھا کہ اپنی زندگی شاعری کے لیے وقف کر دے۔ مگر اس کے باوجود اُس کے تمام اشعار صرف ایک جلد پر مشتمل ہیں جو Flowers of Fall کے نام سے مشہور ہیں۔

بادلئیر نہ مصور شاعر تھا اور نہ حسین اشیا کو تلاش کرنے والا ——— وہ سیاہ چیز کو سفید پر ترجیح دیتا تھا۔ اُس کی نظروں میں ایک لڑکی جس نے آغوشِ غربت میں پرورش پائی ہو اور جس کے پھٹے ہوئے غلیظ کپڑوں میں اُس کے کمزور بدن کی ہڈیاں نظر آ رہی ہوں، کسی دوسری حریر پوش حسینہ سے زیادہ حسن و جمال کی مالک تھی۔

بادلئیر کی شاعری، دہشت اور بدصورتی اور اُن مہالک سے جورات کے وقت منڈلاتے ہیں اور بھوتوں کی تصاویر سے جو رُوح کی تاریک گہرائیوں میں داخل ہوتے ہیں، بھری پڑی ہے۔ دراصل جب بادلئیر کوئی تصور پیش کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ بالکل غیرفطری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ''پیرس میں ایک خواب'' میں ہم ایک ایسا شہر دیکھتے ہیں جو سنگِ مرمر اور دھات کا بنا ہوا ہے۔ جس کے بلند مینار اسی پُراسرار روشنی سے منور ہیں۔ آبشار، بلوریں پردوں کی طرح گرتے ہیں، نیلے پانی کے تالاب آہنی شیشوں کے مانند ہیں ——— باقی نظم بھی اسی قسم کی عجیب تشبیہوں سے بھری پڑی ہے۔

بادلئیر کی شاہراہ دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ خوشبوؤں کا شاعر تھا اور تصویروں سے اُسے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا:

> ''میری روح خوشبوؤں پر تیرتی ہے، جیسا کہ دوسرے لوگوں کی موسیقی پر۔''

اُس کے اکثر اشعار پیچیدہ ہونے کے سبب سے ناقابلِ فہم ہیں۔

پال ورلیں

ورلیں اپنی نوعیت کا پہلا شخص ہے جس نے شاعری میں نام پیدا کیا۔ وہ اس قدر بدشکل واقع ہوا تھا کہ عورتیں اُسے دیکھتے ہی دہشت کے مارے چیخ اٹھتی تھیں گویا وہ جنگلی بندر ہے۔ گو اُسے ایک دفعہ اپنے دوست پر گولی کا نشانہ کرنے کے جرم میں جیل کی ہوا کھانی پڑی اور دوسری دفعہ اپنی ماں پر حملہ آور ہونے

کی وجہ سے سپردِ زندان ہونا پڑااور اُس کی موت انتہادرجے کی سوختہ سامانی میں واقع ہوئی مگر اس کے اشعار اپنی خوبصورتی اور سادگی کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ کوئی فرشتہ انہیں اپنے ساز پر گائے۔

ورلیں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوااور تادم آخر (۱۸۹۶ء) پیرس میں سکونت پذیر رہا۔ اُسے ورثے میں کچھ روپیہ حاصل ہوا تھا جو اُس نے اپنی ننھی ننھی کتابوں کی اشاعت پر خرچ کر دیا۔ یہ کتب یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔ پہلی کتاب Saturnion Poems کے نام سے شائع ہوئی ـــــ یعنی منظومات جن کی تخلیق سرطان نامی غم افزا ستارے کی موجودگی میں ہوئی۔ ان اشعار میں غم تو ضرور ہے مگر شیریں اور سحر انگیز۔

ورلیں کے پیش نظر صرف اپنی پُراسرار رُوح کے غم اور خوشیاں بیان کرنا تھیں، لیکن وہ جس چیز کا بھی اظہار کرتا ہے خواہ محبت کے گیت ہوں یا شراب کی مدح، خواہ ہسپتال یا جیل کے افکار ہوں، یا اپنے گناہوں، خوابوں یا اپنی جہالتوں کا ذکر ـــــ یہ سب ایسے سُریلے اور شیریں اشعار میں بیان کیے گئے ہیں کہ رُوح بے اختیار وجد کرنے لگ جاتی ہے۔

حاشیہ:

ا: یہ تحریک جرمنی سے شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ فرانس تک پہنچ گئی۔ جرمنی کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں نے یونانی اور لاطینی اُصول وقواعد سے جس کی تقلید پر اہلِ فرانس مٹے ہوئے تھے، انکار کر دیا اور ادب کو اپنے دماغ کی مدد سے تیار کرنا شروع کیا۔ اس تحریک کی داستان بہت طویل ہے۔ قصہ مختصر بیلو نے جو ڈراما کے لیے یونانی اتحادِ ثلاثہ کی قید لگائی تھی اور جس پر والٹیر نے اپنا سارا زورِ قلم خرچ کیا، اس تحریک کی بدولت اُٹھ گئی اور یہ قاعدہ بھی کہ ٹریجڈی کے ہیرو اور ہیروئن بادشاہ، ملکہ اور شہزادیاں ہونی چاہئیں حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا اور اس امر پر زور ڈالا کہ پوشاکیں اس زمانے کے مطابق ہونی چاہئیں جس سے کردار تعلق رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

والٹئیر

فرانسس ماری اروئے جو ادبی میں دنیا صرف والٹئیر کے مختصر نام سے متعارف ہے، پیرس میں ۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء کو پیدا ہوا۔ اُس کا باپ متمول آدمی تھا۔ والٹئیر نے ابتدائی تعلیم Jesuit College ایسی نامی درسگاہ سے حاصل کی۔ گو یہ تعلیم پادریوں کے زیر اثر تھی مگر جیسا کہ اناطول فرانس اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے کہ کلیسا کے بدترین دشمن وہ ہوتے ہیں جو اُس کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ ہم اس کی زندگی کا بیشتر حصہ پادریوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں صرف ہوتا دیکھتے ہیں۔

شاعر، مورخ اور فلسفی کی حیثیت میں تو والٹئیر کے مقابلے میں چند اشخاص پیش کیے جا سکتے ہیں مگر طنز یہ نگاری اور ہجو گوئی میں اُس کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ اس کے مشرقی رومان یا کہانیاں الف لیلہ کی طرز میں لکھی گئی ہیں۔

والٹئیر کی حاضر جوابی اور طنز گوئی کے متعلق بہت روایتیں مشہور ہیں۔ لوئی چہاردہم کے مرنے کے بعد جدید ناظم نے کفایت کی غرض سے شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے فروخت کر دیے۔

والٹئیر نے وہ واقعہ سن کر کہا ''اس سے کہیں بہتر تھا کہ شاہی دربار سے نصف گدھوں کو نکال دیا جاتا۔''

۱۷۷۰ء میں اُس کا مجسمہ قائم کرنے کے لیے چندے کی فہرست کھولی گئی۔ اس وقت والٹئیر کے چہرے کی رونق بڑھاپے کی نذر ہو گئی تھی۔ رخسار پچک گئے تھے۔ بدن کی یہ حالت تھی گویا پُرانا چمڑا بوسیدہ ہڈیوں پر منڈھا ہے۔ آخر جب مجسمہ تیار ہو گیا تو والٹئیر نے شاہ فریڈرک کو لکھا ''مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ دیگر علوم و فنون کے علاوہ آپ علمِ ابدان کے سرپرست بھی ہیں جبھی تو میرا مجسمہ تیار کرا کے جسم کا

ڈھانچ مطالعہ کے لیے پیش کر دیا ہے۔"

والٹئیر اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر، مفکر، تمثیل نگار اور ادیب تھا۔ فرانس کے عہدِ حاضر کے مشہور نوبل پرائز یافتہ انشاپرداز اناطول فرانس کے خیال میں جنسِ لطیف کی آئینہ برداری میں شیکسپئیر بھی والٹئیر سے لگا نہیں کھا سکتا۔ والٹئیر المیہ تمثیل نگاری کا بادشاہ ہے۔

انگلستان کا شہرہ آفاق شاعر ٹامس گرے گو دہریہ خیال والوں سے متنفر تھا مگر پھر بھی وہ والٹئیر کی ٹریجڈی کو شیکسپئیر کی تمثیلوں کا ہم پلہ قرار دیتا ہے۔

"والٹئیر مشہور صحافی بھی تھا۔ وہ بہت کثرت سے خطوط لکھتا۔ اُس نے ایک سو کے قریب کتابیں لکھیں۔ اس کی تصانیف میں ایک لفظ بھی مہمل یا بیہودہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت تک اس کے دس ہزار مکتوب شائع ہو چکے ہیں۔"

"گر والٹئیر کی تمام کتابیں سوائے "کینن وُڈ" کے تلف کر دی جائیں تو بھی وہ فرانس کے ادیبوں کی صفِ اول میں جگہ پاتا ہے۔ یہ کتاب دراصل روسو کے ایک مکتوب کا جواب ہے جس میں روسو نے اسے بے دین اور ملحد قرار دیا تھا۔ اس تصنیف میں وہ تمام جسمانی گناہوں کا نقشہ اور انسانی تباہی و بربادی کی تصویر کھینچ کر اس بُری طرح مضحکہ اُڑاتا ہے کہ پڑھنے والا خود بخود مصنف کا شریک تبسم ہو جاتا ہے"۔

والٹئیر کے آہنی قلم نے آسمانی صحیفوں پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ اس کے ذہن نے مذہب، فلسفے اور تاریخ کے میدانوں کو اپنی جولانگاہ بنایا۔ نثر، نظم، تاریخ، افسانہ، رومان اور تمثیل میں ہر جگہ والٹئیر مذہب کی مخالفت کرتا ہے——— کلیسا، حکومت کی گاڑی کا سب سے مضبوط گھوڑا تھا۔ والٹئیر کی بیدزنی سے وہ ادھ موا ہو گیا۔ حکومت کی گاڑی رُک گئی مگر والٹئیر اُسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکا۔

اُس کے نزدیک شخصی یا جمہوری حکومت میں کوئی فرق نہیں۔ غربا کے لئے دونوں باتیں یکساں ہیں۔ خواہ انہیں ایک شیرِ شکار کرے یا ایک ہزار چوہے ان کی متاعِ زیست پر ڈاکا ڈالیں[۱]۔

والٹئیر کی زندگی کے حالات پر جس کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں، اُس کی مثال نپولین کے سوا شاید ہی کوئی ہو۔ آخری عمر میں والٹئیر نے اپنی پژمردہ قوت کو ابھارنے کے لئے شراب کا کثرت سے استعمال شروع کر دیا۔ اس کے اثر کو زائل کرنے کی خاطر اس نے بعدازاں افیون کھانا بھی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی رہی سہی صحت بھی برباد ہو گئی۔ آخر ۳۰ مئی ۱۷۷۸ء کو یہ باکمال شخص وفات پا گیا۔ اس کے مرتے ہی یہ احکام جاری ہو گئے کہ اسے گرجا میں دفن نہ کیا جائے۔ مگر والٹئیر کے احباب

نے اُس کی لاش کو رسوم کے بغیر مضافات کے ایک گرجا میں خفیہ طور پر دفن کر دیا۔ اُس کی لوح مزار پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

''یہاں والٹئیر آرام فرما ہے۔''

بعد میں فریڈرک اور دیگر مشاہیر یورپ نے پادریوں کو بہت لعن طعن کی اور اکادمی نے نفرت کا ووٹ پاس کیا ـــــــ مورخ اس واقعہ کو انقلابِ فرانس کا محرک و ممد خیال کرتے ہیں۔

حاشیہ:

۱: انقلابِ فرانس مصنفہ باری (علیگ)

موپساں اور ٹالسٹائی کا نظریہءفنونِ لطیفہ

گائی دا موپساں، فرانسیسی شاعر و افسانہ نگار ۵۔اگست ۱۸۵۰ء کو پیدا ہوا۔اُس کا دادا ایک متمول زمیندار تھا جس نے اپنی موت پر اپنے لڑکے یعنی موپساں کے باپ کے لیے کافی جائداد چھوڑی۔
موپساں نے روئن لیس کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی۔وہ ابھی فلسفے کی ہی تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ اس نے اپنی پہلی کتاب اشعار کے ایک مجموعے کی صورت میں شائع کی۔
ایامِ جوانی میں موپساں ادبی گفتگوؤں میں بہت کم حصہ لیا کرتا تھا۔اگرچہ اس کے ملنے والے طرگنیف، الفونسو دادے اور زولا ایسے بلند پایہ ادیب و انشا پرداز تھے مگر یہ ملاقاتیں غالباً ادبی مشاغل کے سلسلے میں تھیں اس لیے کہ ان ادباء کی نظر میں موپساں اس وقت صرف ایک کھلاڑی کی حیثیت رکھتا تھا۔

ایک دوسرے مجموعہء اشعار کی اشاعت کے کچھ سال بعد اُس نے ایک اخبار میں اپنے افسانے چھپوانے شروع کیے۔اُس کے پہلے افسانے Boule de Suif نے ادبی دُنیا پر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ واقعی ایک کامیاب افسانہ نگار ہے اور اُس میں اِس صنف سے متعلق تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔
اس افسانے کے طبع ہونے پر عوام کے علاوہ اُس کے ہم عصر انشا پردازوں کے تعجب کی بھی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنہوں نے اُن کاغذوں کے چند پرزوں پر کسی پختہ افسانہ نگار کے معجز نما افکار جلوہ گر پائے ـــــــ چند اور افسانوں کی اشاعت نے فرانس کے ہر اس ادبی حلقے کو جو مصنف کے انتخابِ مضمون سے متنفر تھا یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ موپساں واقعی اپنے فن کا بہترین ماہر ہے۔
موپساں، شاید اپنے وقت کا بہترین مختصر افسانہ نویس ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اُس کا پہلا افسانہ La

boule de Suif فن کے لحاظ سے لاثانی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پیشِ نظر ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی مصنف نے اپنی ادبی سرگرمیوں کی ابتدا ایک فقید المثال شاہکار سے کی ہو ـــــ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ خود موپساں کی تصانیف میں ایسا کوئی افسانہ موجود نہیں ہے جو اس پہلی کاوش کا مدِ مقابل ٹھہرایا جا سکے۔

موپساں کی ادبی زندگی صرف دس سال کے قلیل عرصے تک جاری رہی۔ اس عرصے میں اس نے بے شمار افسانے اور نصف درجن ناول سپردِ قلم کیے جو ادبی دُنیا میں کافی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔

موپساں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی تصانیف میں Naturalism کو تباہ کر دیا ہے اس لیے کہ وہ اسے حقیقت نگاری کی آخری حد تک لے جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موپساں نے کبھی موجد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ صرف انسان کی زندگی کو بعینہٖ اسی طرح بیان کرتا تھا جیسی اُس کی آنکھیں دیکھا کرتی تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ دنیا کے لوگوں کے نزدیک اس کے مشاہدے کے نتائج بعض اوقات ناگوار ہوتے ہیں۔

بعض حضرات موپساں کو اس فن کے لحاظ سے روسی افسانہ نگار اُنطون چیخوف کا ثانی قرار دیتے ہیں ـــــ یہ ایک عظیم غلطی ہے۔ ان دونوں افسانہ نویسوں کے عمیق مطالعے کے بعد یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ اُن کی نفسیات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

موپساں کی نظر انسان میں حیوانی جذبات دیکھتی ہے اور چیخوف انسانیت کے عمیق ترین گڑھوں میں محبت اور امید کی تلاش کرتا ہے۔

بیشک چیخوف بھی موپساں کی طرح ایک مصور تھا اور اُس نے ہمارے سامنے وہی پیش کیا جس کا اس نے اپنے گرد و پیش مطالعہ کیا مگر ایسا کرتے وقت وہ ہمیشہ اُس زندہ چنگاری کی جستجو کیا کرتا تھا جو سرشتِ انسانی میں نہاں ہے ـــــ یہی وہ فرق ہے جو ان افسانہ نگاروں کے بظاہر یکساں فن میں پوشیدہ ہے۔

موپساں بھی اپنے استاد[1] ہی کی طرح ایک بڑا اہل طرز (Stylist) ہے۔ اس کی تصانیف کے مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت موزوں لفظ کی جستجو میں رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے ہر مقام پر غیر ضروری الفاظ سے اجتناب کیا ہے۔

موپساں کے آرٹ کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ نیکی کو بدی پر ترجیح نہیں دیتا، نہ وہ ایک

کردار کو دوسرے کردار پر برتری بخشتا ہے، اور نہ وہ اپنی حکایت بیان کرتے وقت درمیان میں ٹھہر کر زندگی کے معانی پر بحث کرنا شروع کرتا ہے ـــــــ دراصل اُس کا مقصدِ وحید اپنے مشاہدات بیان کرنا ہے۔ اُس کی طرزِ نگارش بہت سادہ مگر پُر معنی ہے۔ وہ پھیکے سے پھیکا لفظ بھی استعمال میں لے آئے گا اگر وہ اُس کی تصویر میں صحیح نقش کا کام دے سکتا ہے۔

موپساں کی آخری تصانیف میں یک لخت ایک غیر معمولی تغیر رونما ہوا۔ یعنی اس کے افکار میں پُر از الم زندگی سے جذبہ ہمدردی کا اظہار جھلک دکھانے لگا۔ یہ ہمدردی ہمیں اس کے اکثر افسانوں میں بھی نظر آتی ہے جو اُس نے ۱۸۹۰ء میں قلم بند کیے۔

La vie Errante کی اشاعت کے بعد جو سیاحت سے متعلقہ تحریروں پر مشتمل ہے موپساں کی ادبی سرگرمیوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ادب سے کنارہ کش ہو کر وہ مذہب میں دلچسپی لینے لگا۔ مگر اس عرصے تک اس کے اعصاب، شراب کی کثرتِ استعمال اور جسمانی بے اعتدالیوں کی وجہ سے بالکل خراب ہو چکے تھے۔ چنانچہ تھوڑے عرصے کے بعد ہی وہ فالج ایسے مہلک مرض کا شکار ہوا۔ اس مرض کی غیر معمولی تکلیف سے تنگ آ کر اس نے جنوری ۱۸۹۲ء میں خودکشی کا اقدام کیا مگر وہ بچ گیا۔ آخر وہ ۶ جولائی ۱۸۹۳ء کو پیرس میں اس جہاں سے رخصت ہوگیا ـــــــ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آخری ایّام بہت تکلیف میں گزارے۔

موپساں، انگریزی افسانہ نگاروں ایڈگر ایلن پو اور او ہنری کی طرح مختصر نویسی کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ موپساں کا درجہ ان باکمال افسانہ نگاروں سے بھی بلند ہے۔ یہ فوقیت اُسے اپنے انتخاب مضامین کے وسیع تنوع کی وجہ سے حاصل ہے ـــــــ موپساں نے ''مافوق الفطرت افسانہ نگاری'' کی مشکل صنف میں بھی ایلن پو کی طرح نہایت کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے۔

اگر موپساں کچھ دیر اور زندہ رہتا تو یقین تھا کہ وہ اپنی موجودہ تصانیف سے کہیں زیادہ اہم تحریریں چھوڑتا کیوں کہ آخری ایّام میں وہ اپنے نظریے کو بالکل بدل چکا تھا! بہر حال ادب سے دلچسپی لینے والے حضرات اب بھی اس جواں افکار افسانہ نویس کی ادبی خدمات کے معترف ہیں۔

روس کے شہرہ آفاق انشا پرداز و تمثیل نگار کاؤنٹ لیو طالسطائی نے موپساں کے افسانوں کے روسی تراجم کا تعارف لکھا جس میں اس روسی مفکر نے موپساں کی تحریروں پر ایک عالمانہ تنقید کی ہے۔ اس تعارف کے چند اقتباسات نقل کرنے سے پیشتر ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ طالسطائی کے مشہور نظریہ

صنعت کے متعلق کچھ بیان کیا جائے۔

طالسطائی کی نظر میں صرف وہی دماغی تخلیق آرٹ ہو سکتی ہے جو متعدی (Infectious) ہو، یعنی وہ اپنے خالق کے احساسات دوسرے دماغ پر منتقل کر سکے۔ اس طرح وہ ہر اس پارۂ صنعت کو آرٹ تسلیم کرنے سے یکسر منکر ہے جو نا قابلِ فہم ہو۔ ہم یہاں خود طالسطائی کے الفاظ درج کرتے ہیں:

''اپنے احساسات کو کسی دوسرے شخص کے دل و دماغ میں، حرکات، نقوش، آواز کے زیروبم، الفاظ یا رنگوں کے ذریعے سے اس طرح پیدا کرنا کہ اس پر وہی حالت طاری ہو ــــــ یہ ہے آرٹ کی خاصیت۔''

''آرٹ یہ ہے کہ کوئی شخص ارادتاً بیرونی اشارات کے ذریعے سے اپنے احساسات دوسرے دماغ پر نہایت کامیابی سے منتقل کرے اور معمول عامل کے ان احساسات سے پوری طرح متاثر ہو۔''

طالسطائی آرٹ کو حُسن کاری، خوبصورت اشیا کا پیدا کرنا، ایک کھیل یا ذریعۂ مسرت نہیں مانتا۔ وہ آرٹ کو ایک ذریعۂ اتحاد کہتا ہے جو انسان کو انسان کے ساتھ احساسات کی ایک ہی لڑی میں منسلک کر دے ــــــ ارسطو، افلاطون، سقراط اور دیگر حکمائے یونان کا بھی کسی حد تک آرٹ کے متعلق یہی نظریہ رہا ہے۔ مگر وہ اسے صرف مذہبی تعلیم کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

طرگنیف[۲] طالسطائی کو موپساں کے افسانوں کا ایک مجموعہ دے کر اس سے سفارش کرتا ہے کہ وہ اس نوجوان فرانسیسی افسانہ نگار کے افکار کا ضرور مطالعہ کرے۔ اس کے علاوہ طرگنیف، طالسطائی کو موپساں کے متعلق چند ایسی باتیں بھی کہتا ہے جو اُس کے لیے بہت تعجب خیز ہوتی ہیں۔

طالسطائی تعارف میں لکھتا ہے:

''چونکہ میں اس زمانے میں جب طرگنیف نے مجھ سے موپساں کی ایک تصنیف کا مطالعہ کرنے کے لیے کہا اپنا نظریہ[۳] حیات بالکل تبدیل کر رہا تھا۔ اس لئے میرے لیے ایسی کتابوں کا مطالعہ کرنا جن کے متعلق خود طرگنیف کے الفاظ بہت عجیب سے تھے، بہت مشکل تھا مگر چونکہ مجھے طرگنیف کو ناراض کرنا مقصود نہ تھا اس لیے میں نے اُس کتاب کا بغور مطالعہ کیا۔

اس مجموعے کہ پہلی کہانی La Maison Tellier کا نفسِ مضمون فی الواقع بہت

عامیانہ اور بازاری تھا مگر اس کے باوجود میں مصنف کی قابلیت کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ واقعی ایک قدرتی عطیے کا، جسے ہم قابلیت کے نام سے پکارتے ہیں، مالک تھا۔ مگر بدقسمتی سے میں اس قابلیت میں، وہ امر، جو ان تین اُصولوں میں (جو آرٹ کے لیے لازم وملزوم ہیں) سب سے زیادہ اہم ہے، نہ پا سکا۔

(۱) ایک صحیح یعنی اخلاقی رشتہ مصنف کا اپنے مضمون کے ساتھ

(۲) اظہار کی وضاحت یا حسنِ تشکیل

(۳) خلوص، یعنی اپنے مضمون سے صناع کا پُورا اخلاص

ان تین چیزوں میں سے موپساں صرف آخری دو کا بڑی حد تک مالک ہے مگر اس کے افکار میں سب سے ضروری امر کا فقدان ہے یعنی اس کا رشتہ اپنے انتخاب کردہ مضامین کے ساتھ اخلاقی طور پر بالکل غیر درست ہے''۔

''میں اُس کی کتاب کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ اپنے مشاہدات کو، جو دوسرے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں، بیان کرنے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ وہ ایک خوبصورت طرزِ نگارش کا مالک ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا بہت وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ اس کے افکار میں وہ تعدیہ (Infection) بدرجہ اتم موجود ہے جس کے بغیر آرٹ آرٹ نہیں ہو سکتا۔ مگر ان امور کے باوجود بدقسمتی سے وہ اُس ضروری عنصر سے بالکل محروم ہے جس کے بغیر آرٹ ہرگز بلند مرتبہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی اس کی تحریروں میں اخلاقی رشتہ بالکل مفقود تھا ——— دیگر الفاظ میں وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے سے قاصر ہے۔ وہ اُن باتوں کو بیان کرنا پسند کرتا ہے جو اسے پسند نہ کرنی چاہئے تھیں اور نہ ان کے بیان کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔

چنانچہ بدقسمتی سے مصنف نے اس زیرِ نظر کتاب میں بڑے شوق ومحبت سے بیان کیا ہے کہ کس طرح عورتیں مردوں کو دامِ گناہ میں گرفتار کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور کس طرح مرد عورتوں کو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے رغبت دلاتے ہیں اور وہ ملک کے مزدور پیشہ لوگوں کو نہ صرف حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ اُن کو حیوانوں سے بدتر پیش کرتا ہے۔

زندگی کے صحیح نظریے کا فقدان، مزدور پیشہ لوگوں کی دلچسپیوں سے تغافل اور ان کی بھدی تصورکشی، وہ بڑا بھاری نقص ہے جو فرانس کے اکثر انشا پردازوں کے افکار میں موجود ہے۔ اُن میں موپساں بھی شامل ہے جو نہ صرف پیشِ نظر افسانوں میں بلکہ ہر اس مقام پر جہاں وہ عوام کے متعلق کچھ تحریر کرتا ہے، اِن لوگوں کو ہمیشہ وحشی اور بھدے حیوان دکھاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرانسیسی مصنف اپنی قوم کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں مگر اس حقیقت کے باوجود کہ فرانسیسی کاشتکاروں کے درمیان بود و باش کا موقع نہیں ملا میں یہ ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ لوگ واقعی ایسے کردار کے مالک ہیں جیسا کہ یہ مصنف ہمیں بتاتے ہیں۔

اگر فرانس، جس نے اتنی نادر شخصیتیں پیدا کی ہیں جس نے آرٹ، ادب، سائنس اور انسان کی اخلاقی ترقی کے لیے اتنی خدمات انجام دی ہیں، اب بھی وہی فرانس ہے تو وہ مزدوری پیشہ جماعت جس کے کاندھوں پر فرانس قائم رہا ہے کبھی وحشی اور حیوان اور روحانیت سے عاری نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ میں موپساں اور اسی قسم کے دیگر مصنفوں کی بیان کردہ کہانیوں کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھ سکتا۔ میری نظر میں انشا پرداز، موپساں کی طرح صرف عورتوں کی گردنوں اور کولھوں کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور جو مزدوری پیشہ لوگوں کی زندگی کو تمسخر آمیز لہجے میں بیان کرتے ہیں ایک عظیم صناعانہ Artistic غلطی کے مرتکب ہیں اس لیے کہ وہ صرف جسمانی امور کو لے کر باقی تمام ضروری چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ موپساں کا خیال ہے کہ اخلاق و بداخلاقی اور نیکی و بدی میں تمیز کرنا کسی آرٹسٹ کا کام نہیں''۔

''مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک کامیاب مصور نے مجھے اپنی تیار کردہ تصویر دکھائی جس میں ایک مذہبی جلوس دکھایا گیا تھا۔ یہ تصویر فن کے لحاظ سے بہت خوبصورت تھی مگر اس میں بھی صناع کا مضمون سے رشتہ مفقود تھا۔ میں نے اُس سے دریافت کیا کہ ''تم مذہبی رسوم کو اچھا سمجھتے ہو، کیا ایسے جلوس نکلنے چاہئیں؟''

''میرے اس متحیر کن جواب پر وہ صرف اس قدر کہہ سکا کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور نہ میں جاننا چاہتا ہوں۔ میرا کام مشاہدے کی تصویر کشی ہے''۔

میں نے اُس سے پھر سوال کیا ''مگر کم از کم تمہیں یہ جلوس پسند تو ہوں گے؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''تو پھر تمہیں یہ رسوم ناپسند ہوں گی۔''

''یہ بھی مجھے معلوم نہیں'' یہ تھا وہ جواب جو اُس کامیاب و بہترین فن کار مصور نے مجھے دیا ـــــ مصور جو زندگی کی تصویر کشی تو کرتا ہے مگر اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ، مضمون سے جس پر طبع آزمائی کر رہا ہے، نفرت کرتا ہے یا محبت۔

بد قسمتی سے موپساں بھی اِسی تاریکی میں تھا اور بد قسمتی سے اُس کے گرد و پیش کا ماحول ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ آرٹ کی خدمت صرف حُسن کاری تصور کی جاتی تھی ـــــ عورت کا حسن، جو نوجوان اور شکیل ہو، خاص کر برہنہ ہو اور پھر اُس کے ساتھ مرد کا شہوانی تعلق''۔

''یہ غلط نظریہ نہ صرف موپساں اور اُس کے ہم عصر انشا پردازوں کے پیش نظر تھا بلکہ اُس وقت کے فلسفہ دان حضرات یعنی ملک کی نوجوان نسل کے اُستاد بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔''

''مگر موپساں فنی مہارت کا مالک تھا یا وہ اپنے مشاہدات بیان کرتے وقت بلا ارادہ حق کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ دراصل وہ بلا ارادہ ہر اُس چیز میں، جس میں وہ نیکی کی جستجو کرتا، بدی دیکھ کر بیان کر دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے اُس کی تمام تصانیف میں بجز ایک ناول کے صحیح راستے سے بھٹکا ہوا دیکھتے ہیں ـــــ اگر کسی جگہ وہ برائی کو برائی اور نیکی کو نیکی تسلیم کرتا ہے تو دوسرے مقام پر وہ بدی کو نیکی قرار دیتا ہے ـــــ یہی وہ چیز ہے جو کسی فنی تخلیق کی صحیح بنیادیں تباہ کر دیتی ہے، وہ بنیادیں جن پر آرٹ کی استواری کا انحصار ہے''۔

''موپساں نے اپنے دو ناولوں میں رشتۂ حیات کو صحیح طور پر بیان کرنے کی کامیاب سعی کی ہے مگر جونہی وہ مندرجہ بالا فیشن ایبل نظریہ کی طرف پلٹا تو یہ خیال کرتے ہی کہ صناع کا کام صرف حسین اشیا کی تخلیق یعنی حُسن کاری ہی ہے، اُس کے افسانے آرٹ کے دائرے سے باہر ہو گئے۔''

''خوش قسمتی سے موپساں نے چند ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں وہ اِس غلط نظریے پر کار بند نہیں رہا۔ انہی چند افسانوں میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ احساسِ اخلاق کی چنگاری اس مصنف کے دل میں پیدا ہو چکی تھی''۔

''اگر موپساں کی عمر نے وفا کی ہوتی تو یقیناً ہمیں اُس سے آرٹ کی صحیح خدمت کی توقع تھی۔''

حواشی

۱: فلابرٹ Flaubert

۲: طالسطائی کا ہم عصر افسانہ نگار۔

۳: طالسطائی نے اس وقت آرٹ کی سرگرمیوں سے بالکل علیحدہ ہو جانے کا اعلان کر دیا تھا——
دیکھو Contemporary Russion Literature از پرنس ڈی ایس مرسکی۔

۴: یہ اشارہ فرانس کے مشہور فلسفی (Renan) کی طرف ہے۔

وِکٹر ہیوگواور مسئلہ ءسزائے موت

ہم اس مضمون میں وِکٹر ہیوگو کی ایک تصنیف Condemned The Last Days of The کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو اس نے اپنی جلا وطنی سے پہلے پیرس میں قلم بند کی تھی۔ اس کتاب کا نفسِ مضمون معاشرتی نقطہءنظر سے بہت اہم ہے۔

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ یہ فرانسیسی انشا پرداز انیسویں صدی میں فطرتِ انسانی کا بہترین ماہر تھا۔ معاشرے کے پیدا کردہ عیوب اور اخلاقی تباہیوں سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اُس کی ہر تصنیف میں ان کے خلاف احتجاج موجود ہے۔ وہ اُمراء کی تعیش پسندی کو نفرت وحقارت کی نظروں سے دیکھتا اور گرسنہ شکم و برہنہ جسم غربا کی حالت سے متاثر ہوتا۔ اُس کے نزدیک تمام عیوب معاشرے کے پیدا کردہ ہیں اور انسان جب معاشرے کی قیود سے آزاد ہونا چاہتا ہے تو وہ اپنے یک طرفہ، غیر آئینی اور نا قابلِ قبول قوانین سے اُس کو مصائب ونوائب کے بھیانک گڑھے میں صرف اس خیال سے دھکیل دیتی ہے کہ اس کی اصلاح ہو جائے، حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

جس بات نے ہیوگو کے دماغ کو حد سے زیادہ پریشان کیا، جس مسئلے نے ہیوگو پر راتوں کی نیند حرام کر دی، جس قانون نے اُس کے قلم کو اعجاز بخشا، وہ سزائے موت کا خونی فتوی تھا۔ چنانچہ اُس نے سزائے موت کے مجرم کے اندرونی احساسات وقلبی کیفیات سے اثر پذیر ہو کر ایک کتاب ”The Last Days Of The Condemned“ لکھی، جس کا ترجمہ ”سرگزشت اسیر“ کے نام سے ہو چکا ہے۔

اس کتاب کا اندازِ تحریر پڑھنے والوں کے دماغ سے گزر کر اُن کے دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب فی الحقیقت ایک بین الملکی مسئلہ کی المناک داستان ہے۔ لرزہ خیز حالات اور دردناک مناظر

اتنے موثر الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں کہ قاری کی رگ رگ میں جذباتِ رنج والم جاگ اُٹھتے ہیں اور سزائے موت کی وحشت و بربریت کا صحیح نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ یہ کتاب درحقیقت ایک مجرم کا روزنامچہ ہے، جس نے آغازِ قید سے پھانسی کے دن تک کے تمام واقعات اور حالات نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جیل کی کوٹھری کے اندر قیدی کیسی زندگی بسر کرتے ہیں اور اُن کے ساتھ کیا ظالمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ آخر میں اس باکمال مصنف نے سزائے موت کے سیاسی و معاشرتی پہلو پر بحث کرتے ہوئے اپنے خیالات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر حساس قلب اُس پر خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

''سرگزشتِ اسیر'' میں وہ منظر سخت رِقت خیز ہے جب مجرم اپنی اکلوتی لڑکی سے جیل کی کوٹھری میں ملتا ہے:

''نازک کلی، معصومیت کی تصویر، میری لختِ جگر، میری بھولی بچی میری، اپنی اماں کے ساتھ میرے کمرے میں آئی۔ تتلی! خوبصورت لباس میں کیسی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ میں نے اُسے گود میں اُٹھا کر اُس کے بالوں کو چُومنا شروع کر دیا۔ کبھی اُسے چھاتی سے لگاتا اور نازک رخساروں کا بوسہ لیتا، کبھی بھینچ لیتا۔ میری ان حرکات پر حیران ہو کر اپنی اماں کی طرف دیکھ رہی تھی جو کونے میں اس منظر سے متاثر کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔''

''میری! میری پیاری میری!'' یہ کہہ کر میں نے اسے اپنی رنج والم سے پُر چھاتی کے ساتھ زور سے بھینچ لیا۔

''ہائے جناب! آپ مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔'' میری نے یہ الفاظ ہلکی سی چیخ مارتے ہوئے کہے۔

''جناب، ——— آہ میرے اللہ!! اُسے مجھ سے جدا ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا ہے۔ وہ مجھے بھول گئی ہے ——— اس کے ذہن سے باپ کی شکل و شباہت اور آواز محو ہو چکی ہے، اس کے علاوہ مجھے اس ہیئت میں پہچاننا بھی تو بہت دشوار تھا۔ لمبی سی ڈاڑھی۔ یہ ذلیل لباس۔ اُف!! کیا میری تصویر اُس کے ذہن سے اتر گئی ہے؟؟

کیا میں اپنی بیٹی کو اسی پیارے اور شیریں لہجے میں ابا کہتے نہ سنوں گا۔ اُف! دماغ پھٹا جاتا ہے۔ دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے ——— ''جناب''؟ اُف! یا میرے اللہ!!!

آہ، میں اپنی چالیس سالہ زندگی کے بدلے صرف ایک چیز کا خواہش مند ہوں ــــــ اپنی موت کے عوض صرف ایک کلمہ سننا چاہتا ہوں ــــــ اپنی پیاری بیٹی کے منہ سے صرف ابّا کا لفظ!

میں نے اُس کے ننھے اور سپید ہاتھ آپس میں جوڑتے ہوئے کہا ''دیکھو میرؔی! کیا تم مجھے جانتی ہو؟''

وہ میری طرف چمکتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ ''جی نہیں''

''میرؔی! غور سے دیکھو میں کون ہوں۔''

اُس نے بھولے پن سے جواب دیا ''ایک صاحب''

آہ! جس ذات سے میری تمام خواہشیں اور مسرتیں وابستہ ہیں، جو میری محبت کا مرکز ہے، میرے سامنے بیٹھی باتیں کر رہی ہے مگر مجھے پہچانتی نہیں، اپنے تیرہ بخت باپ کی صورت سے ناآشنا ہے۔

میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ ''میرؔی! میں تمہارا باپ ہوں۔''

میری نے حیرت سے کہا ''ہیں؟''

''کیا میں تمہیں پسند ہوں؟''

''نہیں جناب، میرے ابا تو بہت خوبصورت ہیں۔''

میں نے اُس کے چہرے کو اپنے آنسوؤں اور لگاتار بوسوں سے تر کر دیا۔ وہ گھبرائی اور چیختے ہوئے کہنے لگی۔

''آپ تو میرے گال اپنی ڈاڑھی سے چھیل رہے ہیں۔''

میں نے اُسے اپنے گھٹنوں پر بیٹھا لیا اور کہا ''میرؔی! کیا تم پڑھ سکتی ہو؟''

''میں پڑھ سکتی ہوں، امی مجھے روز پڑھایا کرتی ہیں۔''

''اچھا تو یہ پڑھو''۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ایک چھپا ہوا کاغذ لیتے ہوئے کہا جس سے وہ غالباً کھیل رہی تھی۔

اُس نے کاغذ کو کھولا اور ننھی سی اُنگلی رکھتے ہوئے لفظوں کے ہجے کرنے لگی۔ ف، ت، فت، و، ی، ویٰ، ف، م، و، مو، ت، موت، فتویٰ موت۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔ وہ

میری سزائے موت کا فتوی پڑھ رہی تھی جو بازار میں ایک پیسے کو بک رہا تھا ـــــــ اُس نے یہ غالباً اپنی ماں سے لیا ہوگا۔

اس وقت میرے دل کی جو حالت ہوئی وہ احاطہ تحریر سے باہر ہے۔

میری چلا کر بولی ''مجھے میرا کاغذ دے دو''۔

''خدا کے لیے لے جاؤ اِسے، یہ کہہ کر میں کرسی پر گر پڑا۔ اب مجھے کسی کا خوف نہیں جبکہ میرے بربطِ دل کا آخری تار بھی ٹوٹ گیا ہے۔ میں موت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔''

باقی تمام کتاب اسی طرح کے درد انگیز و موثر مناظر سے بھری پڑی ہے۔

یہ کتاب لکھتے وقت اُس کے پیشِ نظر کتابِ قانون کا سیاہ ترین ورق تھا، جس میں متفقہ طور پر موت کی سزا کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ ہیوگو ''سزائے موت'' کو عدل وانصاف کی رو سے غداری سمجھتا ہے اور تنسیخ سزائے موت کے جواز میں بہت سے قاطع دلائل و براہین پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تنسیخ سزائے موت کے معاشری و مجلسی اسباب پر بحث کرتے ہوئے ثابت کرتا ہے کہ معاشرے کو، کسی شخص کو اس چیز سے محروم کر دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے جو وہ عطا نہیں کر سکتا۔

جب یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی تو اُس کے سر ورق پر مصنف کے نام کی جگہ ذیل کی چند سطور درج تھیں:

''اس کتاب کی تکمیل دو اسباب کی مرہون منت ہو سکتی ہے۔ اولاً تباہ شدہ انسان کے احساسات، مشاہدات و مدرکات، بوسیدہ کاغذات کی صورت میں دستیاب ہوئے ہوں، جو لفظ بہ لفظ نقل کر دیے گئے ہوں۔ ثانیاً کسی حساس، مفکر، شاعر یا فلسفی کے خیالات کا مجموعہ جن کے عمیق سمندر میں برسوں غوطہ زن رہا ہو اور اس وقت تک چین نہ لیا ہو جب تک اُس کے افکار نے کتابی صورت اختیار نہ کر لی۔ ان دو اسباب میں سے کسی ایک سے مصنف کے ذہنی رشتے کی استواری کا انحصار قارئین پر ہے''۔

کتاب کی پہلی اشاعت میں وکٹر ہیوگو نے جوئے فکر کو آزادانہ بہنے سے عملاً باز رکھا شاید اس لیے کہ وہ تفہم نظریہ کا منتظر تھا۔ اس اشاعت میں اس نے اس امر کا اعلان کیا کہ ''سرگزشت اسیر'' کا مقصدِ وحید سزائے موت کی تنسیخ ہے۔ مصنف کے پیش نظر کسی خاص فرد کا تحفظ نہیں اور وہ تمام مجرموں کی طرف سے

وکالت کرتا ہے خواہ وہ عہدِ حاضر کے ہوں یا ازمنہء مستقبل کے۔

ہیوگو انسانی حقوق کا یہ مقدمہ سب سے بڑی عدالت یعنی سوسائٹی میں پیش کرتا ہے۔ اس لیئے اُس کے خیال میں سزائے موت کے المناک تاثرات عدالت کی فصاحت میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ ''زندگی اور موت کے سوال'' کو جو ایک واضح اور عیاں مسئلہ ہے، اس کے حقیقی قیام گاہ پر روزِ روشن میں دکھانا چاہتا ہے۔

انہیں تاثرات کی تخلیق کے لیے اُس نے یہ کتاب لکھی تا کہ اُس کے تاثرات سے متاثر ہو کر سوسائٹی مصنف کے نظریے کو شرفِ قبولیت بخشے۔ اس خیال کے پیش نظر کہ اس کی کتاب زمان و مکان، امصار و افراد کی تخصیص سے آزاد ہو۔ مصنف نے ''سرگزشتِ اسیر'' میں کسی خاص فرد، خاص مقام، خاص جُرم، خاص عدالت اور خاص جلاد کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے جانفشانی کے ساتھ اپنے خیالات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر حساس قلب اُس پر خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔

اس کے پیش نظر اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ سزائے موت کا وجود دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے اور اُس کی خواہش ہے کہ اقوامِ عالم کے روشن دماغ معلم اُس کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس شجر کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا جائے جسے انقلاب کی تند موجیں بھی تباہ نہیں کر سکتیں۔ ہیوگو لکھتا ہے:

> ''اگر چہ کلیدِ انقلاب قفلِ زیست کو وا کرتی ہے اور انقلاب اپنے پس و پیش قحط، زلزلے اور بجلیاں لاتا ہے تاہم اس تخریب میں تعمیر کا راز مضمر ہوتا ہے لیکن انقلاب بھی ''سزائے موت'' کو موت کے گھاٹ نہیں اُتار سکا۔''

اس کتاب میں وہ اپنے ہم وطنوں کو دعوت مبارزت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تمہارے پاس سزائے موت کے جواز میں جس قدر بھی دلائل ہیں مجھے اُن سے آگاہ کرو۔ وہ لوگ جو سزائے موت کو جائز قرار دیتے ہیں دلائل پیش کرتے ہیں کہ ایسے متنفس کو کہ جس نے معاشرتی زندگی میں تلخی پیدا کی قابلِ اخراج ہے۔ سب سے بہترین دلیل جو وہ پیش کرتے ہیں وہ نظریہء عبرت ہے۔ ہیوگو نظریہء عبرت کے ابطال میں مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''اگر ان مثالوں کی موجودگی میں بھی تم نظریہء عبرت کے قائل ہو تو گردشِ ایام کا رُخ ماضی کی طرف پھیر کر ہمیں سولھویں صدی عیسوی میں لے چلو، حقیقت میں خوفناک بن جاؤ،

ہمارے لئے تکالیف ومصائب کے دروازے کھول دو۔ گزشتہ زمانے کی وحشیانہ سزائیں از سرنو رائج کردو، ہر راہ گزر پر تختہء دار نصب کردو، بدنی سزا کو عام کردو۔ پیرس کے بازاروں میں دیگر دکانداروں کی طرح ایک دکان جلاد کی ہو، جہاں انسانی گوشت پوست دیگر اجناس کی طرح فروخت ہو —— فنا کو بادہء ہر جام کرنے اور سزائے موت کو اس طرح عام کرنے سے تم نظریہء عبرت کو زیادہ کامیاب بنا سکو گے۔''

ہیوگو تنسیخ سزائے موت کے معاشری ومجلسی اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''جس انسان کے لیے تم موت کی سزا تجویز کرتے ہو اس کے معاشرتی حالات کی حسب ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں:

اولاً وہ شخص افرادِ خاندان اور صحبتِ احباب سے محروم ہے۔ اس صورت میں وہ صحیح تعلیم و تربیت حاصل نہیں کرسکا۔ جب اُس کے دماغ کی اصلاح کے لیے کوئی سعی نہیں کی گئی تو تمہیں اس معاشری یتیم کے قتل کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

تم اُسے اس لیے قتل کرتے ہو کہ اُس کا زمانہء طفلی عدم نگہداشت کی نذر رہا۔ تم اسے اپنے کیے کی سزا دیتے ہو۔ تم اس بدبخت کو جُرم کا لباس پہناتے ہو۔

کیا تم اس وقت خوف زدہ نہیں ہوتے جب تم اس کے بچوں اور بچیوں کا خیال کرتے ہو؟ —— اُن بچوں کا جن سے زندگی کا سہارا چھن جائے گا۔

کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ آئندہ پندرہ برس تک اس کا بیٹا بھی غالباً زنداں میں ہوگا اور بیٹی تعیش پسند امراء کی نفسانی خواہشات کے بُجھانے کا ذریعہ ہوگی۔''

وہ غرباء کی لامتناہی وغیر مختتم تکالیف سے متاثر ہوکر لکھتا ہے:

''ترازوئے عدل کی طرف دیکھو۔ تمام مصائب غربا کے لیے اور تمام مسرتیں امراء کے لیے۔ دونوں پلڑے غیر مساوی ہیں۔ حکومت کو اس فریب دہی میں مدد نہ کرنی چاہیے کیونکہ اس سے غربا کے مصائب میں اضافہ ہوتا ہے۔

تم عدل وانصاف کو کام میں لاؤ تا کہ غربا کو معلوم ہوجائے کہ اُن کے لئے بھی نیلگوں آسمان کے نیچے کوئی جائے پناہ ہے، ایک ارضی جنت ہے جس کی لطیف فضاؤں سے وہ بھی متمتع ہو سکتے ہیں۔ ان کا مرتبہ بلند کرو تا کہ انہیں بھی معلوم ہو کہ امراء کی عشرت پرستی میں وہ بھی برابر

کے شریک ہیں۔"

ہیوگو اخوت اور محبت کی تلاش کرتا ہے چنانچہ وہ اس کتاب کے دیباچے کے آخر میں تحریر کرتا ہے:

"میں تمہاری معاونت چاہتا ہوں۔ کس مسئلے؟ ——— میں تبدیلی قوانین میں۔ مسیح کے اخلاقی قانون، انسانوں پر پھر حکمران ہوں گے۔ وقت آنے والا ہے جب ہم جرم کو مرض تصور کریں گے اور ججوں کی جگہ ان امراض کے رفع کرنے والے اور زندانوں کی جگہ شفاخانے ہوں گے۔ ایک نئے افق سے اخوت و محبت کا آفتاب طلوع ہوگا۔"

"سرگزشت اسیر"[۲] لکھنے کے بعد ہیوگو نے ایک مختصر افسانہ "claude guex"[۳] لکھا۔ اس افسانے کا مقصد بھی تنسیخ سزائے موت تھا۔

☆☆☆☆☆

حواشی

۱: Social Orphan

۲: یہ کتاب راقم الحروف کی ترجمہ کردہ ہے۔

۳: اس افسانے کا راقم الحروف، انتقام اسیر" کے نام سے ترجمہ کر چکا ہے۔

منٹو کے غیر مدوّن تراجم

افسانے

شراب اور شیطان

علی الصباح ایک غریب کسان رومال میں کھانے کے لیے کچھ باندھے کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ کھیت میں پہنچ کر اُس نے روٹی چادر میں لپیٹ کر ایک جھاڑی تلے رکھ دی اور ہل چلانے میں مشغول ہو گیا۔ کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد اُس کو بھوک محسوس ہوئی تو بیلوں کو ہل سے جدا کر کے وہ جھاڑی کی طرف چل پڑا۔

اُس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے چادر اُٹھا کر دیکھا کہ روٹی غائب ہے۔ مزید اطمینان کے لیے اُس نے چادر کو دوبارہ جھاڑ کر دیکھا مگر روٹی غائب تھی۔ کسان کی عقل اس معمے کو حل کرنے سے قاصر تھی۔

''یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے اس گردونواح میں کسی شخص کو نہیں دیکھا لیکن روٹی چرائی ضرور گئی ہے۔''

یہ سب حرکت ایک خُردسال شیطان کی تھی جو اُس وقت جھاڑی کے پیچھے بیٹھا اس بات کا منتظر تھا کہ کسان روٹی کو اس طرح کھو کر مغلظات سنائے اور شیطان کو برا بھلا کہے۔

کسان اپنے کھانے کی گمشدگی پر افسردہ ضرور تھا مگر اُس نے تحمل کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کسان نے اپنے دل میں کہا۔ ''مجبوری ہے کسی کو برا بھلا کیوں کہوں بھوک سے مر تو نہ جاؤں گا۔ شاید جو شخص یہ روٹی لے گیا ہے مجھ سے زیادہ بھوکا ہو۔ خدا اس کا بھلا کرے۔''

کسان کو گناہ کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر خردسال شیطان بہت سٹپٹایا اور اِس واقعے کو اپنے سال خوردہ سردار کے گوش گزار کرنے گیا۔ بوڑھے شیطان کے پاس آ کر اُس نے تمام

واقعہ من وعن بیان کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ کسان نے روٹی کی گمشدگی پر بجائے اظہارِ خشم کے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا کہ خدا روٹی چرانے والے کا بھلا کرے۔

بوڑھا شیطان یہ سن کر بہت رنجیدہ ہوا اور بولا "اگر تم کسان پر غالب نہیں آ سکے تو اس کی تمام تر وجہ تمہاری کمزوری ہے۔ تم اپنے فرائض سے بالکل بے بہرہ ہو۔ اگر صورت حالات یہی رہی تو پھر ہماری خیر نہیں۔ جاؤ اس کمی کو جہاں تک ہو سکے پورا کرو۔ اگر تم تین سال کے عرصے تک اِس کسان کو گناہ کی طرف راغب نہ کر سکے تو یاد رکھو میں تمہیں متبرک پانی میں غرق کر دوں گا۔"

خُردسال شیطان یہ سن کر بہت خوف زدہ ہوا اور اپنے فرض کی انجام دہی کے لیے زمین پر اتر آیا۔ کسان پر غالب آنے کے لیے بہت عرصے تک تدبیریں سوچتا رہا مگر کوئی قابل اطمینان نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخر بہت غور وفکر کے بعد اُسے ایک تجویز سوجھی۔

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اُس نے ایک مزدور کا بہروپ بھر کر اُس کسان کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔

پہلے سال اُس نے کسان کو رائے دی کہ وہ دلدل میں بیج بوئے۔ کسان نے خردسال شیطان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے دلدل میں بیج بو دیے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اِس سال اس شدت کی گرمی پڑی کے تمام کسانوں کی فصلیں جل کر راکھ ہو گئیں مگر گیلی زمین ہونے کے باعث اس کسان کی فصل خوب بارآور ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال کا خرچ نکال کر بھی کسان کے پاس بہت سا غلہ بچا۔

دوسرے سال خردسال شیطان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے کسان نے پہاڑی پر بیج بوئے۔ اِس سال معمول سے بہت زیادہ مینہ برسا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں کی فصلیں تو بارش سے تباہ ہو گئیں مگر اس کسان کی فصل پر جو سطح زمین سے بہت اونچی اور ڈھلوان تھی بارش کا کوئی اثر نہ ہوا اور اُس نے پہلے سال سے بھی زیادہ غلہ پیدا کیا۔ اب کسان کے پاس اس قدر غلہ ہو گیا کہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کس طرح استعمال میں لائے۔

خردسال شیطان نے، جو اسی موقع کی تلاش میں تھا، کسان کو ایک طریقہ سمجھایا جس سے وہ باقی ماندہ غلے کو کام میں لا سکتا تھا —— وہ طریقہ شراب کشید کرنے کا تھا۔

کسان نے خردسال شیطان کے حسب ہدایت اپنے باقی ماندہ اناج سے شراب کشید کی اور اپنے پینے کے علاوہ اپنے دوستوں کو بھی اُس کا طریقہء استعمال بتایا۔ اتنا کام کر کے شیطان اپنے سردار کے

پاس دوڑا گیا اور یہ خبر کہہ سنائی کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ بوڑھا شیطان یہ سن کر خوش تو بہت ہوا مگر وہ چاہتا تھا کہ اپنی آنکھوں سے اس بات کی تصدیق کرے۔ چنانچہ وہ دونوں کسان کے گھر آئے اور دیکھا کہ کسان نے اپنے دوستوں کو مدعو کر رکھا ہے جام پر جام چل رہا ہے، اور ساقی کے فرائض اُس کی بیوی انجام دے رہی ہے۔

ایک مہمان کو شراب کا پیالہ پکڑاتے وقت بد قسمتی سے وہ میز سے ٹکرا گئی جس پر پیالے سے شراب اچھل پڑی۔ یہ دیکھ کر کسان آگ بھبوکا ہو گیا اور غضب ناک لہجے میں چلایا ''اوندھی کھوپڑی! تم نے اس کو موری کا پانی سمجھ رکھا ہے؟ جو اس طرح زمین پر گراتی پھرتی ہو —— نابکار۔''

خرد سال شیطان اپنی کامیابی پر خوش ہوا اور فاتحانہ انداز میں بولا! ''دیکھا استاد یہ وہی شخص ہے جس نے آج سے کچھ عرصہ قبل اپنی روٹی کی گمشدگی پر اظہار افسردگی کرنے کے بجائے بھوکا رہنا قبول کیا تھا'' کسان نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی بیوی سے صراحی لے لی اور شراب خود بانٹنی شروع کی۔

اسی اثنا میں ایک غریب مزدور دن بھر کی محنت سے چور اس خیال سے کہ شاید مجھے بھی ایک قطرہ نصیب ہو جائے اندر داخل ہوا۔ وہ بے چارہ ناخواندہ مہمان کی طرح ایک کونے میں بہت عرصے تک پانی بھرے منہ سے بیٹھا رہا مگر کسی شخص نے بھی اسے نہ پوچھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسان نے بجائے کچھ دینے کے صرف اس قدر کہا ''کوئی کارخانہ تھوڑا کھول رکھا ہے میں نے کہ ہر ایک کو شراب بانٹتا پھروں'' یہ دیکھ کر بوڑھا شیطان بہت خوش ہوا مگر اس کے شاگرد نے کہا ''ابھی آپ نے کیا دیکھا ہے تھوڑا عرصہ اور ٹھہریے اور دیکھیے کیا گل کھلا چاہتا ہے۔''

کسان اور اس کے مہمان خوب جی کھول کر پی رہے تھے۔ اب سرور جو آیا تو لگے واہی تباہی بکنے۔ کسانوں کو اس طرح گفتگو کرتے دیکھ کر شیطان اور بھی خوش ہوا اور کہنے لگا ''اگر شراب ایسے نتائج پیدا کر سکتی ہے تو وہ دن قریب ہے جب یہ سب لوگ ہمارے مطیع ہو جائیں گے۔''

خرد سال شیطان نے فاتحانہ انداز میں کہا ''ٹھہریے اُستاد! ایک ایک پیالہ اور پی لینے دیجیے پھر دیکھیے کیا گل کھلتا ہے۔ اب تو یہ محض بیہودہ گوئی پر اکتفا کر رہے ہیں۔ ایک اور پیالے کے بعد یہ جنگلیوں کی طرح آپس میں لڑیں گے۔''

ایک اور دور کے بعد اُن کی یاوہ گوئی گالی گلوچ میں تبدیل ہو گئی اور گالی گلوچ لڑائی میں —— اب اُسی کمرے میں لڑائی جھگڑے کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میزبان نے بھی اس لڑائی میں

حصہ لیا اور خوب پٹا۔

یہ دیکھ کر سردار نے اپنے شاگرد کو تھپکی دیتے ہوئے کہا ''خوب ہے!!''

شاگرد نے پھر فخریہ لہجے میں کہا ''سب سے قابل دید حصہ ابھی باقی ہے —— تھوڑی سی اور پی لینے دیجیے انہیں، اور پھر دیکھیے تماشا''۔

آخری دور کے اختتام پر اُن کی حالت وحشیوں سے بھی بدتر ہوگئی اور ان میں سے ہر ایک نشے میں مست اپنی اپنی ہانکنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد مجلس برخاست ہوئی اور انھوں نے افتاں وخیزاں اپنے اپنے گھر کا رخ کیا۔ میزبان ان کو دروازے تک پہنچانے کے لیے اُٹھا کہ دہلیز پر منہ کے بل گر پڑا اور سوئر کی طرح وہیں لیٹا خرخر کرنے لگا۔

اس واقعے کو دیکھ کر بوڑھا شیطان اور بھی خوش ہوا اور اپنے شاگرد سے کہنے لگا ''خوش رہو میرے بچے! یہ شراب کی ایجاد خوب رہی۔ ہاں بتاؤ تو سہی اس میں کیا کیا ڈالا تم نے؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے یہ چیز وحشیوں اور درندوں کے خون سے تیار کی ہے۔ تبھی تو وہ پہلے وحشیوں کی طرح گفتگو کرتے تھے اور بعد ازاں لڑنے مرنے پر اتر آئے''۔

''نہیں استاد! اس میں درندوں وغیرہ کا خون نہیں۔ میرے لیے سب سے ضروری چیز یہ تھی کہ کسان کے پاس ضرورت سے زیادہ اناج ہو۔ وحشیوں اور درندوں کا خون تو انسان میں پہلے ہی سے موجود ہے مگر اس کے پاس ضرورت سے زیادہ چیز ہو تو وہ خون اپنی اصلیت ظاہر کر دیتا ہے۔''

''اب دیکھیے، پہلے کسان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی روٹی کی گمشدگی پر اظہارِ خشم نہ کیا۔ مگر جب اس کے پاس ضرورت سے زیادہ اناج ہوا تو اس نے چاہا کہ اُس کے ذریعے سے عیش کرے —— چنانچہ عیش کا طریقہ میں نے بتایا''۔

اور جب اُس نے اپنے عیش کی خاطر خدا کی بہترین نعمت کو بگاڑ کر شراب بنالی تو درندوں اور وحشیوں کا خون جو اس میں پہلے سے موجود تھا اپنی اصلیت دکھانے لگا۔ اب یہ شراب پیتا رہا تو ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا۔''

بوڑھا شیطان یہ سن کر بہت شاد ماں ہوا اور اپنے شاگرد کی پہلی خطا کو معاف کر کے اُسے ایک اعلیٰ عہدے پر ممتاز کر دیا۔

ماں

[اس کہانی کا مصنف الفیم ذوذ دلیا روس کا پہلا طنز یہ نگار (satirist) ہے الفیم ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی تعلیم کا زمانہ اوڈز نامی تجارتی گاؤں میں بسر کیا۔ اس کی تیز قوتِ مشاہدہ کی وجہ سے اُس کی دیہاتی زندگی کا اس کے کردار اور اس کی تخلیقی تحریروں پر بہت اثر پڑا۔ چونکہ الفیم انقلابی سرگرمیوں میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا کرتا تھا اس لیے وہ کئی بار جیل کی اندرونی ہوا کھا چکا ہے۔

الفیم کچھ عرصہ بورڈ نویسوں کا کام بھی کرتا رہا ہے۔ اُسے شروع ہی سے فلسفے اور جمالیات کے مطالعے کا بہت شوق رہا ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اُس نے افسانے قلم بند کرنے شروع کیے مگر کچھ عرصے کے بعد اس پیشے کو صرف اس خیال سے چھوڑ دیا کہ ایک ادیب کے لیے سنجیدہ ہونا ازبس ضروری ہے۔ مگر اس کے بعد اُس نے پھر ادب کی طرف توجہ دی اور اب کی دفعہ چھوڑنے کا خیال نہ کیا۔ اُس کے ابتدائی مضامین اخباروں میں چھپا کرتے تھے۔ الفیم دنیائے ادب سے متعارف ہو کر اچھا نام پیدا کر چکا ہے۔ اس کی تمام تحریریں ان دنوں کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔ اس کی کہانیوں کو دو حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔ پہلی وہ جو حقیقت پر مبنی ہیں اور دوسری وہ جن میں طنز کی چاشنی ہے۔ ''ماں'' دوسری قسم میں سے ہے۔ الفیم کی طرز تحریر فرانسیسی انشا پرداز اناطول فرانس سے کسی حد تک ملتی جلتی ہے۔]

(سعادت)

وہ ٹھنگنی، نحیف اور ایک بچے کی طرح چڑ چڑی تھی۔ اُس کی بیٹی نسیلیا کے متعلق صرف اس قدر کہا جا

سکتا ہے کہ وہ مضبوط، چوڑی چکلی کمر والی لڑکی، نوجوان کہلانے کی مستحق نہ تھی۔

شام کا وقت تھا۔ بیٹی گھر کو، جو ایک کمرے اور ایک باورچی خانے پر مشتمل تھا، جلدی جلدی صاف کرنے میں مصروف تھی۔ ماں کمرے کے درمیان کھڑی اپنے بدنما چہرے کو ہاتھ کی ہتھیلیوں میں چھپائے بڑبڑا رہی تھی۔

''کسے معلوم تھا کہ میں اس کوڑے کو جنم دوں گی ——— تو مجھے ابھی سے قبر میں دھکیل رہی ہے ——— مگر کیا ہوا تیرا بھی وقت آ رہا ہے ——— تجھے اس وقت معلوم ہوگا جب وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

وہ نفرت سے بڑبڑائے جاتی ہے مگر نسیٹیا اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی۔ وہ بڑی بے تابی سے کبھی کھڑکیوں کے پردے درست کرتی ہے، کبھی میز کی بھوری درازوں کو صاف کرتی ہے، اور کبھی مکھیوں سے اٹی ہوئی چند تصویروں کی گرد جھاڑتی ہے۔

یہ تصاویر چند خوبصورت نوجوانوں کی ہیں جن کے چہرے خوفزدہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خوف کیمرے کے سامنے بیٹھنے کے احساس کا نتیجہ ہے۔

جب نسیٹیا اُن پر سے گرد، اور وہ ننھے ننھے دھبے جو انہیں مکھیوں کی طرف سے تحائف کی صورت میں ملے ہیں، صاف کرتی ہے تو وہ بے اختیار ان کی طرف دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ ہاتھ جس میں جھاڑن ہے خود بخود لٹک جاتا ہے اور وہ کسی خیال میں غرق ہو جاتی ہے۔

بوڑھی عورت اس کو دیکھ کر پھر بڑبڑانے لگتی ہے۔ ''ہاں اپنے بدمعاش دوستوں کی طرف دیکھ، نا ہنجار خوب غور سے دیکھ! ——— اگر تیرا باپ زندہ ہوتا تو شاید وہ تجھے انسان بنالیتا۔ مگر اب تو جو کچھ کرے کم ہے۔''

اس موقع پر بیٹی خاموش نہیں رہتی۔

''تم کیا بکے جا رہی ہو۔ تم سے خاموش نہیں رہا جاتا۔'' وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہے مگر دروازے پر دستک کی آواز سنائی دیتی ہے اور ایک شائستہ آواز کہتی ہے ''کیا میں اندر آ سکتا ہوں'' ——— اس کے ساتھ ہی ایکاف گریگری وخ اپنا تیل سے چپڑا ہوا سر جھکائے اور ہاتھ میں گول ٹوپی پکڑے کمرے میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ نسیٹیا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہی ایسا واحد شخص نہیں جس کا یہ مقصد ہے۔

''ہا! ہا! ہا!'' نسیٹیا ہنستے ہوئے اُس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ ''تم عین وقت پر امّی کا تماشا دیکھنے آ گئے

ہو —— ہا! ہا! ہا! ذرا خیال تو کرو، وہ تم پر رشک کرتی ہے! ہا! ہا! ہا!''

وہ تالیاں بجاتی ہے اور اسی مذاق کو پانچ مرتبہ دہراتی ہے۔

ایکاف گرگیری وخ کلرک ہے۔ اس کے لب اس کی چھوٹی مگر خوبصورت مونچھوں کے نیچے مسکراتے ہیں اور وہ جھک کر بوڑھی عورت سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

''ہاں، ایسا ہو جایا کرتا ہے۔''

بوڑھی عورت خاموشی سے باورچی خانے میں جا کر ایک صندوق پر بیٹھ جاتی ہے۔ پانچ منٹ تک مکمل خاموشی طاری رہتی ہے۔ نسیٹیا، ایکاف سے ٹوپی لے کر اُس پر اپنا ہاتھ بڑے پیار سے پھیرتی ہے اور بیٹھ کر بتانا شروع کرتی ہے کہ کس طرح بازار میں لوگوں نے اُس پر زندگی حرام کر رکھی ہے۔ ایک طالب علم جو اُس کی بڑی بہن کے مکان میں فروکش ہے، اس سے دوستانہ مراسم بڑھانے کی فکر میں ہے مگر اُس کی بہن اس پر حسد کرتی ہے کیونکہ وہ اس کا کرایہ دار ہے۔

اس کے علاوہ وہ گزشتہ واقعات کا تذکرہ کرتی ہے کہ کس طرح اُس کے ایک دوست نے صرف اس کی وجہ سے اپنے آپ کو گولی سے ہلاک کر لیا تھا۔ کس طرح دوسرے نے اپنی منسوبہ کو چھوڑ دیا تھا اور کس طرح تیسرے نے اپنی بیاہتا عورت کو طلاق دے دی تھی۔ صرف اُس کی خاطر۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ابھی کچھ روز گزرے ایک آدمی نے اُسے سینما جانے کے لئے لکھا تھا اور دوسرے نے............

مگر گفتگو کے دلچسپ ترین موقع پر اُس کی ماں کی غضب آلود آواز باورچی خانے سے سنائی دیتی ہے۔

''بیوقوف، اتنا جھوٹ نہ بول، یہ سخت تکلیف دہ ہے''

یہ سنتے ہی نسیٹیا اچھل پڑتی ہے اور اپنے گردو پیش نا اُمیدی میں نظر دوڑاتی ہے۔ وہ شرمندگی اور بے چینی محسوس کرتی ہے، مگر ایکاف پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ صرف مسکرا دیتا ہے۔ ماں باورچی خانے میں بدستور بڑبڑاتی ہے۔

''طالب علم! طالب علم! سینما! دوستانہ مراسم بڑھاتا ہے!'' یوں وہ اپنی لڑکی کی نقل اتار کر اس کا مذاق اڑاتی ہے۔'' سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہ سب ایک معصوم لڑکی کو تباہ کرنے میں کافی مشاق ہوتے ہیں۔ پھر تو کون اور میں کون۔'' بوڑھی عورت عرصے تک بڑبڑاتی رہتی ہے۔ مگر نہ ایکاف اور نہ نسیٹیا کسی قسم کا اضطراب ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔

نصف گھنٹے کے بعد وہ باورچی خانے سے پھر اس کو منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے سنتے ہیں۔ بوڑھی عورت اپنے لیے ٹرنک پر بستر تیار کر رہی ہے۔

نسیٹیا ایکاف کے قریب ہو کر بیٹھ جاتی ہے اور اس کی ٹوپی پر پہلے سے زیادہ محبت سے ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔ پھر وہ دبی زبان میں بہت آہستہ آہستہ ان طلبہ کا ذکر کرتی ہے جو اس کی طرف خاص توجہ دیا کرتے ہیں۔ ایکاف اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کا منہ چومنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ بہت عرصے تک ایک دوسرے کو چومتے اور سرگوشیوں میں گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار بوڑھی عورت کی غیر مطمئن آواز کو سننے کے لیے ٹھہر جاتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے لیے دروازے کی طرف غور سے دیکھ کر پھر اپنی گفتگو میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

بوڑھی عورت پھر بڑبڑانے لگتی ہے۔ ''ایک ہی مکان میں رہ کر یہ نظارہ دیکھنا! بے حیا! بے حیا! شرم نام کو نہیں۔ ضمیر تو ہے ہی نہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ میں نے تجھے جنم نہ دیا ہوتا! پیر کے روز میں یہاں سے کسی محنت خانے میں چلی جاؤں گی۔ وہاں مجھے نرس کا کام مل جائے گا۔ گو پانچ روبل مہینے کے ملیں گے مگر کم از کم اپنے ہاتھ کی کمائی تو میسر ہو گی۔ میں ایسی اولاد سے لنڈوری ہی بھلی!''

بوڑھی عورت کی لعنت ملامت ختم نہیں ہوتی لیکن وہ اس کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔ نسیٹیا مسرور ہے اور اب اپنی رضامندی سے اپنے عاشق کے ساتھ بغلگیر ہوتی ہے۔

بوڑھی عورت اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اچھل پڑتی ہے اور اپنا لباس پہن کر شال کاندھوں پر لیتی ہوئی وہاں سے اپنی دوسری لڑکی کے ہاں جو بیوہ ہے رات کاٹنے کے لئے روانہ ہو جاتی ہے۔

بیوہ کا مکان دو کمروں اور ایک باورچی خانے پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک کمرہ ایک ایسے شخص نے لے رکھا تھا جس کے چال چلن کے متعلق کوئی خاص رائے وثوق سے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ دوسرے کمرے میں بیوہ رہتی تھی۔ باورچی خانے میں ایک زائد بستر خادمہ کے لئے بھی تھا مگر خادمہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ خالی تھا۔

لکڑی کی پیچ دار سیڑھیاں چڑھتے وقت وہ اُسی قسم کی ہنسی کی آواز سنتی ہے جو اُس نے نسیٹیا کے ہاں سنی تھی۔ اس ہنسی کے ساتھ اس کی بیوہ لڑکی بولتی ہے۔

''سو تم مجھے عجیب خیال کرتے ہو؟ ہا! ہا! ہا! —— بتاؤ تو میں عجیب کس طرح ہوئی۔؟

''تم دونوں عجیب مگر دل فریب عورتیں ہو'' ، ایک مردانہ آواز جواب دیتی ہے۔ ''تم میں اتنی ——

تم زندگی سے معمور ہو!''

''ہا! ہا! ہا!'' بیوہ ہنستی ہے۔ اسی موقع پر جب کہ گفتگو گرم ہونے والی تھی اس کی ماں نمودار ہوتی ہے۔

ہنسی فوراً گم ہو جاتی ہے۔

کرایہ دار، ایک ماندہ شخص، جوانی کی حدود سے گزرا ہوا۔ اپنے کمرے کی دہلیز میں کھڑا سگرٹ پی رہا ہے۔ بیوہ اس کے سامنے بیٹھی بڑی ادا سے اپنے سینے پر ہار کے دانوں کو انگلیوں سے چھیڑ رہی ہے۔ ماں کو دیکھتے ہی بول اٹھتی ہے۔

''امی! اس وقت اتنی رات گئے بعد؟ باہر اس قدر ہوا چل رہی ہے۔ اس کے علاوہ اتنا کہر ہے مگر تم صرف ایک شال اوڑھے چلی آئی ہو۔''

بوڑھی عورت کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ باورچی خانے کے چراغ کو گل کرنے کے بعد خاموشی سے بستر پر لیٹ جاتی ہے۔ بیوہ جو اپنی ماں کی طرح چڑچڑی ہے، اس دفعہ غصے کے لہجے میں بولتی ہے، ''تم جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔ شاید تم پھر نسیٹیا سے لڑ جھگڑ کر آئی ہو؟'' پھر وہ اپنے کرایہ دار کی طرف مخاطب ہوتی ہے'' کیا تم ایشان کو جانتے ہو؟ اگر تم واقعی کسی عجیب عورت کی تلاش میں ہو تو میری مکرم والدہ موجود ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میری امّی کا یہی دستور ہے کہ مجھ سے بھاگ کر نسیٹیا کے ہاں چلی جائے اور وہاں سے بھاگ کر میرے ہاں چلی آئے۔ کیا تماشا ہے۔ آج مجھ سے لڑائی ہے اور کل نسیٹیا سے۔ واقعی ایسی عجیب عورت تمہیں بمشکل مل سکے گی!''

''عجیب عورت'' یہ الفاظ بڑھیا کو بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں اور وہ سمجھ جاتی ہے کہ اس کی آمد اُس کی لڑکی کو بہت ناگوار گزری ہے۔ یہ خیال اُسے اور بھی بے چین کر دیتا ہے۔ وہ بڑبڑا کر کہتی ہے:

''اگر تمہیں میرا اس صاف بستر پر سونا ناگوار ہے تو میں یہاں سے اُٹھ کر زمین پر لیٹ جاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ فوراً ہی بستر میں سے نکل کر زمین پر چند چیتھڑے بچھا دیتی ہے اور ان پر لیٹ جاتی ہے۔

بیوہ اپنی جگہ غصے میں بھری ہوئی ہے۔'' وہ نسیٹیا ایسی صابر نہیں۔'' کیا تم یہاں فساد مول لینے آئی ہو؟ میں نے تمہیں کیا گزند پہنچایا ہے؟ یہ حرکت تم کیوں کر رہی ہو؟ —— کیا تمہیں معلوم ہے''۔ وہ مڑ کر اپنے کرایہ دار سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔'' یہ بہت حاسد ہے ہر وقت تکلیف دینے پر تلی رہتی ہے۔ کاش تمہیں صرف یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہتی۔''

بوڑھی عورت زمین پر لیٹے لیٹے جواب دیتی ہے'' تم مجھے قبر میں دھکیل رہی ہو۔ کسے معلوم تھا کہ میں ایسی بے حیا لڑکی کو جنم دوں گی —— خدا تمہیں برباد کرے —— میں کل کسی محنت خانے میں جا کر نرس کا کام تلاش کروں گی۔ گو پانچ روبل مہینے کے ملیں گے مگر اپنی کمائی کی روزی تو میسر ہوگی۔ مجھے ایسی اولاد درکار نہیں ہے! اللہ کرے انہیں آگ جلا کر خاک سیاہ کر دے''

بیوہ اپنی ماں کی لعنت ملامت سن کر تنگ آ جاتی ہے اور چاہتی ہے کہ اپنے ہمسائے کرایہ دار کے ساتھ اپنی پہلی گفتگو کو جاری رکھے جو اس سے کہتا ہے۔

''لونڈ ملا! تم خواہ مخواہ کیوں دق ہوتی ہو! معمولی بات ہے۔ بوڑھوں کا مزاج اسی طرح چڑ چڑا ہو جایا کرتا ہے۔ آؤ ہم اپنی باتیں کریں۔ ہم کیا کہہ رہے تھے؟ مگر تم میرے کمرے میں کیوں نہیں آ جاتی ہو۔ آ جاؤ نا۔ یہاں نسبتاً خاموش فضا ہے۔''

نصف گھنٹے کے بعد بوڑھی عورت جو ابھی تک سو نہیں سکی، بلند قہقہے، سرگوشیاں اور بوسوں کی آواز سنتی ہے۔

—— بغیر ایک لفظ کہے وہ زمین پر سے اُٹھتی ہے اور کاندھوں پر اپنی شال ڈال کر دروازے کے عقب سے غائب ہو جاتی ہے۔

بازار میں ہوا دکانوں پر لگے ہوئے بورڈوں کو الٹ پلٹ رہی ہے۔ برف کے گالے چھتوں سے لڑھکتے ہوئے بازار میں گر رہے ہیں۔

بے پناہ سردی سے ٹھٹھرتی، کانپتی، بچتی اور شال کو اپنے گرد لپیٹتی، بوڑھی عورت بازار کو طے کر کے چوک کی طرف رُخ کرتی ہے اور اچانک ٹھہر جاتی ہے۔ بازار بالکل سنسان ہے چوک میں پہرے پر کھڑے ہوئے سپاہی کے علاوہ کوئی اور متنفس دکھائی نہیں دیتا —— صرف بوڑھی عورت کا نیلا لانبا سایہ برف پر پڑ رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

زار اور اُس کے وزراء کے نام کھُلی چٹھی

''پھر وہی قتل کی وارداتیں، پھر وہی بدامنیاں پردۂ ظہور پر آئیں گی۔ بازاروں میں پھر وہی کشت وخون ہوگا۔ ایک جانب مقدمے، خوف وہراس، جھوٹے الزامات، دھمکیاں اور غصہ ہوگا۔ دوسری طرف انتقام کی پیاس، نفرت اور قربانیوں کے لیے جدوجہد ہوگئی۔ اب پھر روسی قوم دو حصوں میں منقسم ہوکر عظیم سے عظیم جرائم کا ارتکاب کرنے پر آمادہ ہے۔

بہت ممکن ہے کہ یہ بدامنیاں جواب رونما ہوئی ہیں، تشدد سے دب سکیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ پولیس اور سپاہیوں کے وہ دستے جن پر حکومت کو اتنا اعتماد ہے، یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ برادر کشی ایسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرنے پر آمادہ کیے جارہے ہیں، حکم کی تعمیل کرنے سے یکسر انکار کر دیں۔

اگر موجودہ بدامنی دبادی جائے تو بھی شورش کی آگ مکمل طور پر ہرگز بجھ نہیں سکتی۔ وہ اندر ہی اندر بھڑکتی رہے گی اور جلد یا بہ دیر پوری قوت سے باہر نکل کر پہلے سے کہیں زیادہ مصائب کا باعث ہوگی۔

یہ بدامنی کیوں پیدا ہوئی ہے؟

ایسی چیزیں کیوں رونما ہوں۔ جب ان کا بڑی آسانی سے انسداد کیا جاسکتا ہے؟ ہم آج، تم ان سب سے مخاطب ہیں جن کے ہاتھ میں اختیار ہے۔ زار کونسل آف سٹیٹ اور وزراء سے بلکہ ان کے رشتہ داروں تک سے، ان کے چچوں سے، بھائیوں سے، زار اور اس کے ان رفقا سے جو اس پر اثر ڈال سکتے ہیں، التجا کرسکتے ہیں۔ دشمنوں سے نہیں بلکہ ان بھائیوں سے ملتجی ہیں جو رضامندانہ یا غیر رضامندانہ طور پر ہم سے ایک ناقابل انقطاع رشتہ رکھتے ہیں اور اس طرح، وہ مصائب جن سے ہم دوچار ہوتے ہیں ان پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ کاش تم یہ محسوس کرو کہ تم یہ مصائب دور کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے

بھی ایسا کرنے میں متامل رہے ہو اور اس کا مضر اثر ہم سے کہیں زیادہ تم پر ہو گا۔ ہم درخواست کرتے ہیں کہ ایسا طرزِ عمل اختیار کرو جس سے موجودہ رفتارِ واقعات رُک جائے۔

یہ تمہارا یا تم میں سے اکثر افراد کا خیال ہے کہ یہ شورش صرف اس لیے وقوع پذیر ہوئی ہے کہ زندگی کی عمومی رو میں چند ایسے شورش پسند و غیر مطمئن لوگ موجود ہیں جو اس نظام میں خلل ڈالنا چاہتے ہیں اور یہ کہ اس غلطی کے صرف عوام ذمہ دار ہیں۔ اس لیے ان شورش پسند و غیر مطمئن لوگوں کو دبا دینا چاہیے۔ پھر سب باتیں درست ہو جائیں گی اور کسی خاص تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہو گی۔ اگر واقعی یہ بدامنی شر یر اور تکلیف دہ لوگوں ہی کی پیدا کردہ ہے تو پھر ضرورت اس امر کی ہے کہ ان لوگوں کو پکڑ پکڑ کر قید خانوں میں ڈال دیا جائے اور انہیں عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔ اس طرح ان اصحاب کے نقطۂ نظر کے مطابق بدامنی دور ہو جائے گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تیس سال سے کچھ زائد عرصے کے دوران میں ایسے ہزاروں لوگ پکڑے گئے ہیں۔ سپردِ زنداں کیے گئے ہیں، انہیں سزائیں دی گئی ہیں، جلاوطن کر دیا گیا ہے، مگر پھر بھی ان کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے اور اضطراب موجودہ صورت حالات کے اندر نہ صرف پیدا ہو رہا ہے بلکہ یہ بڑھ رہا ہے حتیٰ کہ یہ مزدور جماعت کے ہر فرد کے سینے تک جا پہنچا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قوم کی سب سے زیادہ تعداد رکھنے والی جماعت مضطرب ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ بدامنی شر پسند لوگوں کی پیدا کردہ نہیں بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہی ہے۔ تمہیں ——— حکومت کے اربابِ حل و عقد کو Ministers of the Interior کے اس تازہ اعلان سے کہ پولیس کو امن قائم رکھنے کے لیے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے گولی چلانی چاہیے قطع نظر کر کے موجودہ مسئلہ پر پورا غور کرنا چاہیے۔ اگر تم ایک لمحے کے لیے بھی غور کرو تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ لوگوں میں اضطراب پیدا کرنے والی وہ کیا چیز ہے جو ان تمام بدامنیوں کا جو روس کے طول و عرض میں رونما ہو رہی ہیں سرچشمہ ہے؟ بات یہ ہے کہ چونکہ بدقسمتی سے ایک زار جس نے غلاموں کو آزاد کر دیا تھا ایک ایسی جماعت کے چند افراد کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا جو اسی کو قوم کی بہترین خدمت تصور کرتے تھے۔ اس لیے حکومت نے مطلق العنانی کو ترک کرنے کے بجائے اسی جابرانہ رویے کو برقرار رکھا۔ اس خیال سے کہ حفظ امن کا راز محض جبر و تشدد میں مضمر ہے۔ حکومت بیس سال سے عوام اور ان کے مطالبات سے دور دور رہنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس بدامنی کا باعث شورش پسند لوگ نہیں بلکہ تم خود ہو ——— تم حکام جو صرف

اپنے انفرادی امن کے خواہاں ہو۔ اس وقت اس بات کی ضرورت نہیں کہ تم اُن دشمنوں سے بچنے کی تدابیر عمل میں لاؤ جو تمہیں گزند پہنچانا چاہتے ہیں —— تمہیں کوئی گزند پہنچانا نہیں چاہتا، مطمئن رہو —— بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ تم اس عام اضطراب کی اہمیت محسوس کر کے اسے دور کرنے کی کوشش کرو۔ انسان، دشمنی اور منافقت کا کبھی خواہش مند نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے ہم جنس افراد کے ساتھ خلوص و محبت کی زندگی بسر کرنا زیادہ پسند کرتا ہے۔

اگر وہ اب غیر مطمئن ہیں اور تمہیں گزند پہنچانے کے خواہاں معلوم ہوتے ہیں تو اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ ان کی نظروں میں کیا تم ایسے لوگ ہو جو نہ صرف ان سے بلکہ ان کے کروڑوں بھائیوں سے آزادی عمل اور آزادی فکر ایسی بڑی نعمتیں چھین رہے ہو۔

ان لوگوں کا اضطراب رفع کرنے کے لیے ایک معمولی چیز کی ضرورت ہے اور یہ معمولی چیز دے ڈالنا تمہیں لازم ہے کیونکہ اس کے عطا کرنے پر تمہیں سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمیں سخت تعجب ہوگا اگر تم اس کے عطا کرنے میں پس و پیش کرو۔

جن باتوں پر فی الفور عمل کرنے کی ضرورت ہے ان کا شمار بالکل مختصر ہے یعنی:۔

اولاً کاشتکاروں کو دوسرے شہریوں کے ساتھ مساویانہ حقوق عطا کر دیے جائیں۔ بناءً علیہ۔

الف: ''زمسکی نشالنکس'' کا احمقانہ ثالثی ادارہ (Arbitary Institution) ختم کر دیا جائے۔

ب: مزدوروں اور آجروں کے تعلقات کی نگرانی سے تعلق رکھنے والے ضوابطِ خصوصی منسوخ کر دیے جائیں۔

ج: کاشتکار ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے کے لیے پروانہ، راہداری حاصل کرنے کی تکلیف دہ مجبوری سے آزاد کر دیے جائیں۔ سرکاری عہدہ داروں کے لیے جائے قیام اور گھوڑے بہم پہنچانے کی ذمہ داری اور پولیس کی ملازمت کے لیے آدمی مہیا کرنے کی پابندی سے وہ آزاد قرار دے دیے جائیں۔

د: انہیں اس غیر منصفانہ قانون کے شکنجے سے رہائی دلائی جائے جو انہیں دوسرے کاشتکاروں کے قرضوں کے مشترکہ طور پر ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ نیز انہیں اراضی زیرِ کاشت کے زرِ ندرانہ سے بھی نجات دلوادی جائے کیونکہ جس وقت انھوں نے کاشت کے لیے زمین کا قبضہ حاصل کیا تھا اس وقت سے لے کر آج تک وہ اس سلسلے میں اس قدر روپیہ ادا کر چکے ہیں جو زمین کی مالیت

سے کہیں زیادہ ہے۔

بالخصوص سزائے تازیانہ کے لغو، قطعاً غیر ضروری اور شرمناک رواج کو ختم کر دیا جائے۔ یہ ظلم انسانی آبادی کے صرف اس طبقے پر روا رکھا گیا ہے جو سب سے زیادہ محنت کش، با اخلاق اور تعداد کے لحاظ سے حدِ شمار سے باہر ہے۔ زراعت پیشہ طبقے کے حقوق کو (جسے ملک کی انسانی آبادی میں نمایاں اکثریت حاصل ہے) دوسرے طبقوں کے حقوق کے برابر کر دینا خاص طور پر ضروری ہے کیونکہ دنیا کا کوئی ایسا قانون ِ معاشرت دیرپا اور مستحکم نہیں ہوسکتا، جس کی موجودگی میں اکثریت کو مساویانہ حقوق سے بہرہ اندوز کرنے کی بجائے پست ترین حیثیت میں رکھا گیا ہو اور ساتھ ہی استثنائی قوانین کے شکنجے میں جکڑ دیا گیا ہو۔ سوسائٹی کا محکم اور قابلِ قبول ضابطہ صرف یہ ہے کہ مزدوری پیشہ اکثریت کو وہی حقوق حاصل ہوں جو دیگر شہریوں کو حاصل ہیں اور یہ کہ غریب مزدور شرمناک پابندیوں سے آزاد رکھے جائیں۔

ثانیاً (The Statute of Increased Protection) جو ملک کے تمام مروجہ قوانین کو منسوخ قرار دے کر عوام کو ان سرکاری عہدہ داروں کے حوالے کر دیتا ہے جو عام طور پر بد اخلاق، بیوقوف اور بے رحم ہوتے ہیں۔ اس کو فوراً منسوخ کر دیا جائے۔ اس قانون کا تعطل خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ قانون عامہ کی حرکت کو روک دینے سے خفیہ ریشہ دوانیوں اور جاسوسیوں کا رواج ترقی پذیر ہو جاتا ہے۔ عام تشدد اور دہشت زدگی کے لیے شہ مل جاتی ہے۔ جس کا خمیازہ اُن مزدوروں کو کھینچنا پڑتا ہے جو اپنے کارخانہ داروں یا زمینداروں سے اختلاف رکھتے ہیں (یہ مظالم ان علاقوں کے سوا جہاں یہ ضابطہ خصوصی جاری کر دیا گیا ہے اور کہیں معرضِ ظہور میں نہیں آتے۔) ان امور سے قطع نظر اس ضابطے کی تنسیخ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسی اور صرف اسی ہولناک طریق کار کی برکت سے سزائے موت ۱؎ یہاں رائج ہوئی اور زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل کرتی گئی۔ یقیناً یہ سزا انسانوں کو گنہگار بناتی ہے اور اہل روس کے مسیحی جذبات کے قطعاً مخالف ہے۔ ازمنہء ماضیہ میں روس کا ضابطہء تعزیرات اس سے بالکل خالی تھا۔ یہ سزا بذاتِ خود عظیم ترین جرم ہے جسے خدا اور ضمیر نے ممنوع قرار دیا ہے۔

ثالثاً۔ تعلیم، معارف اور علوم کے راستوں میں جو رکاوٹیں حائل کر دی گئی ہیں وہ قطعاً اٹھا دی جائیں۔ یہ لازم ہے کہ:-

(الف) کوئی ایسا امتیاز روا نہ رکھا جائے جو عوام کے کسی طبقے کے لیے حصولِ تعلیم کے معاملے میں سدِ

راہ ہو۔ان تمام پابندیوں کا خاتمہ کر دیا جائے جن کا نشانہ خاص طور پر زراعت پیشہ طبقوں کو بننا پڑتا ہے۔(عام پسند منشورات، مدارس اور کتب کے خلاف یہ کہہ کر امتناعی احکام جاری کر دینا کہ یہ عامیوں کے لیے مضر ہیں، ناجائز ہے)

(ب) جملہ مدارس کے دروازے ہر مذہب اور ہر ملت کے افراد کے لیے کھلے رہیں (یہودیوں کے لیے کوئی استثنا روا نہ رکھا جائے۔انہیں نامعلوم وجوہ کی بنا پر اس حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔)

(ج) معلمین کو اس زبان کے استعمال کی اجازت نہیں جو سکول میں حاضر ہونے والے بچے بولتے ہیں۔اس پابندی کو دور کر دیا جائے۔

(د) سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر قسم کے پرائیویٹ مدارس و مکاتب کے اجرا و قیام کی اجازت ہر اس شخص کو دی جائے جو اپنے تئیں ترقیٔ تعلیم کے لیے وقف کرنا چاہے۔

تعلیم اور معارف کو ان تمام پابندیوں سے جو آج کل عائد ہیں آزاد رکھنا ضروری ہے۔اس لیے کہ یہی محنت پیشہ لوگوں کو اس ناواقفیت کی قید سے آزاد نہیں ہونے دیتیں جو آج کسانوں پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے حکومت کو عذر یا حربہ کا کام دے رہی ہیں۔تعلیم کے معاملے میں محنت کش طبقوں کو حکومت کی حائل کردہ رکاوٹوں سے آزاد کر دینا، اُن تمام علوم کی تحصیل کا سہل ترین اور تیز ترین ذریعہ ہوگا جن کی عوام کو ضرورت ہے اور جو اس علم کا نعم البدل ہیں، جسے حاصل کرنے پر وہ آج مجبور کیے جاتے ہیں۔

درسگاہوں میں اصحاب اقتدار کی غیر تسلی بخش روش کے باعث آج طلبہ کے درمیان جو ہنگامے رونما ہو رہے ہیں، وہ پرائیویٹ سکولوں کے اجراء اور پرائیویٹ اشخاص کو ان کا نظم و نسق قائم رکھنے کی آزادی مل جانے کے بعد ختم ہو جائیں گے۔اگر پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں کے اجراء کی راہ میں رکاوٹیں حائل نہ ہوتیں تو وہ نوجوان جو سرکاری درسگاہوں کے نظم و نسق سے غیر مطمئن ہیں ہنگامہ آراء ہونے کی بجائے اس پرائیویٹ مکتب میں جا داخل ہوتے جو اُن کی ضروریات کے لحاظ سے مناسب ہوتا۔چوتھی اور آخری چیز جو ان سب سے ضروری ہے یہ ہے کہ مذہبی معاملات کو تمام قیود سے آزاد کر دیا جائے۔یہ ضروری ہے کہ:

(الف) وہ تمام قوانین منسوخ کر دیے جائیں جو حکومت کے قائم کردہ کلیسا سے علیحدگی اختیار کرنے والوں کو مجرموں کی طرح مستوجب سزا قرار دیتے ہیں۔

(ب) ہر قسم کے عقائد رکھنے والوں کو اس امر کی اجازت ہو کہ وہ گرجے، معبد اور عبادت کے مرکز کھول سکیں اور انہیں قائم رکھ سکیں۔

(ج) مذہبی جلسوں کے انعقاد اور مذہبی عقائد کی تبلیغ کی اجازت عام ہو۔

(د) مختلف عقائد کے پیرووٴں کے راستے میں ایسی کوئی رکاوٹ نہ ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم نہ دلا سکیں۔

اس بات کی اہمیت ظاہر ہے۔ تاریخ اور سائنس کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے اور ویسے بھی یہ امر مسلم ہے کہ مذہبی تشدد مفید ثابت نہیں ہوا کرتا بلکہ اُس کا اُلٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کا مٹانا مقصود ہو وہ اور مستحکم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہب کے معاملے میں حکومت کے ایجاد و اختراع ان مضر ترین اور مکروہ ترین ریاکاریوں کا سرچشمہ بن کر رہتے ہیں جن کی حضرت مسیح نے سخت مذمت کی ہے۔ ان تمام حقائق سے قطع نظر معتقدات میں حکومت کا دخل ہر اس شخصی اور اجتماعی کوشش کو جو اتحادِ باہمی کے مبارک اور بلند مقصد کی راہ میں کی جاتی ہے، روک دیتا ہے۔ واضح رہے کہ اتحاد کی غرض وغایت اس سے پوری نہیں ہو سکتی کہ تمام انسانوں کو جبراً اور ناممکن طور پر ایک ہی خارجی عہد کا پابند کر دیا جائے اور ساتھ ہی ان کے دماغ میں یہ چیز گھسیڑ دی جائے کہ یہی ایک عقیدہ ہے جو خامیوں سے پاک ہے بلکہ اس مقصد کے حصول کا طریقہ صرف یہ ہے کہ تمام عالمِ انسانی صداقت کی طرف ترقی کرے کیونکہ صرف صداقت ہی فی الواقع بنی نوع انسان کو متحد کر سکتی ہے

ہمارا یقین ہے کہ یہی وہ جائز اور آسانی کے ساتھ دائرہ احساس میں آجانے والی خواہشیں ہیں جو اہلِ روس کی نمایاں اکثریت کے دل میں ہیں۔ لاریب ان تجاویز کو جامہٴ عمل پہنا دینے سے عوام کا اضطراب مبدل بہ سکون ہو جائے گا اور انہیں ان ہولناک شدائد سے (نہیں بلکہ ان سے بھی بدتر جرائم سے) نجات مل جائے گی جو لامحالہ جانبین سے سرزد ہو کر رہیں گے۔

اگر حکومت اپنے تئیں صرف ہنگامے فرو کرنے میں مصروف رکھے اور ان ہنگاموں کے اسباب وعلل کو نظر انداز کر دے تو اُس کا یہ طرزِ عمل کسی طرح قرین دانش نہ ہوگا۔

ہم آپ سب سے، زار سے، وزراء سے، کونسل آف سٹیٹ اور پریوی کونسل کے ارکان سے، اُن تمام حضرات سے جو زار کی مصاحبت میں ہیں اور عمومی حیثیت میں اُن سب سے جو برسرِ اقتدار ہیں، اپیل کرتے ہیں کہ وہ قوم کو اطمینان کی زندگی سے بہرہ مند کرانے اور اُسے شدائد و جرائم کی لعنتوں سے

آزاد رکھنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔

ہم آپ کو ایک جماعتِ اعدا سمجھ کر یہ اپیل نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بالآخر زمانہ آپ کو ہمارا ہم آہنگ ہو جانے پر مجبور کر دے گا اور ہمارا موجودہ مفروضہ بعد میں صحیح ثابت ہوگا کہ آپ ہمارے رفیق کار اور بھائی ہیں۔

یہ تو ہو نہیں سکتا کہ انسانوں کی کسی سوسائٹی یا انجمن میں باہمی مفاہمت سے کوئی ایسی قرارداد منظور ہو جائے جو ایک فریق کے لیے تو باعثِ مسرت ہو اور دوسرے کے لیے موجبِ زحمت۔ بالخصوص یہ تو قطعاً امکان سے باہر ہے کہ باہمی مفاہمت کی قرارداد کے باعث زحمت میں مبتلا ہو جانے والا گروہ اکثریت پر مشتمل ہو ایسی مفاہمت مقبول اور ہمہ گیر صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ یہ سب سے زیادہ جفاکش اور سب سے زیادہ محنتی عنصر کے لیے موجبِ خیر ہو کیونکہ یہی عنصر ساری سوسائٹی کی جان ہے۔

پس آپ اس اکثریت کا درجہ بلند کرنے کی غرض کے پیش نظر ہمارا ہاتھ بٹائیے اور اس امر میں جو قوم کی اکثریت کی آزادی اور ذہنی ترقی کا ضامن ہے، ہمیں مدد دے کر خود اپنی حیثیت کے محفوظ و مستحکم رکھنے کا بندوبست کیجیے۔

یہ لیو طالسطائی کا نوشتہ ہے جس نے اُسے قلم بند کرتے ہوئے نہ صرف ذاتی خیالات کے اظہار کی کوشش کی ہے بلکہ اس میں بہترین، مخیّر ترین، قطعاً بے غرض اور غیر معمولی عقل کے انسانوں کی آراء و افکار کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ یہ تمام حضرات ان باتوں کے خواہشمند ہیں۔''

۱۵/مارچ ۱۹۰۱ء

☆☆☆☆☆

حواشی

۱: فرانسیسی انشا پرداز وکٹر ہیوگو بھی سزائے موت کے فتوے کو عدل و انصاف کی رُو سے غداری بتاتا ہے۔ تنسیخ سزائے موت کے معاشرتی و مجلسی اسباب کے لیے ہیوگو کی تصنیف ''سرگزشت اسیر ملاحظہ فرمائیں جس کا راقم الحروف ترجمہ کر چکا ہے۔

۲: طالسطائی خود ایک سکول کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا، جسے اُس نے بعد ازاں پرائیویٹ طور پر جاری کیا۔

(مترجم)

تین روسی کہانیاں

خدا کی مرضی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی ملک میں دو کسان رہتے تھے۔ ایفان اور ناؤم۔ وہ دونوں کمانے کے لیے اکٹھے ایک گاؤں میں گئے اور دو مختلف آقاؤں کے پاس نوکر ہو گئے۔ ہفتہ بھر وہ کام کرتے رہے اور صرف اتوار کو آپس میں ملے۔

ایفان نے دریافت کیا ''بھائی تم نے کیا کمایا ہے؟''

''خدا نے مجھے پانچ روبل بخشے ہیں۔''

''خدا نے دیے ہیں؟ وہ تو مزدوری سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں دیتا۔''

''نہیں میرے بھائی، خدا کی مرضی کے بغیر ہم ایک پیسہ بھی نہیں کما سکتے۔''

چنانچہ وہ اس پر بہت دیر تک جھگڑتے رہے، آخر کار فیصلہ یہ ہوا:

''ہم چلتے ہیں اور سب سے پہلا شخص جو ہمیں راستے میں ملے گا، منصف ہو گا۔ ہم دونوں میں سے جو شخص ہار جائے گا وہ اپنی کمائی دوسرے کے حوالے کر دے گا''۔

چنانچہ وہ ابھی بیس قدم بھی نہ بڑھے تھے کہ انہیں ایک شیطان، آدمی کا بھیس بدلے ہوئے ملا۔ انہوں نے اُس سے دریافت کیا تو وہ بولا۔

''خدا پر کوئی بھروسا نہ رکھو جو کما سکتے ہو کمائے چلو۔''

ناؤم نے شرط کے مطابق اپنا کمایا ہوا روپیہ ایفان کے حوالے کر دیا اور آپ خالی ہاتھ گھر واپس

آ گیا۔ایک ہفتے کے بعد دونوں دوست پھر ملے اور وہی بحث کرنے لگے۔ناؤم بولا''گوتم پچھلی دفعہ میرا روپیہ جیت گئے تھے مگر خدا نے مجھے اور دے دیا۔''

''اگر خدا ہی نے تمہیں دیا ہے تو ہم اس کا ایک بار پھر فیصلہ کر لیتے ہیں۔پہلا شخص جو ہمیں ملے وہ ہمارا منصف ہوگا۔شرط کا ہارنے والا دوسرے کا روپیہ لے لے گا مگر اسے اپنا داہنا ہاتھ بھی کٹوانا پڑے گا۔''

ناؤم نے منظور کر لیا۔

راستے میں انہیں پھر وہی شیطان ملا جس نے وہی جواب دیا چنانچہ ایفان نے اپنا روپیہ باؤم کو دے دیا اور اُس کا داہنا ہاتھ کاٹ کر اپنے گھر چل دیا۔

ناؤم بہت عرصے تک سوچتا رہا کہ میں بغیر داہنے ہاتھ کے کیونکر کام کر سکوں گا۔ مجھے روٹی کون کھلائے گا؟ مگر خدا رحیم ہے چنانچہ وہ دریا کے کنارے جا کر ایک کشتی میں لیٹ گیا۔

آدھی رات کے قریب بہت سے شیطان کشتی پر جمع ہوئے اور ایک دوسرے سے اپنی کارستانیاں بیان کرنے لگے۔

ایک شیطان نے کہا''میں نے دو کسانوں کو آپس میں لڑا دیا اور مدد اُس کی کی جو غلطی پر تھا اور جو راستی پر تھا اُس کا داہنا ہاتھ کٹوا دیا''۔

دوسرے نے کہا''یہ کون سی بڑی بات ہے۔اگر وہ اپنے ہاتھ کو شبنم پر تین دفعہ پھیرے تو اُس کا ہاتھ فوراً اُگ سکتا ہے۔''

اس کے بعد تیسرا ڈینگ مارنے لگا''میں نے ایک امیر آدمی کی لڑکی کا خون چوس کر اُسے ادھ موا کر دیا ہے۔اب وہ بستر پر ہل تک نہیں سکتی۔''

''یہ کون سا بڑا کام ہے اگر کوئی شخص اس لڑکی کو اچھا کرنا چاہے تو اس بوٹی کو جو ساحل کے پاس اُگ رہی ہے اُبال کر اُسے پلا دے اور وہ بالکل تندرست ہو جائے گی''یہ کہتے ہوئے ایک شیطان نے ساحل کے پاس ایک بوٹی کی طرف اشارہ کیا۔

پانچویں شیطان نے بیان کیا''ایک تالاب کے ساتھ ایک کسان نے چکی لگا رکھی ہے اور وہ عرصے سے کوشش کر رہا ہے کہ وہ چلے مگر جب کبھی وہ پانی کا بہاؤ اُس طرف چھوڑتا ہے؟ میں بند میں سوراخ کر دیتا ہوں۔''

چھٹے شیطان نے کہا ''یہ کسان کس قدر بے وقوف ہے۔ اُسے چاہیے تھا کہ بند کے ساتھ بہت سے تنکے اکھٹے کر کے لگا دیتا۔ بتاؤ پھر تمہاری محنت کدھر جاتی ؟''

ناؤم نے شیطانوں کی باتیں بہت غور سے سن لی تھیں۔ چنانچہ دوسرے دن ہی اپنا ہاتھ اُگا لیا۔ کسان کی چکی درست کر دی اور امیر آدمی کی لڑکی کو تندرست کر دیا۔

امیر آدمی اور کسان نے اُس کے کام سے خوش ہو کر اُسے بہت سا انعام دیا۔ اب وہ بڑی اچھی طرح زندگی بسر کرنے لگا۔

ایک روز اُسے اپنا پرانا ساتھی ملا جو اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا اور بولا ''تم اس قدر امیر کس طرح بن گئے اور یہ ہاتھ دوبارہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟

ناؤم نے شروع سے اخیر تک تمام واقعہ بیان کر دیا اور اس سے کوئی بات چھپا کر نہ رکھی۔ ایفان نے ناؤم کی گفتگو کو غور سے سنا اور خیال کیا ''ہاہا! میں بھی یہی کروں گا اور اس سے بڑھ کر امیر ہو جاؤں گا۔''

چنانچہ وہ اُسی وقت دریا کی طرف گیا اور اُسی کشتی میں ساحل کے پاس لیٹ گیا۔ نصف شب کے قریب تمام شیطان جمع ہوئے اور آپس میں کہنے لگے۔

''بھائیو! کوئی شخص ضرور چھپ کر ہماری باتیں سنتا رہا ہے کیونکہ کسان کا ہاتھ اُگ آیا ہے۔ لڑکی اچھی ہو گئی ہے اور چکی چل رہی ہے''۔

چنانچہ وہ کشتی کی طرف لپکے اور ایفان کے پرزے اڑا ڈالے۔

علاج

مدت ہوئی ہے کہ ایک بادشاہت میں ایک قلی رہتا تھا۔ اُس کی بیوی جو تھی، اُسے کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا اور وہ گھر میں صرف اُن لوگوں کو آنے کی اجازت دیا کرتی تھی جو اُسے کوئی نہ کوئی کہانی سنائیں۔ خیر! اب یہ ظاہر ہے کہ اُس کے خاوند کو یہ بات بہت ناگوار تھی چنانچہ وہ سوچنے لگا کہ اس کی یہ تکلیف دہ عادت کس طرح دور کروں؟

اچھا! تو سردیوں کے موسم میں ایک دفعہ جب رات بہت گزر چکی تھی۔ ایک بوڑھا آدمی سردی سے ٹھٹھرتا ہوا اُن کے گھر آیا اور وہاں رات بسر کرنا چاہی۔ خاوند دوڑتا ہوا گیا اور اس بوڑھے آدمی سے پوچھنے لگا۔ ''کیا تم کہانیاں سنا سکتے ہو؟''

جب بوڑھے کسان نے دیکھا کہ سوائے ہاں کرنے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے تو خون منجمد کر

دینے والی سردی کے خوف سے کہنے لگا۔ ''جی ہاں''۔

''مگر کہانیوں کا ذخیرہ ختم نہیں ہونا چاہیے''۔

''میں تمام رات سناتا رہوں گا، صاحب!''

''خوب! تو آ جاؤ اندر''

چنانچہ وہ مہمان کو گھر میں لے آیا اور اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ ''دیکھو میری جان اس بوڑھے آدمی نے تمام رات کہانیاں سنانے کا وعدہ کیا ہے مگر شرط یہ ہے کہ تم کہانی کے دوران میں مخل نہ ہونا۔''

بوڑھے مہمان نے کہا ''جی ہاں اگر آپ کہانی کے دوران میں کچھ بھی بولیں گی تو میرا منہ بند سمجھیے۔''

چنانچہ وہ کھانا کھا کر اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے اور بوڑھے کسان نے کہانی سنانا شروع کی۔

''ایک اُلو باغ کا چکر کاٹ کر کنویں کی منڈیر پر پانی پینے کے لیے بیٹھا''

''ایک اُلو باغ کا چکر کاٹ کر کنویں کی منڈیر پر پانی پینے کے لیے بیٹھا''

''ایک اُلو باغ کا چکر کاٹ کر کنویں کی منڈیر پر پانی پینے کے لیے بیٹھا''

''ایک اُلو باغ کا چکر کاٹ کر کنویں کی منڈیر پر پانی پینے کے لیے بیٹھا''

اور وہ اسی جملے کو بار بار دہراتا رہا:

''ایک اُلو باغ کا چکر کاٹ کر کنویں کی منڈیر پر پانی پینے کے لیے بیٹھا''۔

قلی کی بیوی بہت عرصے تک یہ سنتی رہی آخر کار تنگ آ کر کہنے لگی ''یہ کیسی کہانی ہے۔ تم تو گردان کیے جا رہے ہو؟''

''مگر آپ مخل کیوں ہوئیں۔ میں نے جو آپ سے عرض کی تھی کہ آپ کو کہانی کے دوران میں نہیں بولنا ہوگا۔ یہ تو ابھی کہانی کی تمہید تھی''۔ جب خاوند نے یہ سنا تو اُسے ایک موقع ہاتھ آ گیا اور بستر پر سے اُٹھ کر اپنی بیوی کو پیٹنا شروع کر دیا ''تمہیں جو کہا گیا تھا کہ مخل نہ ہونا —— اُس بیچارے کو کہانی ہی ختم نہیں کرنے دی''۔

اس مار پیٹ کے بعد اس عورت نے کہانی سننے کا خبط ترک کر دیا۔

مسحور شاہزادہ

کسی ملک میں ایک سوداگر رہتا تھا، جس کی تین بیٹیاں تھیں۔ ایک دفعہ سوداگر کو دوسرے ملک میں مال خریدنے کے لیے جانا پڑا تو اُس نے اپنی لڑکیوں سے پوچھا، ''میں تمہارے لیے کیا تحفہ لاؤں''

بڑی لڑکی نے ایک نئے کوٹ کے لیے فرمائش کی، منجھلی نے بھی کوٹ ہی کو پسند کیا مگر چھوٹی نے کاغذ کا ٹکڑا اُٹھا کر اُس پر ایک پھول بنا دیا اور کہا، "ابا میرے لیے اس طرح کا پھول لانا۔"

چنانچہ سوداگر اپنے سفر پر چلا گیا اور بہت عرصے تک مختلف ممالک میں گھومتا رہا مگر اسے اُس قسم کا پھول نظر نہ آیا۔ جب وہ گھر کی طرف لوٹا تو اسے راستے میں ایک باغ نظر آیا جس کے اندر ایک بڑی عالیشان عمارت بنی ہوئی تھی۔ وہ باغ کے اندر چہل قدمی کی خاطر چلا گیا۔ باغ مختلف قسم کے پھولوں اور درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ جا بجا غنچے چٹک رہے تھے۔ ہر پھول خوبصورتی اور حسن میں دوسرے سے بڑھا ہوا تھا۔ اچانک اُسے ایک ٹہنی پر وہی پھول نظر آیا جس کی اسے تلاش تھی اُس نے دل میں خیال کیا "یہاں باغ میں کوئی رکھوالا تو ہے نہیں اس لیے میں بے خوف وخطر پھول توڑ کر اپنی پیاری لڑکی کے لیے لے جا سکتا ہوں"۔

چنانچہ وہ ٹہنی کی طرف بڑھا اور پھول توڑ لیا۔ پھول کا توڑنا تھا کہ یک لخت آندھی چلنا شروع ہوگئی، رعد گرجنے لگا، طوفان سا برپا ہو گیا اور چند لمحے بعد تین سروں والا سانپ نمودار ہوا اور بلند آواز میں کہنے لگا۔

"تم نے میرے باغ میں ایسی حرکت کی کیونکر جرات کی؟ —— تم نے اس پھول کو کیوں توڑا ہے؟"

سوداگر تھر تھر کانپنے لگا اور سانپ کے پیروں پر گر کر معافی مانگنے لگا۔

اس پر سانپ کو رحم آ گیا اور بولا "بہت اچھا۔ میں تمہیں معافی دے سکتا ہوں، مگر صرف ایک شرط پر، وہ یہ کہ گھر جاتے ہی جو شخص تمہیں پہلے ملے اسے میرے حوالے کر دینا اور اگر تم نے دھوکا دیا تو خیال رہے کہ میرے انتقام سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ میں تمہیں دنیا کے ہر کونے میں ڈھونڈ لوں گا۔"

سوداگر نے یہ شرط منظور کر لی اور گھر کی طرف چل پڑا۔

سب سے پہلے اس نے اپنی چھوٹی لڑکی کو کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے دیکھا، جو اُسے دیکھ کر دوڑتی ہوئی آئی اور اُس سے لپٹ گئی۔ مگر سوداگر بجائے خوش ہونے کے رونے لگا۔

یہ دیکھ کر اس کی لڑکی نے دریافت کیا۔ "ابا! کیا سبب ہے جو تم رو رہے ہو؟"

جواب میں سوداگر نے وہ پھول پیش کرتے ہوئے تمام واقعہ بیان کر دیا۔

یہ سن کر لڑکی نے اپنے باپ کو تسلی دی "ابا کسی قسم کی فکر نہ کرو، شاید خدا کو اسی میں بہتری منظور

ہو ـــــ مجھے اس سانپ کے پاس لے چلو۔''

چنانچہ سوداگر اپنی لڑکی کو اُس باغ میں چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ لڑکی اُس باغ والے عالیشان محل میں داخل ہوئی اور دیر تک اُس کے مختلف کمروں میں گھومتی رہی۔ کمرے زر و جواہر سے بھرے ہوئے تھے مگر کوئی متنفس موجود نہ تھا۔

وقت گزرتا گیا۔

اب جو اُس حسین دوشیزہ کو بھوک محسوس ہوئی تو وہ سوچنے لگی۔ ''کاش مجھے کچھ بھی کھانے کے لیے مل جائے!''

یہ خیال کرنا ہی تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک میز نمودار ہوئی جس پر انواع واقسام کے لذیذ کھانے چُنے ہوئے تھے۔ سب لوازم موجود تھے اگر کمی تھی تو صرف چڑیا کے دودھ کی۔

لڑکی نے جی بھر کے کھانا کھایا اور جب ہاتھ اٹھایا تو میز مع طشتریوں کے غائب تھی۔

جب تاریکی چھا گئی تو سوداگر کی لڑکی سونے کے لیے خواب گاہ میں چلی گئی۔ وہ بستر پر لیٹنا ہی چاہتی تھی کہ ایک آندھی کے ساتھ تین سروں والا سانپ ظاہر ہوا اور اس سے کہنے لگا۔

''پیاری حسینہ میرا بستر اس دروازے سے باہر لگا دو!''

لڑکی نے سانپ کا پلنگ دروازے کے باہر بچھا دیا اور خود دوسرے بستر پر لیٹ گئی۔

جب صبح کو بیدار ہوئی تو حسبِ سابق گھر میں کوئی ذی روح موجود نہ تھا مگر جو چیز بھی اس نے طلب کی ایک پراسرار طریق پر حاضر ہوگئی۔

شام کے وقت وہی سانپ اُس کے پاس پرواز کرتا ہوا آیا اور اس سے کہنے لگا۔

''پیاری حسینہ میرا بستر اپنے پلنگ کے ساتھ بچھا دو!''

لڑکی نے سانپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنا پلنگ اس کے بستر کے ساتھ بچھا دیا۔ رات گزر گئی اور صبح ہوئی تو حسبِ معمول گھر ویسا ہی سنسان تھا۔

شام ہوتے ہی سانپ پھر تیسری بار نمودار ہوا اور اس سے کہنے لگا:

''پیاری حسینہ۔ اب میں تمہارے ساتھ لیٹوں گا۔''

لڑکی پہلے پہل تو ایک سانپ کے ساتھ لیٹنے سے بہت خوف زدہ ہوئی مگر قہر درویش بر جان درویش، جی کڑا کر کے اس کے ساتھ سو ہی گئی۔

صبح بیدار ہوتے وقت سانپ نے لڑکی سے کہا ''اگر تم یہاں سے اکتا گئی ہو تو تمہیں اجازت ہے کہ ایک دن کے لئے اپنے باپ سے مل آؤ مگر خیال رہے دیر نہ کرنا۔ اگر تم نے ایک منٹ بھی زیادہ لگا دیا تو میں غم کے مارے مر جاؤں گا۔''

''نہیں آپ متفکر نہ ہوں! میں دیر نہ لگاؤں گی۔'' یہ کہہ کر سوداگر کی لڑکی وہاں سے رخصت ہوئی۔

محل کے دروازے پر ایک گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس میں سوار ہوئی اور چشم زدن میں اپنے گھر کے صحن میں پہنچ گئی۔

جب باپ نے اپنی لڑکی کو صحیح وسلامت واپس آتے دیکھا۔ تو بہت خوش ہوا اور اُس کی پیشانی کا بوسہ لے کر پوچھنے لگا۔ ''میری بچی! تم بچ کر کس طرح آ گئی ہو؟ —— معلوم ہوتا ہے خدا تم پر مہربان ہے!''

''ہاں ابا'' یہ کہتے ہوئے لڑکی نے اپنے باپ کو محل کے کمروں میں بکھری ہوئی دولت اور سانپ کی محبت کا تمام حال سنا دیا۔

جب اُس کی بہنوں نے یہ واقعہ سنا تو حسد کی آگ میں جل بھن کر رہ گئیں۔ دن لحظہ بہ لحظہ ڈھل رہا تھا۔ سوداگر کی لڑکی نے سانپ کے پاس واپس جانے کی تیاری شروع کر دی اور اپنی بہنوں سے کہا ''اب مجھے جانا چاہیے۔ کیونکہ مجھے دیر کرنے کا حکم نہیں ہے۔''

یہ سُن کر حاسد بہنوں نے آنکھوں پر پیاز مل کر آنسو بہانے شروع دیے اور کہنے لگیں ''عزیز بہن ابھی نہ جاؤ۔ کل چلی جانا۔''

یہ دیکھ کر چھوٹی لڑکی بہت متاثر ہوئی اور ایک دن کے لیے اور ٹھہر گئی۔ دوسرے روز وہ صبح ہی سب کو الوداع کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔

محل پہلے کی طرح بالکل خالی تھا مگر جب وہ باغ کے تالاب کے پاس پہنچی تو اُسے سانپ پانی پر تیرتا ہوا نظر آیا۔ اس نے فرقت کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لی تھی!

سوداگر کی لڑکی چلائی۔ ''آہ میرے اللہ! یہ میں نے کیا کر دیا!!'' وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے سانپ کو تالاب سے باہر نکالا اور اس کا سر چوم لیا۔

سر کا چومنا تھا کہ سانپ کے مردہ جسم میں حرکت ہوئی اور لمحہ بھر میں اس نے خوبصورت جوان کی صورت اختیار کر لی۔

نوجوان نے کہا، ''شکریہ۔ پیاری حسینہ۔ تم نے مجھے بچا لیا۔ میں سانپ نہیں ہوں بلکہ ایک مسحور

شاہزادہ۔"

وہ دونوں وہاں سے سوداگر کے پاس چلے گئے۔ ان کی شادی ہوگئی اور دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

☆☆☆☆☆

سوویٹ کا سند باد جہازی

[ماسکو کے ایک اڈیٹر کی جدت طرازی کی داستان]

ماہانہ ''ایڈونیچر'' کے عملہء ادارت میں کچھ عرصے سے یہ چیز بہت محسوس کی جارہی تھی کہ مارکیٹ میں ایسا آرٹ بالکل مفقود ہے جو نوجوان قاری کی توجہ اپنی طرف منعطف کرا سکے۔ مختلف قسم کے ادبی مضامین مہیا ہو سکتے تھے مگر اُن سے اصل مطلب پورا نہ ہوتا تھا۔ اگر صاف بیانی سے کام لیا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ ایسے مضامین کا مطالعہ نوجوان قاری پر اثر پذیر ہونے کی بجائے، اس کی رُوح کو تاریک بنا رہا تھا۔ اس کے برعکس ایڈیٹر ایسے لٹریچر کی تلاش میں تھا جو نوجوان قلوب پر گرفت حاصل کر لے۔

القصہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ فرمائش پر حسبِ خواہش ایک طویل کہانی لکھوائی جائے۔ یہ سن کر رسالے کا ایجنٹ فوراً ہی مولڈاونطسیف نامی ایک قابل مصنف کے پاس گیا اور اُسے یہ خبر کہہ سنائی۔ دوسرے روز مولڈاونطسیف اڈیٹر کے کمرے میں موجود تھا۔

''کتاب شاندار، دلچسپ مہمات سے پُر اور جدت کا پہلو لیے ـــــ مثال کے طور پر وہ سوویٹ سند باد جہازی کا سفرنامہ ہو ـــــ ایسی تصنیف جو قاری پر رات کی نیند حرام کر دے۔'' ایڈیٹر نے مصنف کو سمجھایا۔

''سند باد جہازی! ـــــ ایسی کتاب لکھی جا سکتی ہے''۔ مصنف نے مختصر سا جواب دیا۔

''معمولی سند باد جہازی نہیں بلکہ سوویٹ کا سند باد جہازی ہو۔''

''آپ مطمئن رہیں، وہ دمشق کا نہیں ہوگا!''

مصنف باتونی نہ تھا، اس لیے یہ فوراً کہا جا سکتا ہے کہ وہ عمل کا دلدادہ تھا۔

ناول مقررہ وقت تک لکھ لیا گیا۔ مولڈاونطسیف نے اصل کہانی سے علیحدگی اختیار نہ کی ——— سند باد جہازی ایک بار پھر پیدا ہو گیا۔

سوویٹ کے ایک نوجوان کا جہاز طوفان کی نذر ہو جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے لہریں اسے ایک غیر آباد جزیرے پر بہا لے جاتی ہیں۔ وہ اس جزیرے میں تن تنہا اور قدرتی عناصر کے مقابلے میں بالکل بے چارہ ہے۔ چاروں طرف خطرے ہیں۔ قدم قدم پر وحشی درندوں کا خوف دامن گیر ہے مگر سوویٹ کا سند باد جہازی، کمال ہمت و شجاعت کے ساتھ ان تمام ناقابل تسخیر آفات کا مقابلہ کرتا ہے۔

تین سال کے بعد اتفاقاً چند سیاح اُس جزیرے پر آ نکلتے ہیں اور اسے خوب تندرست پاتے ہیں۔ اس وقت اس نے تمام مشکلات پر قابو پا کر رہائش کیلیے ایک مکان بنا لیا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک چھوٹا سا باغیچہ لگا رکھا تھا۔

بندروں کی دُموں سے پہننے کے لیے لباس تیار کر لیے تھے اور صبح وقت پر بیدار ہونے کی خاطر ایک طوطا پال رکھا تھا، جسے یہ الفاظ رٹوا دیے گئے تھے:

''صبح بخیر! بستر کو چھوڑ دو! آؤ صبح کی ورزش شروع کریں۔''

''بہت خوب'' ایڈیٹر نے ناول کا خلاصہ سن کر کہا ''خصوصاً بندروں کی دُموں سے لباس تیار کرنے کی اختراع خوب رہی ہے ——— بہت خوب، مگر دیکھیے مجھے آپ کی کتاب کا بنیادی مقصد صاف طور پر سمجھ میں نہیں آیا۔''

''نیچر کے ساتھ انسان کی کشمکش ——— اور کیا؟'' مولڈاونطسیف نے حسب عادت اختصار پسندی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو درست ہے مگر کتاب میں کوئی سوویٹ خصوصیت نہیں ہے''۔

''طوطا جو ہے؟ ——— وہ ریڈیو کا نعم البدل سمجھا جانا چاہیے۔ ایک تجربہ کار ناشر الصوت''

طوطے والا خیال اچھی اختراع ہے اور باغ والا مضمون بھی اپنی جگہ پر بہت مناسب ہے مگر کتاب کے اوراق میں معاشری بیداری کا عنصر بالکل موجود نہیں۔ مثال کے طور پر مقامی ٹریڈ یونین کمیٹی کہاں

ہے؟''

یہ سن کر مولڈاونطسیف تلملا اُٹھا۔ جونہی اُسے یہ معلوم ہوا کہ شائد اس کی تصنیف قبول نہ کی جائے گی، اس کی اختصار پسندی و کم گوئی چشم زدن میں غائب ہوگئی۔ وہ اب مدلل بحث پر اُتر آیا۔

''مقامی ٹریڈ یونین کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے؟ کیا آپ بھول گئے ہیں کہ جزیرہ غیر آباد ہے؟''

''یقیناً آپ درست فرما رہے ہیں۔ جزیرہ واقعی غیر آباد ہے مگر ٹریڈ یونین کا وہاں پر ہونا لازم ہے۔ گو میں آرٹسٹ نہیں ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ میں نے کسی نہ کسی طرح ایسی کمیٹی وہاں پر ضرور بنا دی ہوتی جس سے سوویٹ حکومت کی خصوصیت ظاہر ہو سکے۔''

''مگر تمام کہانی کا پلاٹ صرف اس حقیقت پر استوار کیا گیا ہے کہ جزیرہ غیر آباد..........''

یہ کہتے ہوئے مولڈاونطسیف کی نگاہیں اتفاقاً ایڈیٹر کی آنکھوں سے دوچار ہوئیں۔ وہ گھبرا کر اپنے آخری الفاظ ادا نہ کر سکا۔ اس نے فوراً ہی اڈیٹر سے تصفیہ کرنے کا عزم کر لیا۔

آپ درست فرما رہے ہیں۔ اس نے اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ واقعی آپ کا فرمانا بہت حد تک درست ہے۔ میں حیران ہوں —— کہ مجھے یہ خیال کیوں نہ پیدا ہوا؟ —— جہاز تباہ ہونے پر دو شخص کنارے لگ جاتے ہیں، سندباد جہازی اور یونین کا صدر۔''

''ان میں اسی یونین کے دو ممبر اور شامل کر لیجیے''۔ اڈیٹر نے سرد مہری سے کہا۔

''بس!''

''نہیں، نہیں! —— دو ممبر اور ایک مستعد رضا کار عورت بھی جو ممبروں سے چندہ فراہم کرے گی۔''

''چندہ عورت کیوں اکٹھا کرے؟ اور بھلا وہ چندہ کہاں سے لے گی؟۔''

''سندباد جہازی سے۔''

''مگر یہ کام صدر بآسانی کر سکتا ہے جو بالکل بیکار ہوگا۔''

''کامریڈ مولڈاونطسیف! یہی مقام ہے جہاں پر آپ غلطی کر رہے ہیں۔ یونین کے صدر کو اپنا وقت اور دماغ ایسے حقیر کاموں پر صرف نہیں کرنا چاہیے۔ ہم سوویٹ اسی چیز کے خلاف تو جہاد کر رہے ہیں۔ اُس کے سپرد نگرانی اور انتظام ایسے ضروری امور ہونے چاہئیں۔''

''خیر، تو پھر وہ عورت ہی سہی'' مصنف نے بے چارگی سے کہا۔ ''یہ واقعی اچھا خیال ہے —— وہ

صدر یا سند باد جہازی سے شادی کرلے گی۔ بہرحال اس طرح کتاب خاصی دلچسپ ہوجائے گی''۔

شادی وادی کے معاملے کو چھوڑیے۔ ہمیں بازاری اور فضول عشقیہ لٹریچر درکار نہیں ہے۔ عورت کو صرف چندوں کی فراہمی ہی کے لیے رہنے دیجیے۔ جو وصول شدہ رقوم کو ایسے صندوقچے میں محفوظ رکھا کرے گی جسے آگ نہ لگ سکے''۔

یہ سُن کر مولڈاونطسیف غصے میں اپنی کرسی پر پیچ وتاب کھانے لگا۔

''معاف فرمایئے، کسی غیر آباد جزیرے میں ایسا صندوقچہ کہاں سے دستیاب ہوسکتا ہے؟''

اڈیٹر نے ایک لمحہ غور کرنے کے بعد کہا۔

''ٹھہریئے، ٹھہریئے، کتاب کے پہلے باب میں ایک بہت مناسب جگہ موجود ہے۔ سند باد جہازی اور یونین کے ممبروں کے علاوہ، لہریں جزیرے کے ساحل پر مختلف اشیاء بہا لے آتی ہیں..............''

''مثال کے طور پر ایک کلہاڑی، بندوق، شراب کا پیپا اور ایک عدد بوتل عرق 'مصفّی خون' کی............ ''مصنف نے سنجیدگی سے ان اشیاء کا نام گنتے ہوئے کہا۔

''شراب کا پیپا کاٹ دیجیے'' اڈیٹر فوراً بول اٹھا'' اور جناب اس خون صاف کرنے والی دوا کی ضرورت کیا ہے؟ اسے کون استعمال کرے گا؟ اس کی بجائے سیاہی کی دوات لکھ لیجیے گا ــــــ لیکن غیر آتش گیر صندوقچے کا ہونا ازبس ضروری ہے۔''

''وہ کیوں؟ ممبروں کے چندے کسی درخت کے کھوکھلے تنے میں بحفاظت رکھے جاسکتے ہیں، آخر کون چرا لے گا انہیں؟''

''یہ بھی ایک ہی کہی حضرت آپ نے! سند باد جہازی کو بھول گئے آپ؟ یونین کے صدر کو آپ نے نظر انداز ہی کردیا۔ اس کے علاوہ شاپ کیشن بھی تو وہیں موجود ہوگا۔''

''کیا شاپ کمیشن کو بھی لہریں بہا کر لے آئی تھیں۔'' مولڈاونطسیف نے کمزور آواز میں دریافت کیا۔

''جی ہاں!''

کچھ عرصہ خاموشی طاری رہی۔

''شاید لہروں نے یونین کے اجلاس کے لیے ایک میز بھی جزیرے پر لا پھینکی تھی؟'' مصنف نے

طنزیہ کہا۔

''یق.......... ی.........نا! تصنیف کے لیے مناسب ماحول کا پیدا کرنا ضروری ہے۔ خیر! اب یہ چیزیں موجود ہوگئیں ـــــ میز، پانی کی صراحی، چھوٹی سی گھنٹی اور میز پوش۔ آپ لہر کے ذریعے جس قسم کا میز پوش چاہیں جزیرے کے ساحل پر پھنکوا سکتے ہیں۔ وہ سرخ رنگ کا ہو یا سبز رنگ کا! میں آپ کی صناعانہ تخلیق میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ مگر.......... اوّلین چیز یہ ہونی چاہیے کہ مزدوروں کے گروہوں کی مدد کی جاسکے۔''

''لہریں مزدوروں کے گروہ پیدا نہیں کرسکتیں،'' مولڈاونطسیف نے خودسری کے انداز میں کہا۔ ''ذرا خیال تو کیجیے اگر ایک لہر دفعتاً ساحل پر ہزاروں نفوس دے مارے، تو کیا یہ مضحکہ خیز نہ ہوگا۔''

''ساتھ ساتھ ہی اگر خوشگوار مزاح کی چاشنی بھی موجود رہے تو کیا مضائقہ ہے۔'' اڈیٹر نے جواب دیا۔

''نہیں صاحب! لہر یہ کام نہیں کرسکتی۔''

''آپ لہروں کا ذکر بار بار کیوں کر رہے ہیں؟'' اڈیٹر نے دفعتاً متعجب ہو کر دریافت کیا۔

''تو پھر بتائیے یہ مزدوروں کے گروہ کہاں سے آگریں گے؟ جزیرہ تو غیر آباد ہے۔''

''آپ سے یہ کس نے کہا ہے کہ جزیرہ غیر آباد ہے؟ آپ مجھے خواہ مخواہ چکر میں ڈال رہے ہیں۔ معاملہ بالکل صاف ہے۔ ایک جزیرہ یا اس سے بہتر ایک دارالخلافہ ہے جہاں مختلف نوعیت کے دلچسپ اور تازہ بہ تازہ حادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ٹریڈ یونین اپنا کام بدستور کر رہی ہے۔ مگر اتفاقاً اُن کی حکمتِ عملی ناقابلِ اعتماد ہو جاتی ہے۔ اس پر ایک ذہین مزدور عورت اُس کے نقائص ظاہر کرتی ہے۔ مزدوروں کے گروہ اس کی ہر طرح امداد کرتے ہیں ـــــ صدر سخت مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے ـــــ آخری ابواب میں آپ ایک اجلاس منعقد کرا سکتے ہیں جو صناعانہ نقطۂ نظر سے خاص طور پر موثر ثابت ہوگا ـــــ بس صرف اتنا قصہ ہے۔''

''اور وہ سندباد جہازی؟''

''ہاں، ہاں، ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے یاد دلا دیا۔ دراصل میں سندباد جہازی سے گھبراتا ہوں۔ اس کا نام ہی سرے سے کاٹ دیجیے ـــــ کیسا مجہول اور مہمل سا کردار ہے!''

''اب میں آپ کا مطلب بخوبی سمجھ گیا ہوں۔'' مولڈاونطسیف نے کمزور آواز میں کہا ''ایسی کہانی

کل تک تیار ہو جائے گی۔''

''خدا آپ کو کامیابی نصیب کرے —— ہاں، دیکھیے نا کتاب کے ابتدائی بابوں میں آپ نے جہاز کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ میرے خیال میں اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اس حادثے کے بغیر ہی کام چل سکتا ہے۔ اس صورت میں ناول زیادہ دلچسپ رہے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ —— اچھا خدا حافظ!''

تنہائی میں اڈیٹر نے مسکراتے ہوئے خیال کیا۔

''شکر ہے، آخر کار اب ''ایڈونچر'' کے لیے ایسی کہانی لکھی جائے گی جو بیک وقت دلچسپ اور آرٹ کے لحاظ سے کامل ہوگی۔''

☆☆☆☆☆

کتّا

اگر مافوق العادت واقعات کے امکانات اور حقیقی زندگی میں ان کے تاثرات کو تسلیم کرلیا جائے تو کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ شعور کس مرض کی دوا ہے سپیٹیخ نے اپنے پیٹ پر دونوں بازوؤں کو جوڑتے ہوئے کہا۔

سپیٹیخ سول کونسلر کے عہدے پر فائز تھا اپنی زوردار گفتگو اور بھاری آواز کی وجہ سے وہ ہر شخص کی نظروں میں ایک قابل احترام ہستی تسلیم کی جاتی تھی۔

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' سکوروچ نے رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔

کیزوخ نے تائید کی ''اسے کوئی غلط ثابت نہیں کرسکتا۔''

''میں بھی اس سے متفق ہوں'' مالک مکان کمرے کے کونے سے باآواز بلند پکارا۔

''درست ہے! ـــــ مگر مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں آپ سے متفق نہیں ہوسکتا جب کہ میرے ساتھ اسی قسم کا ایک مافوق الفطرت واقعہ پیش آچکا ہے۔'' یہ الفاظ ایک متوسط قد اور درمیانہ عمر کے آدمی نے کہے جو ابھی تک انگیٹھی کے عقب میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس پر کمرے میں موجود لوگوں کی نگاہیں حیرت واستعجاب میں اس کی طرف اٹھیں ـــــ بعد ازاں خاموشی چھا گئی۔

یہ شخص موضع کالوگا کا ایک تنگ حال زمیندار تھا، جسے پیٹرز برگ آئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ گزشتہ ایام میں وہ کسی رسالے میں نوکر بھی رہ چکا تھا اور قمار بازی میں بہت سا روپیہ ہار دینے کے بعد ملازمت سے مستعفیٰ ہو کر یہاں اقامت پذیر ہوگیا تھا ـــــ اقتصادی اصلاحات نے اس کی آمدنی بہت کم کردی تھی۔ اب وہ یہاں صرف اس غرض سے آیا تھا کہ اپنی رہائش کے لیے کوئی اچھی جگہ تلاش کرے۔ وہ نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور نہ اس کا حلقہ احباب وسیع تھا۔ مگر تاہم اسے اپنے ایک پرانے رفیق پر

اعتبار ضرور تھا، جوان دنوں کسی نا قابل بیان وجہ سے ایک بلند شخصیت کا مالک بن بیٹھا تھا۔

اس کے علاوہ وہ قسمت کا بہت قائل تھا—— چنانچہ قسمت ہی نے اس کا ساتھ دیا اور شہر میں آنے کے تھوڑے عرصے بعد ہی وہ حکومت کے ذخیرہ خانے کا افسر مقرر ہو گیا—— یہ منصب نفع بخش ہونے کے علاوہ باعزت بھی تھا جس میں کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہ تھی۔

ذخیرہ خانوں کا وجود بذات خود ایک سوال تھا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسی شخص کو بھی اچھی طرح معلوم نہ تھا کہ ان میں کون سا ذخیرہ بھرنا چاہیے —— لیکن بایں ہمہ یہ حکومت کے مفاد کیلیے ایجاد کیے گئے تھے۔

''ہاں!—— تو کیا جناب آپ فی الواقع اس امر کے مدعی ہیں کہ آپ سے کوئی مافوق العادت واقعہ پیش آ چکا ہے۔ یعنی اس قسم کا واقعہ، جو قوانین فطرت کے خلاف ہو——

''جی ہاں اسی نوعیت کا واقعہ'' انطون سپٹیخ پہلا شخص تھا جس نے مہر سکوت کو توڑا۔

اس شخص نے جسے ''جناب'' سے مخاطب کیا گیا تھا جواب دیا—— اس کا نام پروفری کیپی تونخ تھا۔

''قوانین فطرت کے خلاف''! سپٹیخ نے غصے میں ان الفاظ کو دہراتے ہوئے کہا۔ بظاہر وہ اس جملے کو بہت پسند کرتا تھا۔

''بالکل ایسا ہی جیسا آپ فرما رہے ہیں''

''یہ تو بہت تعجب خیز ہے۔ حضرات! آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے'' یہ کہتے ہوئے انطون سپٹیخ نے اپنے چہرے سے انتہائی سنجیدگی ظاہر کرنے کی سعی کی مگر بے سود کی دراصل اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اسے زمیندار کی بات سخت ناگوار گزر رہی ہے۔

''کیا آپ اس واقعے کی تفصیل سنانے کی تکلیف گوارہ کر سکتے ہیں''؟

سپٹیخ پھر زمیندار سے مخاطب ہوا۔

''ہاں، ہاں، ضرور—— کیوں نہیں؟'' یہ کہتے ہوئے زمیندار آزادانہ انداز سے کمرے کے وسط میں ٹہلتا ہوا چلا گیا اور اپنی داستان سنانا شروع کی۔

شاید آپ اس امر سے واقف ہیں کہ موضع کوزنسکی میں میری کچھ غیر منقولہ جائداد ہے۔ گزشتہ ایام میں یہ جائداد میرے لیے ایک معقول آمدنی کا ذریعہ تھی۔ گو اب تلخ حقیقت ہے کہ ان دنوں اس سے

ایک پائی بھی وصول کرنا عبث خیال ہے ـــــ مگر میرے خیال میں ایسے سیاسیات اس وقت بالائے طاق ہی رکھنا چاہئیں ـــــ قصہ مختصر میں اس ضلع میں ایک قطعہ زمین کا مالک ہوں جو ایک باغ ،تالاب، رہائشی مکان اور چند جھونپڑیوں پر مشتمل ہے ـــــ یہ کونہ مجھ گنہگار انسان کے سر چھپانے کی جگہ ہے ـــــ میں کنوارا ہوں ـــــ ایک روز، یہ پچھے سال کا ذکر ہے، میں گھر کچھ دیر سے آیا۔ اس لیے کہ ایک ہمسایہ دوست کے ہاں تاش کھیلتا رہا تھا۔ میں نے کپڑے اتارے اور بستر پر دراز ہوتے ہی شمع کو گل کر دیا۔ میں ابھی بستر پر اچھی طرح لیٹنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھے چار پائی کے نیچے کوئی چیز ہلتی معلوم ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ کوئی چوہا ہوگا۔ مگر یہ خیال غلط تھا کیونکہ وہ چیز نہ صرف حرکت کر رہی تھی بلکہ زمین اور اپنے جسم کو کھرچ رہی تھی ـــــ آخر اس نے اپنے کان پٹ پٹائے ـــــ

اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہلنے والی چیز کتا ہے مگر حیرت تو یہ ہے کہ وہ کتا آ کہاں سے گیا؟ میں سخت متحیر تھا ـــــ میں نے کوئی کتا پال بھی تو نہیں رکھا تھا۔ ''شاید کوئی آوارہ کتا اندر گھس آیا ہے''۔ میں نے چار پائی پر پڑے پڑے دل میں خیال کیا پھر میں نے اپنے نوکر کو آواز دی۔ فلکا ہاتھ میں ایک شمع پکڑے اندر آیا۔

''فلکا! میرے بچے، یہ کیا بات ہے''۔ میں نے کہا ''کیا تم اسی طریق پر گھر کی رکھوالی کیا کرتے ہو ؟ایک کتا میری چار پائی کے نیچے پہروں سے نیند حرام کر رہا ہے۔''

''کتا!......... جناب کتا؟'' اس نے متعجب ہو کر کہا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں یہ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے مالک کو ایسی پریشانیوں سے حتی الوسع محفوظ رکھنے کی کوشش کرو۔''

فلکا نے چار پائی کے نیچے شمع کو اِدھر اُدھر پھیر کر دیکھا اور اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد کہا ''یہاں تو کوئی کتا وتا نہیں ہے''۔

میں نے بھی جھک کر چار پائی کے نیچے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کتا واقعی وہاں سے غائب تھا ''تعجب ہے'' میں نے دل میں خیال کیا۔ جب میں نے فلکا کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔

''دانت کیوں نکال رہا ہے، جس وقت تو نے اندر آنے کے لیے دروازاہ کھولا ہوگا تو وہ جھٹ سے باہر بھاگ گیا ہوگا ـــــ تم سخت پاجی ہو ـــ نالائق کہیں کے! تم گھر کی اچھی طرح نگہبانی کیوں نہیں کرتے ہو۔ یہ مت خیال کرو کہ میں اس وقت شراب پیے ہوئے ہوں یا مخبوط الحواس ہو رہا ہوں۔ میں

نے اسے کمرے سے، بغیر کسی قسم کا جواب سنے باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر کے سو گیا —— باقی شب آرام سے گزری۔

لیکن اگلی رات پھر وہی گڑبڑ ہوئی۔ جوں ہی میں نے شمع کو گل کیا اس نے زمین کے ساتھ اپنا جسم رگڑنا اور کانوں کو پٹ پٹانا شروع کر دیا۔ میں نے فلکا کو بلایا۔ وہ آیا اور اس نے بستر کے نیچے اچھی طرح جھانک جھانک کر دیکھا، مگر وہاں ایک چیونٹی تک موجود نہ تھی۔ اس پر میں نے مایوس ہو کر فلکا کو واپس بھیج دیا اور شمع گل کر کے پھر لیٹ گیا —— ابھی چند لمحات ہی گزرنے پائے ہوں گے کہ کتا پھر آ موجود ہوا.......... ''وہ'' فی الواقع کتا ہی تھا۔ اس لیے کہ اس کے سانس لینے کی آواز اور کانوں کی پٹ پٹا ہٹ سے نمایاں طور پر یہی ظاہر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ صاف طور پر سنائی دیتا تھا کہ وہ مکھیاں پکڑنے کی کوشش میں اپنے جبڑے ہلا رہا ہے۔

میں نے پھر فلکا کو آواز دی وہ بھاگا ہوا آیا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ ''اب بتاؤ! کیا تم کوئی آواز سن رہے ہو؟''

''جی ہاں'' فلکا نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ گو کمرہ بالکل اندھیرے میں تھا، مگر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ سخت خوف زدہ ہو گیا تھا۔

''بتاؤ۔ اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں''۔

''جناب یہ صریحاً جادو ہے''۔

''بے وقوف، چھوڑو، ان جادو کے —— خیالوں کو ——''

ہم دونوں نہایت سراسیمگی کی حالت میں ایک دوسرے سے ہم کلام ہو رہے تھے۔ ڈر کے مارے ہمارے جسم تاریکی میں اس طرح کانپ رہے تھے گویا ہم سخت بخار میں مبتلا ہیں۔ میں نے شمع کو پھر روشن کیا —— کمرے میں اور کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا —— صرف ہم دو انسانی تصویریں محو حیرت خوف کے مارے کاغذ کی مانند سپید ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے صبح تک شمع کو روشن رکھا اور حضرات! میں آپ کے روبرو حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ متواتر چھ ہفتے تک یہی واقعہ ہر روز پیش آتا رہا —— یہ جدا بات ہے کہ آپ اسے واقعہ تسلیم کریں یا نہ کریں۔ —— خیر کچھ عرصے کے بعد میں اس کا عادی ہو گیا اور ہر شب شمع گل کر کے سو جاتا۔ ''اگر وہ آتا ہے تو آنے دو۔ وہ مجھے کوئی دکھ تھوڑی پہنچاتا ہے۔'' میں نے اس خیال سے اپنے دل کو قوی کر لیا۔

''یہ تو واقعی ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ قوی دل ہیں''۔ پیٹیخ نے بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''جری سپاہی چہرے ہی سے پہچانا جاتا ہے۔''

''کم از کم میں آپ سے خائف تو نہیں ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے کپیی طونخ واقعی ایک لحظے کے لیے سپاہی کی مانند معلوم ہوا۔ پھر کچھ عرصے کے توقف کے بعد اس نے اپنی داستان کو شروع کر دیا۔

''لیکن آپ اس داستان کی بقایا تفصیل سنیے ——— مجھے ایک ہمسایہ ملنے کے لئے آیا۔ وہی دوست جس کے ساتھ میں اکثر تاش کھیلا کرتا تھا۔ ہم دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا اور دیر تک تاش کھیلتے رہے۔ وہ پچاس روبل کے قریب ہار گیا۔ رات زیادہ گزر چکی تھی اور وقت تھا کہ وہ گھر واپس چلا جائے۔ مگر میرے دل میں ایک عجیب ہی خیال تھا۔ چنانچہ میں نے اسے اپنے یہاں رہنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا۔'' آج شب یہیں ٹھہرو ——— شاید تم اپنی رقم جیت سکو''

ویلی وسلینخ نے ایک لحظہ غور کیا اور رات میرے یہاں ٹھہرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ میں نے اس کے لیے اپنے کمرے ہی میں سونے کے لیے بستر کا انتظام کر دیا۔ ہم دونوں اپنی اپنی چار پائیوں پر لیٹ گئے۔ کچھ عرصہ گپیں ہانکتے رہے اور صنف نازک کے متعلق گفتگو کرتے رہے ——— گفتگو جو صرف غیر شادی شدہ مردوں ہی کے لیے مناسب ہوتی ہے۔ اس کے بعد ویلی نے اپنے پاس رکھی ہوئی شمع کو بجھا دیا۔ وہ ابھی میری طرف پشت پھیر کر ''شب بخیر'' کہنے والا ہی تھا اور میں ابھی متوقع حادثے کی نوعیت کے متعلق غور ہی کر رہا تھا کہ وہی ''پیارا حیوان'' چار پائی کے نیچے خاموشی سے حرکت کرتا ہوا سنائی دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آج وہ چار پائی کے نیچے سے نکل کر اِدھر اُدھر گھوما۔ اپنے پنجوں سے فرش کو کریدا کانوں کو زور زور سے حرکت دی اور ایک کرسی کو جو ویلی کی چار پائی کے قریب پڑی ہوئی تھی دھکیلتا لے گیا۔

ویلی نے یہ شور سن کر ایسے ہی دریافت کیا'' پروفری مجھے معلوم نہ تھا کہ تم نے ایک کتا بھی پال رکھا ہے ——— یہ کس ذات سے ہے؟''

''میرے پاس تو کوئی کتا نہیں ہے اور نہ میں نے اپنی عمر میں کسی کو پالا ہے۔''

''تمہارے پاس نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے''

''یہ کیا ہے؟ شمع جلا کر دیکھ لو تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا۔''

''تو کیا یہ کتا نہیں ہے؟''

''نہیں''

یہ کہتے ہوئے ویلی بستر پر الٹا لیٹ گیا ''مذاق کو چھوڑو ایک طرف یار!''

''میں مذاق نہیں کر رہا۔''

اس کے بعد میں نے اسے بستر پر سے اٹھتے اور دیا سلائی کو روشن کرتے دیکھا۔ جب کہ وہ غیر مرئی کتا بدستور اپنی پسلیوں کو پنجوں سے کھرچ رہا تھا۔۔۔۔۔ تمام کمرہ روشن ہو گیا مگر یا مظہر العجائب، وہ بالکل غائب تھا۔

اب ویلی میری طرف تصویر حیرت بنا دیکھ رہا تھا اور میں اس کی طرف۔

''یہ کیا معاملہ ہے'' اس نے حیرت زدگی کی حالت میں کہا۔

''یہ وہ معاملہ ہے کہ اگر ایک طرف حکیم سقراط اور دوسری طرف فریڈرک اعظم اسے سلجھانے کی کوشش کریں تو ناکامیاب رہیں''۔ یہ کہہ چکنے کے بعد میں نے اسے تمام داستان من وعن سنا دی۔۔۔۔۔ وہ حیرت سے بستر پر اُچھل اُچھل پڑا۔ جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اس پر ہی ختم نہیں بلکہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بوٹ پہننے کی کوشش کرنے لگا مگر کانپتے ہاتھوں سے وہ یہ نہ کر سکا۔ وہ سخت خوف زدہ ہو گیا تھا۔

''گھوڑا منگواؤ۔۔۔۔۔ گھوڑا منگواؤ'' وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھہرانا چاہا مگر وہ نہ مانا۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور متواتر کہے جا رہا تھا۔ ''میں اب یہاں ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔۔۔۔۔ اس مکان میں ضرور سایہ کا اثر ہے۔۔۔۔۔ ہو نہ ہو یہ جگہ کسی بھوت کا مسکن ہے۔''

میں نے اسے تسلی دی اور اس کی چار پائی وہاں سے اٹھوا کر دوسرے کمرے میں بچھوا دی۔ اس کے علاوہ تمام رات شمعوں کو روشن رکھا۔ صبح ناشتے کے وقت جب کہ اس کا دماغی توازن قائم ہو کر اس کی پریشانی ایک حد تک رفع ہو چکی تھی، اس نے مجھے نصیحت کرنا شروع کی ''پروفری! دیکھو تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ نقل مکان کر جاؤ۔۔۔۔۔ شاید اس طرح یہ بلا خود بخود رفع ہو جائے۔''

کچھ دیر اور گفتگو کرنے کے بعد وہ مجھ سے رخصت ہوا، مگر رخصت ہونے سے پہلے وہ ایک سو روبل اور میرے پاس ہار گیا تھا، جس پر وہ دیر تک مجھ پر برستا رہا تھا کہ میں حساس نہیں ہوں اور ناشکر گزار ہوں۔ مگر حضرات وہ رقم جیت لینے میں میرا کیا قصور تھا۔۔۔۔۔ خیر میں نے اس کی نصیحت پر عمل کیا اور اپنے مکان کو چھوڑ کر شہر کے باہر ایک سرائے میں قیام شروع کر دیا، جس کا مالک ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔

اس شخص کے کنبے کے تمام افراد وفات پا چکے تھے۔اس لیے وہ قدرتی طور پر تنہائی میں رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔وہ تمبا کو سے سخت متنفر تھا اور کتوں سے تو اسے بہت ہی نفرت تھی۔یہی وجہ تھی کہ وہ کسی کتے کو خواہ وہ کسی مسافر ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو اپنی سرائے میں داخل نہ ہونے دیا کرتا تھا۔وہ اکثر اوقات کہا کرتا تھا"ہر رات آسمانی ملکہ میری سرائے کی دیوار پر ظاہر ہوتی ہے۔اس لیے میں کسی کتے کو اپنی ناپاک ناک کے ساتھ اپنے گھر میں دیکھنا نہیں چاہتا۔"—— یہ وہم بلا شک وشبہ کی تعلیم کی وجہ سے تھا! تاہم میرے خیال میں ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی تھوڑی بہت عقل، جتنی کا وہ مالک ہو، اسی پر قناعت کرے۔"

"مجھے تو آپ ایک بڑے فلسفی معلوم ہوتے ہیں"۔انطون سپیتخ نے دوبارہ بات کاٹتے ہوئے اسی طنز آمیز مسکراہٹ سے کہا۔

اس بار پروفری کے چہرے پر واقعی خفگی کے آثار نمودار ہو گئے اور اس نے اپنی موچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔"میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں فلسفہ میں کہاں تک دسترس رکھتا ہوں۔بہر حال اتنا مجھے ضرور بھروسہ ہے کہ میں آپ کو فلسفہ کا سبق ضرور پڑھا سکتا ہوں۔"

حاضرین کمرہ کی نگاہیں انطون کی طرف اٹھیں۔قیاس تھا کہ وہ اسے سخت ترین جواب دے گا۔ یا کم از کم ایک دفعہ قہر آلود نگاہ سے ضرور دیکھے گا۔

مگر سول کونسلر نے اپنے زہر خند کو خوشگوار مسکراہٹ میں تبدیل کر لیا اور یونہی ایک جمائی لے کر ٹانگ ہلا دی—— گویا بات کو یوں ہی ٹال دیا۔

"خیر میں نے اس سرائے میں رہنا شروع کر دیا۔"پروفری نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہا "مجھے رہائش کے لیے ایک چھوٹا سا کمرہ مل گیا، جو مالک سرائے کے کمرے سے ملحق تھا۔دراصل میں چاہتا بھی یہی تھا کہ مجھے رہنے کے لیے وہی جگہ ملے۔مگر وہ تکالیف جن کا مجھے شب بھر سامنا کرنا پڑا، خدا کی پناہ ہے! کمرہ کیا تھا اچھا خاصا تنور تھا۔ہر چہار طرف مکھیاں ہی مکھیاں اور وہ بھی کیسی جو جسم پر سے ہلنے کا نام نہ لیں—— اس کے علاوہ ایک کونے میں سے تیل کی سخت بو آ رہی تھی۔زنگ آلودہ آہنی چار پائی پر پروں سے بھرے ہوئے دو گدیلے تھے، جن کے ہلانے پر کوئی نہ کوئی پسّو ضرور شکل دکھا دیتا تھا۔

میں نے چائے کی ان گنت پیالیاں پی رکھی تھیں۔طبیعت سخت مکدر ہو رہی تھی اور اس پر کمرے کی فضا اس قدر ناخوشگوار تھی کہ معاذ اللہ قہر درویش بر جان درویش۔میں چار پائی پر لیٹ گیا مگر نیند ندارد —— دوسرے کمرے میں میرا میزبان سونے سے پہلے دعا مانگتے ہوئے حلق صاف کر رہا تھا اور کبھی

آہیں بھرتا تھا۔آخر کار وہ سو گیا——اس کے خراٹوں کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔

میں نے شمع کو بستر پر دراز ہوتے ہی بجھا دیا تھا۔مگر چھوٹے لیمپ کو روشن رکھا تھا۔میں اٹھا اور اسے بھی گل کر دیا۔میرا خیال تھا کہ شاید میرا روزمرہ کا ملاقاتی کتا روشنی کی موجوگی میں نہ آئے گا۔مگر جب لیمپ بجھانے پر ''وہ'' نمودار نہ ہوا تو میں نے خیال کیا'' آخاہ!'' میں سمجھا، وہ دوسروں کے گھروں میں نہیں آتا —— لیکن میں جوں ہی بستر پر لیٹنے لگا تو مجھے کوئی شے حرکت کرتی ہوئی سنائی دی۔بلاشک وشبہ وہی غیر مرئی حیوان زمین کو اپنے پنجوں سے کریدر ہا تھا اور اپنے کانوں کو زور زور سے ہلا رہا تھا——وہی روز والا واقعہ۔بہت خوب!میں بستر پر اس خیال سے خاموش لیٹا رہا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔اسی اثناء میں میں نے اپنے بوڑھے میزبان کو جاگتے ہوئے سنا۔

''جناب——اے جناب!یہ کیسا شور ہے''اس نے جاگتے ہی اپنے کمرے سے بلند آواز میں پوچھا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے پھر چلانا شروع کر دیا''یہ کیا معاملہ ہے۔ہیں!کیا وہ کتا ہے؟—— کتا—— آہ ناپاک حیوان!!''

''صاحب،آپ خواہ مخواہ وہاں سے چلا رہے ہیں۔ذرا خاموشی اختیار کریں۔یہاں پر ایسا واقعہ پیش آرہا ہے جو آپ کے سر کے بال کھڑے کر دے گا''۔

سرائے کا مالک اپنی چارپائی کو چھوڑ کر میرے کمرے میں ایک شمع ہاتھ میں لیے آیا۔اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔سر پر ایک سپید سی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔سپید ڈاڑھی چھاتی تک لٹک رہی تھی اور وہ ایک واسکٹ پہنے ہوئے تھا،جس پر تانبے کے بٹن ٹانکے ہوئے تھے۔اس ہیئت کذائی میں وہ لیمپ کی جانب بڑھا اور تین مرتبہ انگلیوں سے چھاتی پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے،اسے روشن کیا۔ پھر صلیب کا نشان بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بیٹھی ہوئی آواز میں کہا''اب بتاؤ کیا معاملہ ہے؟''

اس کے پوچھنے پر میں نے فوراً ہی تمام واقعہ من وعن بیان کر دیا۔اس نے میری داستان کو بڑی توجہ سے سنا مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ بولا صرف سر کو ہلا دیا اور میرے بستر پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ابھی تک اس کے لبوں پر مہر سکوت لگی ہوئی تھی۔وہ ایک عرصے تک اپنی چھاتی اور سر کے پچھلے حصہ کو کھجلاتا رہا۔مگر زبان بند رکھی۔آخر میں نے ہی اس سکوت کو توڑا اور اس سے کہا'' آپ ہی کچھ فرمائیں کیا یہ جادو ہے یا کوئی شیطانی حرکت؟''

''کیسا عجیب خیال ہے!''بوڑھے نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا''شیطانی حرکت؟ میاں

ایسے واقعات صرف تم ایسے تمبا کونوش ہی سے اپنے گھر میں پیش آسکتے ہیں —— یہاں رہ کر صرف تمہیں آسمانی ملائک کے نزول کا خیال کرنا چاہیے —— شیطانی حرکت!!؟''

''اگر یہ واقعہ بدارواح سے متعلق نہیں ہے تو پھر بتائیے یہ کیا ہے؟''۔

یہ سن کر بوڑھا سرائے دار خاموش ہو گیا اور اپنے سر کو کھجلانا شروع کر دیا۔ آخر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ بیلنیوف نامی قصبے میں جاؤ، وہاں ایک ایسا شخص ہے جو اس معاملے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر وہ تمہاری معاونت کے لیے آمادہ ہو گیا تو سمجھ لینا کہ تم بہت خوش نصیب ہو اور اگر اس نے اس گتھی کو سلجھانے سے انکار کر دیا تو یاد رکھو روئے زمین پر تمہیں کوئی شخص بھی ایسا نہیں مل سکتا جو تمہاری مدد کر سکے۔''

''مگر وہ شخص کہاں مل سکتا ہے؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔ ''میں تمہیں جانتا ہوں'' بوڑھے سرائے دار نے جواب دیا۔ ''مگر سوال ہے کہ یہ جادو یا اسی قسم کی اور بلا کیوں کر ہو سکتی ہے؟ دراصل یہ ایک اشارہ ہے جسے میری اور تمہاری عقل سمجھنے سے قاصر ہے —— خیر اب تم مسیح کی امان میں سو رہو اور شمع کو روشن رہنے دو۔ ہم صبح اس کے متعلق مزید گفتگو کریں گے —— صبح کے وقت عقل تیز ہوتی ہے۔''

دوسری صبح ہم نے گفتگو کی۔ وہ باتیں جو اس بوڑھے آدمی نے مجھ سے کیں یہ تھیں کہ بیلیوف پہنچنے پر میں سیدھا منڈی کا رُخ کروں اور داہنے ہاتھ کی دوسری دکان سے پرو ہورخ کا پتہ پوچھوں اور جب وہ شخص مل جائے تو اس کے ہاتھ میں کاغذ کا یہ پرزہ پکڑا دوں جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ ''مقدس باپ ،مقدس بیٹے اور مقدس بھوت کے نام کی خاطر ---- آمین! بخدمت سر جی پرہو رُخ پرو وشن —— اس آدمی پر اعتماد کیجیے گا —— از طرف فیڈو لی ایوانخ'' اور پھر ان سطور کے نیچے یہ لکھا تھا۔
''خدا کے لیے ترکاری ضرور بھیج دو۔''

میں نے بوڑھے آدمی کا شکریہ ادا کیا اور مزید بحث کیے بغیر گاڑی میں سوار ہو کر وہاں سے چل دیا۔ گو مجھے خیال تھا کہ میرا غیر مرئی ملاقاتی مجھے کچھ تکلیف نہیں پہنچاتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کی آمد بہت محیر العقول اور مافوق العادت طریق پر ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک انسان اور وہ بھی مجھ سے ایسا واقعہ پیش آنا کچھ درست نہیں تھا۔

''—— کیوں حضرات! آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

''تو کیا آپ واقعی بیلیوف تشریف لے گئے؟''

''جی ہاں سیدھا بیلیوف کی منڈی پہنچ کر میں نے پرد ہورخ کی بابت دریافت کیا۔'' کیا کوئی اس نام کا شخص یہاں موجود ہے۔''

''ہاں، ہاں، کیوں؟'' ایک دکان دار نے مجھے جواب دیا۔

''وہ کہاں رہتے ہیں؟''

''منڈی سے ملحقہ باغات کے پرلے حصے میں۔''

چنانچہ میں اس بتائے ہوئے مقام پر گیا اور اس کے مکان کا پتہ لگالیا ——— میں نے ایک شخص کو نیلے رنگ کا کوٹ اور پھٹی ہوئی ٹوپی اوڑھے دیکھا ——— وہ بظاہر ایک مزدور معلوم ہو رہا تھا ——— وہ میری طرف پشت کیے ترکاریوں کو الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

میں اس کے قریب گیا اور اس سے دریافت کیا'' کیا آپ ہی پرد ہورخ ہیں؟''

اس نے میری طرف منہ موڑا ——— میں سچ عرض کر رہا ہوں کہ آج تک میں نے ایسی کھب جانے والی آنکھیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا چہرہ سکڑ کر مٹھی کے برابر رہ گیا تھا۔ جس پر مخروطی ڈاڑھی اگی ہوئی تھی ——— وہ اپنی عمر کی کافی منزلیں طے کر چکا تھا۔

''ہاں میں ہی پرہورُخ ہوں۔ فرمایئے آپ کو کیا ضرورت پیش آئی ہے؟'' اس نے ترکاریوں کو اِدھر اُدھر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کے پاس اس غرض کے لیے حاضر ہوا ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے میں نے سرائے دار کا دیا ہوا کاغذ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

کاغذ پکڑ کر اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا'' آپ اندر تشریف لے آیئے میں چشمے کے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔''

چنانچہ ہم دونوں جھونپڑی کے اند چلے گئے ——— دراصل وہ مکان واقعی جھونپڑی نما تھا ——— جھونپڑی جو پرانی ہونے کی وجہ سے ایک طرف کو جھک رہی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی میز پر سے آہنی فریم کا چشمہ اٹھایا اور ناک پر چڑھا کر میرا دیا ہوا کاغذ پڑھا اور چشمے کے شیشوں میں سے میری طرف نگاہیں اٹھا کر کہا'' آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے؟''

''جی، ہاں'' میں نے مود بانہ جواب دیا۔

''اچھاتم اپنی کہانی سناؤ۔ہم غور سے سنیں گے''۔ یہ کہہ کراس نے اپنی جیب سے ایک رومال نکال کر اپنے زانوؤں پر پھلا دیا، جس میں جا بجا سوراخ ہو رہے تھے۔یہ کرتے ہوئے وہ میری طرف ایسے بارعب، پُر وقار انداز میں دیکھ رہا تھا گویا وہ بہت ہی بڑا آدمی ہے۔اس کے علاوہ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے بالکل نہ کہا، اور تو اور اس وقت میری طبیعت سخت پریشان ہو رہی تھی۔مجھ پر ایک سراسیمگی طاری تھی ——— دفعتاً مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری روح ٹخنوں کے رستے باہر نکل رہی ہے۔اس کی آنکھیں میرے جسم میں متواتر کھب رہی تھیں ——— اور یہ واقعہ ہے کہ اس کی آنکھوں کی تاب نا قابل برداشت تھی۔قصہ مختصر میں نے اپنی طبیعت پر قابو پا کر اپنی داستان من وعن بیان کر دی۔

وہ میری داستان کو خاموشی سے سنتا رہا۔تھوڑی دیر خاموش رہنے اور اپنے ہونٹوں کو چبانے کے بعد وہ ایک بارعب لہجے میں بولا۔'' تمہارا کیا نام ہے ——— تمہاری عمر؟ ——— تمہارے والدین کون تھے؟۔کیا تم شادی شدہ ہو یا کنوارے؟''ایک ہی سانس میں یہ سب کچھ پوچھ کر اس نے اپنے ہونٹوں کو پھر چبانا شروع کر دیا۔پھر اپنی انگلی کھڑی کی اور کہا۔''مقدس ہستیوں کا آداب بجالاؤ ——— سجدہ کرو۔''

میں زمین پر جھک گیا اور وہیں گڑ پڑا اور اُٹھنے کی بالکل جلدی نہ کی۔اس لیے کہ مجھے اس شخص سے اس قدر دہشت محسوس ہو رہی تھی کہ میں اس کا ہر حکم بسر و چشم بجا لانے کو تیار تھا ——— حضرات! آپ مسکرا رہے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں اس وقت کسی اور ہی حالت میں تھا ——— ''جناب اُٹھیے!''۔آخر اس نے مجھے سجدے سے اُٹھنے کے لیے کہا۔''میں تمہاری مدد کے لیے تیار ہوں ——— وہ غیر مرئی حیوان تمہاری فلاح کا کوشاں ہے۔ایک اشارہ ہے ——— سمجھ لو کہ کوئی مخلوق تمہاری بہبودی کے لیے دست بہ دعا ہے۔ابھی منڈی میں جاؤ اور ایک جواں سال کتا خرید کر ہر وقت اپنے پاس رکھو ——— اس غیر مرئی کتے کی آمد خود بخود بند ہو جائے گی اور تمہارا یہ کتا تمہارے لیے بہت مفید ثابت ہوگا''۔

یہ الفاظ سن کر میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔میں نے اس وقت محسوس کیا کہ دونوں جہاں کی نعمت مجھے مل گئی ہے۔میں آداب بجالا کر پرہورخ سے رخصت ہونا چاہتا تھا کہ مجھے دفعتاً خیال آیا کہ اس شخص کی ضرور کوئی نہ کوئی خدمت کرنی چاہیے۔چنانچہ میں نے اپنی جیب سے تین روبل کا ایک نوٹ نکالا اور اسے پیش کرنا چاہا۔مگر اس نے میرے ہاتھ کو جھٹک کر پرے کر دیا اور کہا۔''یہ رقم کسی گرجے میں دو

یا محتاجوں میں بانٹ دو میری خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔"

چنانچہ میں نے دوبارہ جھک کر اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور سیدھا منڈی کی طرف چل پڑا۔ اتفاق دیکھیے۔ جوں ہی میں وہاں پہنچا۔ مجھے ایک شخص رومال میں ایک ننھا سا کتا باندھے نظر پڑا، جو میری طرف چلا آرہا تھا۔

"ٹھہرو" میں نے اس آدمی سے کہا۔ "کیا تم اس کتے کو فروخت کرنا چاہتے ہو؟ —— کتنے میں فروخت کرو گے؟"

"دو روبل" اس نے اس سپید کتے کی قیمت بتاتے ہوئے کہا۔

"لو تین —— " اس پر اس شخص نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور غالباً یہی خیال کیا، میں اپنے حواس کھوئے بیٹھا ہوں۔ مگر میں نے جلدی سے نوٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیے اور کتے کو پکڑ کر اپنی بغل میں دبالیا اور وہاں سے تیز چلتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور شام کو اپنے گھر واپس پہنچ گیا۔ کتا تمام راستے میرے کوٹ کے اندر چھپا رہا۔ میں بار بار اسے "ننھے ٹریسر" کے نام سے پکارتا رہا تھا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے اس کے لیے تنکوں کا ایک بستر تیار کیا اور اسے دودھ پلانے کے بعد وہاں آرام سے لٹادیا اور آپ شمع گل کرنے کے بعد بستر پر دراز ہوگیا —— شمع بجھنے پر کمرے میں تاریکی چھا گئی۔

"اب آؤ —— اب شروع کرو۔ وہی گڑبڑ —— اب آؤ نا۔ میرے معزز ملاقاتی!" میں نے پکارا۔ مگر کسی قسم کی آواز نہ آئی —— کمرے میں مکمل سکوت طاری رہا۔ میں نے چڑا کر اپنے غیر مرئی ملاقاتی کو خدا معلوم کتنی گالیاں بھی دیں مگر وہ ظاہر نہ ہوا —— صرف میرا ننھا ٹریسر اپنے بستر پر خرخر کر رہا تھا۔

"فلکا —— فلکا —— ابے اندر آ بے وقوف —— اندر آ"۔ آخر میں نے اپنے نوکر کو آواز دی وہ بھاگا ہوا آیا۔ میں نے اس سے آتے ہی دریافت کیا۔ "کیوں اب کسی کتے کے چلنے کی آواز آرہی ہے؟"

"نہیں تو —— جناب مجھے تو کوئی آواز نہیں آرہی" اور یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا۔

"اور اب آیندہ تمہیں کوئی آواز نہ آئے گی —— یہ لو نصف روبل شراب کے لیے —— عیش کرو۔"

نصف روبل لے کر وہ بے وقوف میرے ہاتھ پر بوسہ دینے کے لیے جھکا۔ گویا میں کوئی ولی ہوں

——— حضرات یقین جانیے، اس وقت مجھے ایک اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ یہ کیا کم خوشی تھی کہ وہ بلا دفع ہو گئی تھی۔

"تو کیا اس داستان کا یہیں پر خاتمہ ہے"۔ انطون پیٹیخ نے اس دفعہ بغیر طنز کیے دریافت کیا۔

"یہ درست ہے کہ اس کتے کی آمد کا سلسلہ ہمیشہ کیلیے بند ہو گیا۔ مگر حضرات ابھی داستان کا دلچسپ حصہ تو باقی ہے——— اب میرا ٹریسر جوان ہو کر خوب صورت اور فرماں بردار شکاری کتا بن گیا تھا۔ لمبے کان جسم فربہ موٹی سی دم اور جسم پر گھنے بال تھے۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا تھا——— ہمارے قصبے میں شکار بہت کم ہاتھ لگتا ہے۔ بہر حال میں نے ایک بندوق خرید لی تاکہ وقتاً فوقتاً شکار ہوتا رہے۔ چنانچہ میں شکار کی تلاش میں اپنے ٹریسر کے ساتھ مضافات میں گھومتا رہتا۔ وہ بگلوں اور خرگوشوں کا تعاقب کرتا رہتا۔ مگر مجھ سے ہرگز جدا نہ ہوتا۔ جہاں کہیں میں جاتا وہ میرے ساتھ ہوتا۔ حتیٰ کہ غسل خانے میں بھی وہ میرے پاس ہی کھڑا رہا کرتا تھا۔ اس کی اس عادت کی وجہ سے ایک روز مجھے اپنی ہمسایہ عورت سے جھگڑنا بھی پڑا جو اسے اپنے کمرے میں داخل کرنے سے منکر تھی——— خیر!

ایک روز——— یہ موسم گرما کا ذکر ہے——— حضرات کیا بتاؤں۔ اس غضب کی گرمی پڑ رہی تھی۔ فضا دھوئیں سے معمور تھی معلوم یہی ہوتا تھا کہ زمین جل رہی ہے۔ سورج پگھلے ہوئے سیسے کی مانند چمک رہا تھا——— گرد و غبار کا حال تو کچھ پوچھیے ہی نہیں، ناک اور کان میں گرد ہی گرد جمی ہوئی تھی۔ تپش کا یہ حال تھا کہ لوگ کوؤں کی طرح منہ کھولے چل پھر رہے تھے۔ میں گھر بیٹھے بیٹھے اکتا گیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت گرمی ذرا کم ہو رہی تھی——— چنانچہ میں ایک عورت کو ملنے چلا گیا، جو میرے پڑوس ہی میں رہتی تھی——— یہ عورت ہمدرد ہونے کے علاوہ جواں سال خوب صورت و شکیل تھی۔ مگر اس کی طبیعت کچھ عجیب قسم کی واقع ہوئی تھی——— خیر میں اس کے ہاں پہنچا۔ اس وقت میرا گرمی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں پہنچتے ہی نمفوڈرا کوئی مفرح چیز پینے کے لیے پیش کرے گی۔ میں ابھی دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے ہی والا تھا کہ میرے کانوں میں بہت سے لڑکوں کے دوڑنے، چیخنے اور چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک بڑا بھورے رنگ کا حیوان میری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ وہ وحشی کتا تھا۔ جس کے جبڑے کھلے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے خون برس رہا تھا اور جسم پر تمام بال کھڑے ہو رہے تھے——— میں ابھی اچھی طرح سانس بھی نہ لے سکا تھا کہ وہ وحشی حیوان اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر میری چھاتی پر حملہ آور ہونے کی کوشش

کرنے لگا—— یہ ایک نازک ترین لمحہ تھا۔ خوف کے مارے میری زبان تالو سے چمٹ گئی تھی، اور بازو ہلائے نہ ہلتے تھے۔ میرے ہوش وحواس گم ہو رہے تھے۔ اگر مجھے کچھ نظر آ رہا تھا تو وہ کتے کے سپید اور نوکیلے دانت تھے، جو میری ناک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں مجھے ایک اور سیاہ رنگ کی چیز اپنی جانب لڑھکتی ہوئی نظر آئی—— یہ میرا ٹریسر تھا جو آتے ہی اس وحشی کتے کے گلے کے ساتھ چمٹ گیا۔ اس پر وہ بہت چیخا چلایا اور اپنے دانتوں کو ٹریسر کے جسم میں پیوست کرنے کی سعی کرتے ہوئے گر پڑا —— میں نے گھبراہٹ میں دروازہ کھولا اور ہال کے اندر بھاگ گیا—— میں اس وقت کیا کر رہا تھا —— یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ میں بند دروازے کے پیچھے کھڑا سن رہا تھا کہ باہر ان دونوں کتوں کے درمیان ایک خوفناک جنگ ہو رہی ہے۔ میں نے مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا۔ یہ شور سن کر نمفوڈرا پریشان بالوں کے ساتھ باہر دوڑ گئی۔

دفعتاً مجھے ایک غلغلہ سنائی دیا۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا کھولا اور جھانک کر دیکھا—— وہ خوفناک حیوان غائب تھا۔ بازار میں بہت سے لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ جیسے وہ تمام کے تمام پاگل ہوں۔

''وہ گاؤں کی طرف بھاگ گیا ہے۔ گاؤں کی طرف'' اتنے میں ایک کسان عورت نے سامنے والی کھڑکی سے اپنا سر نکالتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر میں بھی باہر نکل آیا۔

باہر نکلتے ہی میں نے ٹریسر کی جستجو میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی—— مجھے اپنا بچانے والا نظر آ گیا۔ وہ دور سے لڑکھڑاتا چلا آ رہا تھا۔ بے چارے کا تمام جسم خون میں لتھڑا ہوا تھا اور جابجا زخم لگے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے پاس کھڑے لوگوں سے دریافت کیا کہ معاملہ کیا تھا تو معلوم ہوا کہ وہ وحشی کتا دیوانہ ہے اور کاؤنٹ کی ملکیت ہے—— یہ کاؤنٹ ہمارا پڑوسی تھا جو قسم قسم کے خوفناک کتے پالا کرتا تھا—— لوگوں کی یہ باتیں سن کر میرا کلیجہ دہل گیا۔ ٹانگیں کانپنے لگ گئیں۔ میں بھاگا ہوا اندر گیا اور آئینے کی طرف بڑھا۔ اس خیال سے کہ شاید دیوانے کتے نے کہیں مجھے نہ کاٹ لیا ہو—— دراصل مجھے وہم ہو گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں بچ گیا تھا۔ میں ادھر آئینے میں اپنے زرد چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ادھر نمفوڈرا صوفے پر لیٹی مرغی کی طرح خوف کے مارے سہمی ہوئی تھی۔

چند منٹ کے توقف کے بعد جب اس نے ہوش سنبھالا تو مجھ سے فوراً ہی دریافت کیا۔ ''کیا تم زندہ ہو نا!''

''یہ ٹریسر تھا جس نے میری زندگی بچالی۔''

''بے چارہ ٹریسر کیسا وفادار جانور تھا ـــــ مر گیا ہو گا زخموں کی وجہ سے؟''

''نہیں نہیں۔ وہ زندہ ہے۔ صرف زخمی ہوا ہے۔''

''تو پھر اسے فوراً گولی سے ہلاک کر دینا چاہیے ـــــ فوراً''۔

وہ کیوں؟ ـــــ میں اس کا علاج کراؤں گا اور اُمید ہے وہ جلد تندرست ہو جائے گا۔''

اتنے میں ٹریسر نے باہر والے دروازے کے ساتھ اپنے پنجے رگڑنے شروع کر دیے میں دروازہ کھولنے کے لئے اٹھا کہ وہ چلائی ''دیکھنا کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا ـــــ یہ اب ہر ایک کو کاٹے گا۔''

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا زہر اتنی جلدی سرائت نہیں کرتا۔''

''تم غلط کہہ رہے ہو ـــــ وہ ابھی سے دیوانہ ہو گیا ہے! معلوم ہوتا ہے تم نے عقل سے چھٹی لے رکھی ہے۔''

''نمفوڈرا ـــــ ذرا تحمل اختیار کرو ـــــ تمہیں ـــــ''

میں ابھی اور کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر وہ دفعتاً گلا پھاڑ کر چلائی۔ ''ازراہ کرم اپنے کتے سمیت یہاں سے دور ہو جاؤ۔''

''میں چلا جاتا ہوں ـــــ مگر''

''نہیں ابھی اسی لمحے یہاں سے بھاگ جاؤ ـــــ اور خبر دار میری دہلیز پر پھر کبھی قدم نہ رکھنا ـــــ جاؤ تم اکیلے دیوانے بنو!''

''بہت اچھا ـــــ مگر گاڑی کا انتظام تو ہونا چاہیے۔ میں اس واقعے کے بعد پیدل جانے سے معذور ہوں۔''

''اسے گاڑی میں لے جاؤ'' اس نے بلند آواز میں اپنے نوکروں کو حکم دینا شروع کیا۔ ''گھوڑا، گاڑی جو مانگتا ہے دے دو۔ مگر یہ یہاں سے کسی طرح چلا جائے ـــــ اُف ـــــ اس کی آنکھیں! ـــــ اس کی آنکھیں کس قدر وحشت خیز ہیں''۔ یہ کہتی ہوئی وہ کمرے سے باہر بھاگ گئی اور راستے میں اپنی خادمہ کے منہ پر ایک طمانچہ بھی رسید کرتی گئی ـــــ دراصل اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔

'' ـــــ حضرات شاید آپ اس پر باور نہ کریں گے مگر یہ حقیقت ہے کہ اسی روز میں نے نمفوڈرا سے اپنے دوستانہ تعلقات منقطع کر لیے۔ میں پھر کبھی اس کے پاس نہ گیا ـــــ اس کے لیمیں اپنے

محافظ کتے ٹریسر کا تادم مرگ ممنون احسان رہوں گا۔‘‘

’’خیر —— میرے لیے گاڑی لائی گئی اور میں اور ٹریسر اس میں سوار ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے اس کے زخموں کو صاف کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ صبح ہوتے ہی اسے اس حکیم کے پاس لے جاؤں جو موضع ایفرموسکی میں سکونت پذیر تھا۔ یہ حکیم دراصل ایک بوڑھا کسان تھا جو کچھ پڑھ کر پانی پر پھونک دیا کرتا تھا۔ اکثر لوگوں کا ایمان تھا کہ وہ پانی تریاق کا حکم رکھتا تھا —— میں ابھی اس سفر کے متعلق کچھ سوچ رہا تھا کہ بالکل اندھیرا ہو گیا، چونکہ وہ سونے کا وقت تھا۔ اس لیے میں اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ ٹریسر میرے قریب زمین پر تنکوں کے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

شاید یہ صبح کی خونی لڑائی، تھکاوٹ، مکھیوں کے تنگ کرنے یا میرے خیالات کی وجہ تھی کہ میری آنکھوں کی نیند بالکل غائب ہو گئی۔ ہزار کوشش کی کہ ذرا کی ذرا دیر آنکھ لگ جائے، مگر بے سود —— میں وہ حالت بیان نہیں کر سکتا۔ جو اس وقت مجھ پر گزر رہی تھی —— میں نے کئی گھونٹ پانی کے پیے۔ کھڑکیاں کھول دیں اور ایک عرصے تک ستار پر کچھ بجاتا رہا —— مگر جی نیند کہاں، وہ تو کوسوں دور تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ کمرے کے باہر سونا چاہیے۔ چنانچہ میں تکیہ اور چادر وغیرہ لے کر باہر کی طرف چلا گیا اور گھاس پر بستر جما کر لیٹ گیا۔

مجھے باغ میں کس قدر راحت نصیب ہوئی —— الفاظ نہیں کہ میں اسے بیان کر سکوں —— رات پر سکون تھی، کبھی کبھی ہوا کا ایک جھونکا عورت کے ہاتھ کی طرح رخساروں سے چھو جاتا۔ فضا نہایت خوشگوار تھی گھاس سے عمدہ چائے ایسی خوشبو آ رہی تھی۔ سیب کے درختوں میں جھینگر اپنا راگ الاپ رہے تھے —— پھر اچانک کوئل کی کوک سنائی دی —— معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی بہت خوش ہے۔ آسمان شاندار نظر آ رہا تھا۔ ستارے پوری تاب میں چمک رہے تھے۔ کبھی کبھی بادل کا ایک ٹکڑا روئی کی طرح سپید تیرتا ہوا ان کے پاس سے گزر جاتا ——

خیر میں بہت دیر تک اسی طرح وہاں پر لیٹا رہا۔ مگر نیند پھر بھی نہ آئی چنانچہ میں گزشتہ واقعات پر غور کرنے لگ گیا۔ میں یہی سوچتا رہا کہ یہ امر کس قدر حیرت افزا ہے کہ پرہورخ نے مجھے صحیح صحیح قبل از وقت بتا دیا کہ اس غیر مرئی کتے کی آمد ایک اشارہ تھا کہ میں خطرے میں ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے اس بات پر اور بھی حیرت تھی کہ یہ واقعہ صرف میری ذات ہی سے کیوں متعلق تھا؟ —— میں بہت عرصے تک اس پر غور کرتا رہا۔ اس دوران میں ٹریسر زخموں کی تکلیف سے برابر کراہ رہا تھا۔

میری نیند میں غالباً ایک اور چیز بھی حارج ہو رہی تھی جسے آپ ہرگز تسلیم نہیں کریں گے —— وہ چاند تھا۔ وہ بالکل میری آنکھوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ چوڑا چکلا، زرد اور گول سافانوس۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ مجھ پر سے نظر ہی نہیں ہٹاتا میں جھلا اٹھا اور زبان نکال کر اس کا منہ چڑانا شروع کر دیا —— یہ واقعہ ہے کہ میں نے ایسی طفلانہ حرکت کی تھی۔ چنانچہ میں نے ہار کر کروٹ بدل لی مگر اب مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ میرے کانوں میں رینگ رہا ہے۔ اب مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھ پر غالب آگیا ہے۔ چنانچہ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھاس کا ہر پتا ننھی سے ننھی شاخ حتیٰ کہ مکڑی کا کمزور جالا بھی میری نظروں کے سامنے نمایاں طور پر ظاہر ہیں گویا وہ بالکل میرے قریب ہوں۔ اس کے علاوہ معلوم ہوتا تھا کہ میرے گرد و نواح کی چیزیں مجھے دعوت نظارہ دے رہی ہیں —— میں مجبور تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا —— آپ یقین نہیں کریں گے مگر میری آنکھیں ہرن کی طرح باہر نکل رہی تھیں۔ وہ اس قدر کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ نیند کے نام سے بالکل نا آشنا ہوں —— باغ کا پھاٹک کھلا تھا اور میں چار میل تک چاندنی کی وجہ سے بخوبی نظر دوڑا سکتا تھا۔ میں بغیر آنکھیں جھپکے دیکھتا رہا —— دفعتاً مجھے بہت دور ایک چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ جیسے کوئی سایہ تھرتھرا رہا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ سایہ متحرک ہوا۔ اس دفعہ یہ پہلے کی نسبت کچھ نزدیک تھا۔ آہستہ آہستہ یہ نزدیک تر آتا گیا۔

''کیا یہ سایہ ہو سکتا ہے؟'' میں نے دل ہی دل میں دریافت کیا۔

پہلے پہل مجھے خیال ہوا کہ کوئی خرگوش ہوگا۔ مگر یہ ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ جب کہ وہ اس سے کہیں بڑا تھا۔ میں نے دوبارہ نظر دوڑائی۔ اب کی دفعہ یہ سایہ ایک بڑا سیاہ دھبہ معلوم ہوا۔ جو میری طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ کوئی درندہ تھا۔ لومڑی یا بھیڑیا یہ خیال کرتے ہی میرا دل بیٹھ گیا۔ گو یہ حیرت کی بات ہے کہ مجھے اس قدر خوف کیوں محسوس ہوا۔ جب کہ کھیتوں میں عموماً ایسے حیوان گھومتے رہتے ہیں۔ مجھے خوف ضرور تھا۔ مگر حیرت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس سیاہ سائے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔

میرے تمام جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ رہی تھی اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ رگوں میں خون منجمد ہو رہا ہے۔ جیسے کسی نے مجھے برف میں غرق کر دیا ہو —— معلوم نہیں ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا؟ —— یہ صرف خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اتنے میں وہ سایہ بڑھتا ہوا ساتھ والے کھیت تک آگیا۔ اب مجھے یقین ہو

گیا کہ وہ واقعی کوئی وحشی حیوان تھا ----- وہ ہوائی بگولے ---- ایک گولی کی طرح بھاگا
---- میرے خدا ---- وہ کون تھا ؟ دفعتاً وہ ٹھٹکا جیسے اس نے کسی شکار کو سونگھا
ہے ---- کیوں ---- وہ تو وہی دیوانہ کتا تھا ! ---- وہی ---- وہی ---- میرے خدا ! میں
بالکل حرکت نہ کر سکا۔ منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نہ نکال سکا ---- وہ کتا چمکتی ہوئی آنکھوں سے باغ کے
دروازے کی طرف بھاگا اور عف عف کرتا ہوا سیدھا میری طرف آلپکا!

دفعتاً اپنے گھاس کے بستر سے ٹریسر شیر کی طرح دوڑتا ہوا آیا اور اس دیوانے کتے سے جھپٹ پڑا۔ دونوں لڑتے لڑتے آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ پھر کیا ہوا یہ مجھے قطعاً یاد نہیں۔ مجھے صرف اتنا یاد پڑتا ہے کہ میں گرتا پڑتا وہاں سے بھاگ کر اپنے بستر میں گھس گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میرے حواس درست ہوئے تو میں نے تمام گھر والوں کو جگا دیا اور انہیں مسلح ہونے کا حکم دیا۔ میں نے خود بھی ایک پستول ہاتھ میں پکڑ لی اور سب باہر نکلے۔ ایک اچھا خاصہ گروہ تھا جو ہاتھوں میں لاٹھیاں، پستول اور لالٹینیں پکڑے ہوئے تھا۔ ہم نے باغ میں پہنچ کر ٹریسر کو آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ آخر ہم ساتھ والے کھیت میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بے چارہ ٹریسر مردہ پڑا ہے۔ اس کا گلا بہت بری طرح کٹا ہوا تھا۔ دوسرا کتا غائب تھا۔

یہ دیکھ کر حضرات ! میں بچے کی طرح روتا رہا اور یہ بتاتے ہوئے مجھے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں اپنی جان بچانے والے کتے پر جھکا اور اس کے سر اور جسم کو دیر تک چومتا رہا۔ میں ابھی اسی طرح اس پر جھکا ہوا تھا کہ میری بوڑھی خادمہ نے تسلی دی۔ '' آخر آپ نکمے کتے کی خاطر اپنی جان کیوں ہلاک کر رہے ہیں؟

گو میں اپنی بوڑھی خادمہ سے متفق نہیں تھا مگر میں گھر چلا گیا۔ دوسرے روز ایک سپاہی نے اس دیوانے کتے کو گولی سے ہلاک کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس کتے کی قسمت میں لکھا تھا۔ جب کہ اس سپاہی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ سے گولی چلائی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اسے اپنی ملازمت میں ایک تمغہ ملا تھا ---- حضرات یہ ہے وہ مافوق الفطرت واقعہ جو میرے ساتھ پیش آیا۔

---- یہ کہہ کر کیپی تونخ نے اپنی داستان ختم کر دی اور پائپ میں تمباکو بھرنا شروع کر دیا ---- ہم نے حیرت میں ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

'' شاید اس واقعے کی یہ وجہ ہو کہ آپ نے نیک زندگی بسر کی ہے تبھی تو '' مسٹر فیلو پینطوف نے کچھ

اور کہنا چاہا مگر الفاظ زبان پر آ کر رہ گئے اس لیئے کہ کپی تونخ کے چہرے پر ایک بلند قہقہے کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''لیکن اگر مافوق الفطرت واقعات کیا امکانات اور حقیقی زندگی میں ان کے تاثرات کو تسلیم کر لیا جائے''۔ انطون سپیتیخ نے پھر پہلی بات دہراتے ہوئے کہا ''تو بتایئے شعور کس مرض کی دوا ہے؟'' ہم اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔

☆☆☆☆☆

تسکین دہ خواب

سیری اوجا مر گیا۔

میلے کا دن تھا۔ گھر میں حسبِ معمول تہوار کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بچے بوڑھے سب ان میں دلچسپی لے رہے تھے۔ انڈوں پر سرخ رنگ چڑھایا جا رہا تھا۔ توسوں کے لیے زردی تیار کی جا رہی تھی اور ایسٹر کے مہمانوں کے لیے مکھن بلویا جا رہا تھا ــــــ گھر کی فضا خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی تھی۔

تمام فرش دھوئے گئے تھے۔ کوڑا کرکٹ سب اٹھا دیا گیا تھا اور کھڑکیاں بھی صاف کروائی گئی تھیں۔ نوکر تھک کر چور چور ہو گئے تھے۔ سیری اوجا کی بہنیں، خوشگوار بوسوں کے خواب دیکھ رہی تھیں اور ناخوشگوار بوسوں کا خیال ان کے بدن میں لرزہ پیدا کر دیتا تھا۔

سیری اوجا اپنے کمرے میں لیٹا تھا، جو فرنیچر وغیرہ سے بالکل خالی تھا۔ سیری اوجا کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ بہار کا آغاز تھا اور تہوار کی آمد آمد تھی اس لیے سیری اوجا کی بہنیں موت کا خیال کرنے سے ہی خوف کھاتی تھیں۔

سیری اوجا کی موت کچھ ایسی بے وقت اور تہوار کی گوناگوں مسرتوں اور چہل پہل کے درمیان کچھ ایسی بے معنی سی تھی کہ گھر کے لوگ اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے تھے کہ اس کی صحت بجائے گرنے کے اچھی ہو رہی ہے۔

وہ ایک عرصے سے علیل تھا۔ انہوں نے تبدیلی آب و ہوا کے لئے اس کو کسی اور جگہ لے جانے کا ارادہ کیا تھا مگر اس ارادے کی اس لیے تکمیل نہ ہو سکی کیونکہ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ اس کو کہاں لے جایا جائے۔ پھر دفعتاً خدا معلوم کیوں اس کے پھیپھڑوں کی حالت خراب ہو گئی اور وہ اس قدر لاغر ہو گیا کہ

اس کو بستر پر سے ہلانا جلانا بھی بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ گرم موسم اسے کوئی خاص فائدہ نہ پہنچا سکتا تھا۔

نوجوان ڈاکٹر نے سیری اوجا کی غمزدہ ماں سے کہا۔

''یہ ایک مہینے کا اور مہمان ہے۔''

اور بوڑھے ڈاکٹر نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

''یہ مشکل سے چھ ہفتے اور زندہ رہ سکے گا۔''

سیری اوجا کا باپ بڑے ادب سے ان ڈاکٹروں کو دروازے تک چھوڑنے آیا۔ اس کا چہرہ سرخ اور حیرت زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا دل اس چیز کو قبول نہ کر رہا تھا کہ سیری اوجا عنقریب مر جائے گا۔ اس کے خیالات کی رفتار بہت سست تھی۔

وہ کمرۂ طعام میں کھڑا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے خود کو اس آئینے میں دیکھا جو دیوار پر آویزاں تھا۔ ٹائی کی گانٹھ کو درست کیا جو ایک طرف کو پھسل گئی تھی اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا جو اب سفید ہو رہی تھیں۔

ایک پریشان انداز میں وہ اس میز کے قریب گیا، جہاں اس کی بیوی بادام کتر رہی تھی۔ ہاتھ چھوٹے کوٹ کی جیبوں میں ٹھونسے اور اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اپنی بیوی کے جھکنے کے انداز، اس کی جسمانی تکالیف اور اس کے لرزاں لبوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ وحشت ناک انجام سے باخبر ہے۔

اسے یہ غم افزا احساس ہوا کہ اس کی بیوی اپنے نرم نرم تکیوں میں سر دے کر رونے دھونے کے بجائے بچوں کے ساتھ بظاہر بڑے سکون سے بیٹھی ہوئی ہے۔ حالانکہ غم اندرونی طور پر اسے کھائے جا رہا ہے۔ بچے اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتے ہوئے بڑی بے پروائی سے ہنس کھیل رہے تھے۔

بیوی کے دکھ نے اس کے جسم میں درد کی ایک لہر دوڑا دی۔ اس کے حلق میں کچھ پھنس سا گیا۔ وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے پاس سے چلا گیا۔ اس کے بغیر ایڑیوں کے بوٹ، چمکیلے فرش پر مدھم آہٹ پیدا کرتے گئے۔ غلام گردش سے ہوتا ہوا وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں چلا گیا کہ اپنے آپ کو صوفے پر گرا کر آہوں اور سسکیوں کے تھپیڑوں کے سپرد کر دے۔

اپنے پیچھے خاوند کے قدموں کی چاپ سن کر، اس کی بیوی کا رنگ پہلے سے زیادہ سرخ ہو گیا۔ اس کا

چہرہ سکڑ گیا مگر وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ بادام سب ختم ہو گئے تھے۔اس نے اپنے ہاتھ ایک سفید اور نرم تولیے سے پونچھے اور آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنے خاوند کے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں وہ دونوں پہلو بہ پہلو بیٹھ کر اپنے غم پر دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ انہیں کوئی تسلی دینے والا نظر نہ آتا تھا——

(۲)

ایسٹر بالکل قریب اور ہفتے کا روز تھا۔ سیری اوجا سو رہا تھا اور ایک عجیب وغریب لیکن تسکین دہ خواب دیکھ رہا تھا۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ سخت حبس ہے۔اس کی نظروں کے سامنے درخشاں خورشید کی کرنیں وادی پر زرکاری کا کام کر رہی ہیں۔ وہ ایک شکستہ جھونپڑے کے دروازے پر بیٹھا ہے۔ سامنے والے دو کھجور کے درخت اپنے بڑے بڑے پتوں سے اس کی تپش زدہ ٹانگوں اور اس کے سفید کپڑوں پر سایہ کر رہے ہیں۔ وہ بہت کم سن ہے، جیسا کہ وہ آج سے دس سال قبل ہوا کرتا تھا۔اس کا جسم جو کپڑوں سے بہت کم ڈھکا ہوا تھا۔کسی ارضی فرشتے کی طرح سبک اور ہلکا تھا۔ ہر شے بہت مسرور کر رہی تھی، اور سخت زمین جس پر اس کے ننگے پاؤں جمے ہوئے تھے، نیلا آسمان جو دوری کے باوصف اتنا قریب معلوم ہوتا تھا گویا وہ زمین کے ساتھ مل رہا ہے۔آس پاس کے جھونپڑوں کے قریب کھیلتے ہوئے بچوں کی چیخیں ——اس کی ماں کی نرم و نازک آواز جو کنویں کے قریب کھڑی ہوئی برہنہ پا اور گندمی رنگ کی عورتوں سے بڑی خوش خوش باتیں کر رہی تھی۔

اس کی ماں واپس مڑی۔ وہ اپنے کاندھے پر ایک تنگ گردن والی گاگر اٹھائے ہوئے تھی۔اس کا ننگا گندمی بازو اس گاگر کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ دھوپ اس کے گلاب آسا گالوں سے کھیل رہی تھی۔اس کے لب تبسم سے نیم وا تھے۔ وہ اپنی گھنی اور لانبی پلکوں سے اپنے لڑکے کی طرف دیکھنے لگی، جو فرط و انبساط سے چمک رہی تھیں۔ اپنے بچے کو مسرور اور کھیل کود میں مصروف دیکھ کر اس کے دل میں فخر کے جذبات موجزن تھے۔اس کے لڑکے نے ہاتھ میں ایک کھلونا پکڑا ہوا تھا، جو اس نے خود گیلی مٹی سے تیار کیا تھا—— یہ ایک پرندہ تھا۔مٹی کا بنا ہوا پرندہ مگر یہ جاندار معلوم ہوتا تھا۔

ننھے چابک دست آرٹسٹ نے اس پرندے کو گیلی اور بھاری مٹی سے بنایا تھا۔اس کی انگلیوں نے بڑی فن کاری سے کام کیا تھا اور دراصل مٹی خود تشکیل کی خواہش مند تھی۔ ننھا پرندہ بچے کی گرم اور نازک

انگلیوں میں، جن میں ایک تخلیقی ارادہ کروٹیں لے رہا تھا، تھرتھرا رہا تھا۔

اپنے بوجھ کو ہلکا کرنے کی جلدی میں اس کی ماں اس کے پاس سے گزری۔ چلتے ہوئے گردن اور سر کو خم دیے بغیر اس نے اپنی سیاہ اور گہری آنکھوں سے اس کی طرف مسرت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا اور اپنے تپش زدہ پیر کو اٹھاتے ہوئے چلا کر کہا۔ ''دیکھو امی!''

وہ اپنے غیر ملکی لب و لہجے پر کسی قدر متعجب ہوا مگر فوراً ہی اس کا یہ تعجب اور یہ اندیشہ کہ آیا اس کی گفتگو سمجھی گئی ہے یا نہیں، دور ہو گیا۔

اس کی ماں ٹھہری اور ہنستے ہوئے دریافت کیا۔

''کیوں کیا ہے میرے بچے؟''

اس نے اپنا مٹی کا کھلونا اٹھایا اور متبسم ہوتے ہوئے کہا۔

''دیکھو امی۔ یہ پرندہ میں نے بنایا ہے جو اصلی بلبل کی طرح گاتا ہے''

یہ کہتے ہوئے اس نے پرندے کی دم پر اپنے لب جمائے اور اس میں سے ایک مدھم سیٹی کی آواز نکلنا شروع ہوئی۔ پھونک کو درست کرتے ہوئے اس نے اس مٹی کے ڈھیلے سے اصلی موسیقی کے سُر نکالے۔

اس کی ماں ہنس پڑی اور کہا۔

''تم نے یہ عجیب و غریب پرندہ بنانے میں بڑی فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ اسے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے رکھو کہ مبادہ یہ اڑ جائے۔''

یہ کہہ کر اس کی ماں جھونپڑے میں چلی گئی اور اپنے کام کاج میں مصروف ہو گی۔ وہ وہیں پر بیٹھا اپنے کھلونے کی طرف مسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا اور اپنی نازک انگلیوں سے اس کے پروں کو تھپتھپاتا رہا۔

''کیا تم اڑ جانا چاہتے ہو؟'' اس نے پرندے سے دریافت کیا۔

پرندے کے پروں میں ایک ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔

اس نے پھر اس سے پوچھا۔

''کیا تم اڑ جانا چاہتے ہو؟''

پرندے کے بے جان مٹیالے جسم میں دل دھڑکنا شروع ہوا۔

تیسری بار اس نے پھر دریافت کیا۔

''کیا تم اڑ جانا چاہتے ہو؟''

وہ سرتاپا کانپ گیا۔ پرندے نے اپنے بازو پھیلائے۔ منہ سے آواز نکالی اور سر کو اِدھر اُدھر جنبش دی۔ اس نے اپنی مٹھی کھول دی اور پرندہ پُھر سے اڑ گیا۔ ہلکے نیلے آسمان میں اس کے نغمے پھیلتے گئے۔

سورج بلند سے بلند تر ہو گیا اور فضا ساکن سے ساکن تر ہوتی گئی۔

(۳)

سیری اوجا جب بیدار ہوا تو وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے سینے میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ اسے کھانسنا دشوار ہو رہا تھا۔ مگر وہ ننھا پرندہ کہاں تھا جس کو اس نے بنایا تھا؟۔

وہ پرندہ کھڑکی کے قریب بولیاں بولتا ہوا اپنے پروں کو پھڑ پھڑا رہا تھا۔

''میرا پرندہ!''

''لیکن میں کون ہوں؟''

سیری اوجا نے اٹھنے کی کوشش کی مگر تکیوں پر گر پڑا اور بے ہوشی میں بڑبڑانا شروع کیا ''لیکن میں کون ہوں۔''

اس کی ماں اس کے بستر پر جھکی مگر سیری اوجا اسے نہ دیکھ سکا کمرے کی دیواریں بھی اس کو نظر نہ آ رہی تھیں۔

(۴)

اب وہ پھر خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہے۔

دوپہر کے درخشاں سورج کی روشنی میں تمام وادی چمک رہی تھی——اس کے کپڑے نہایت غریبانہ اور پھٹے ہوئے تھے اور اس کے ماندہ پاؤں خشخشی اور بھوری ڈاڑھی گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھی۔

اس کے ساتھی نیچے زیتون کے درختوں کی چھاؤں میں لیٹے اپنی تھکاوٹ دور کر رہے تھے۔ اس کے گرد و پیش کی فضا اور آسمان میں روشنی نور بھر رہی تھی۔ دو آدمی نورانی لباس میں ملبوس شفاف ہوا میں تیرتے ہوئے آئے۔ ان کی آمد پر نسیمِ فلکی کے ٹھنڈے جھونکے ہوا میں بکھر گئے۔ یہ دونوں اس کے قریب پہنچے۔ اس نے ان سے دریافت کیا۔

''میں کون ہوں''

''گھبراؤ نہیں، آج سے تیسرے روز تم اٹھو گے''

اس کے کپڑے پہلے ہی سے سرخ رنگ کے تھے۔ اب اس کے سر کے گرد ایک آتشیں ہالہ تھا اور اس کے خون کی آتش سیال اس کی رگوں میں سے جار ہی تھی ——— یکا یک خوشی کا ایک نا قابل بیان نعرہ اس کے منہ سے بلند ہوا۔

(۵)

وہ بیدار ہوا۔ اس کی چیخ نے گھر کے سب لوگوں کو اس کے بستر کے قریب جمع کر دیا۔ اس کے زرد ہونٹوں سے خون کی ایک پتلی دھار بہہ رہی تھی۔ اس کا چہرہ لاش کا سا سپید تھا۔ اس کی خوفزدہ نگاہیں اپنے ان عزیز اقربا کی غیر متحرک آنکھوں سے دو چار ہو رہی تھیں جو اس کے بستر مرگ پر جمع تھے۔

اندھی تاریک اور خوفناک طور پر تاباں دانتوں والی ایک شکل اپنے ساتھ ازلی سردی اور دائمی ظلمت لے کر آئی۔ وہ بہت جسیم تھی۔ اس نے سیری اوجا کے پاس سے ساری ہوا چھین لی اور سیاہ بادل کی طرح اپنے فرغل کی تہوں کو ہلاتے ہوئے وہ سیری اوجا پر جھکی۔

مگر نورانی لباس والے بزرگ کی آواز بجلی کی طرح کڑکی۔

''آج سے تیسرے روز تم اٹھو گے''

مہلک مہمان کے فرغل کے پیچھے روز جزا کی طلائی روشنی بخوبی دکھائی دے سکتی تھی۔

یہ نظارہ سیری اوجا کی آنکھوں کے لیے فرحت بخش تھا۔ اس کا زرد چہرہ اس طلائی نور سے تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں فتح مندی کی ایک خاموش جھلک تھی۔

وہ اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے گنگنایا۔

''آج سے تیسرے روز میں اٹھوں گا''۔ اور وہ مر گیا

تیسرے روز وہ دفنا دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

چکّر

ایک روز علی الصبح شہر کے مضافات میں ایک سنسان سڑک پر ایک خاتون اور چہار سالہ لڑکا جارہے تھے۔ لڑکا جو گلاب کے مانند تھا بہت خوش خوش تھا اور خاتون نہایت عمدہ لباس میں ملبوس تھی۔ مسرت کی وجہ سے اس کے ہونٹ متبسم تھے اور وہ اپنے لڑکے کو بیقراری سے دیکھ رہی تھی۔ لڑکا ایک بڑے سے زرد رنگ کے چکر کو گھمارہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے بڑی عجیب طفلانہ حرکات کرتا۔ خوشی سے ہنستا۔ اپنے گداز پیر کو زمین پر مارتا۔ چھڑی کو ہوا میں گھماتا اور اپنے ننگے گھٹنوں کی نمائش کرتا بھاگ رہا تھا۔ گو چھڑی کو ہوا میں اس قدر بلند اٹھانا بالکل غیر ضروری تھا مگر ہمیں اس میں کیا دخل!

وہ کس قدر مسرور تھا! اس سے تھوڑا عرصہ قبل اس کے پاس چکر نہ تھا اور اب وہ اس زرد رنگ کے چکر کا نہ صرف مالک ہے بلکہ اس کے ساتھ بڑے انہماک سے کھیل رہا ہے!

اب ہر ایک چیز پر از مسرت تھی!

اس سے تھوڑا عرصہ پیشتر لڑکے کی نگاہوں میں کچھ چیز وقعت نہ رکھتی تھی۔ مگر اب اسے ہر ایک چیز نئی معلوم ہوتی تھی ——— درخشاں سورج، شہر کی مدھم شورش اور صبح کی روشنی سے منور بازار۔ لڑکے کے لیے اب سب چیزیں جدت، مسرت اور پاکیزگی کا پہلو لیے ہوئے تھیں۔

ہاں سب کچھ پاکیزہ ہے۔ بچے تصویر کا غیر پاکیزہ اور تاریک پہلو اس وقت نہیں دیکھتے جب تک ان کے بڑے اس کی وضاحت نہ کریں۔

(۲)

چوک میں ایک کھردرے ہاتھوں والا آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے کھڑا تھا۔ یہ جنگلے کے ایک طرف ہو گیا کہ بچہ اور خاتون گزر جائیں۔ بوڑھے نے اپنی دھندلی نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھا اور

مسکرایا۔اس کے گنجے سر میں مبہم خیالات رینگنے لگے۔

''کوئی صاحبزادہ ہے۔''اس نے خیال کیا۔''اچھا خوبصورت بچہ ہے۔یہ کس قدر مسرور ہے۔ بچہ—— مگر خیال رہے یہ کسی بڑے آدمی کا لڑکا ہے!''

ایک چیز وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکا، جو اس کے نزدیک بہت عجیب تھی۔ بچہ.......... مگر بچوں کو تو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جاتا ہے۔تھپکیاں انہیں خراب کر دیتی ہیں۔نرمی ان کو ہمیشہ بدچلن بنا دیتی ہے۔

اس کی ماں اس کو بالکل دبا نہ رہی تھی وہ اس کو ڈرانے یا دھمکانے کے لیے بالکل چیخ نہ رہی تھی اس کی ماں کس قدر اچھے کپڑوں میں ملبوس اور کس قدر خوبصورت تھی۔اسے اور کس چیز کی خواہش ہو سکتی تھی؟ بظاہر وہ نہایت آرام وسکون میں تھی۔

بوڑھے نے اپنا بچپن کتوں کی سی زندگی بسر کر کے گزارا تھا۔اب بھی اس کی زندگی کوئی خاص اچھی نہ تھی۔جب کہ وہ بھوک اور مار پیٹ سے ایک حد تک بچا ہوا تھا۔وہ گزشتہ ایام سردی، زدوکوب، اور فاقوں سے معمور تھے۔اسے امرا کے بچوں ایسی تفریحیں، کھلونے اور چکر نصیب نہ ہوئے۔اس طرح اس کی تمام زندگی غربت میں گزری تھی۔اس کے گزشتہ عہدِ زندگی میں کوئی بھی ایسا واقعہ نہ تھا جو یاد کیے جانے کے قابل ہو۔

اپنے پوپلے اور بغیر دانتوں کے منہ پر مسکراہٹ لاتے ہوئے اس نے بچے کی طرف دیکھا اور رشک محسوس کیا۔اس نے خیال کیا۔''کیسا بیہودہ کھیل ہے''—— حسد کے اس احساس نے اسے ماندہ کر دیا۔وہ کارخانے میں اپنے کام پر گیا۔جہاں اس نے بچپن سے لے کر اس عمر تک اپنی زندگی گزاری تھی۔سارا دن وہ اس بچے کے متعلق سوچتا رہا۔

خیالات اس کے دماغ میں خود بخود چلے آ رہے تھے۔بچے کے ہنسنے، بھاگنے اور چکر کا تعاقب کرنے کا تصور بہت آسان تھا—— اس کی ٹانگیں کس قدر گوشت سے بھری ہوئی تھیں اور گھٹنے کتنے سپید تھے!

مشینوں کی گڑگڑاہٹ میں وہ سارا دن اس بچے اور اس کے چکر کے متعلق سوچتا رہا۔رات کے وقت بھی وہ اس بچے کو خواب میں دیکھتا رہا۔

(۳)

دوسرے روز خواب پھر سے اس کے دماغ پر قابض ہو گئے۔مشینیں بھی ایک شور سے چل رہی

تھیں۔ چونکہ کام خود بخود ہو رہا تھا اس لیے توجہ کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ بوڑھے کے ہاتھ اپنے روزانہ کام میں مشغول تھے۔ لیکن اس کا پوپلا منہ جاذب توجہ خوابوں پر مسکرا رہا تھا۔ کارخانے کی فضا گرد و غبار سے دھندلی ہو گئی۔ چھت کے قریب مشینوں کے پٹے پھسل کر شور پیدا کرتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ دور کونوں میں ایک شور آفریں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

لوگ بھوتوں کی طرح اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ انسانی آوازیں مشینوں کے گونجتے ہوئے شور میں غرق ہو جاتی تھیں۔

بوڑھا ایسا محسوس کر رہا تھا کہ وہ بچہ ہے اور اس کی ماں ایک امیر خاتون ہے اور یہ کہ وہ چھڑی ہاتھ میں پکڑے چکر کو گھما رہا ہے۔ وہ سپید لباس پہنے ہوئے تھا اس کی ٹانگیں موٹی تھیں اور گھٹنے ننگے تھے۔

دن گزرتے گئے مگر یہ خواب اور کارخانے کا کام ویسے کا ویسا ہی رہا۔

(۴)

ایک روز شام کے وقت گھر واپس آتے ہوئے بوڑھے نے کسی پرانے پہیے سے اترا ہوا پہیہ نما چکر پایا۔ یہ بہت بھدا اور زنگ آلود تھا مگر بوڑھے کا جسم فرطِ مسرت سے کانپنے لگا اور آنسو اس کی دھندلی آنکھوں میں مچلنے لگے۔ اس نے اپنا اطمینان کرنے کے لیے چاروں طرف دیکھا۔ جھکا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس آہنی چکر کو اٹھا لیا۔ پھر وہ اسے ایک شرمائے ہوئے تبسم کے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔

بوڑھے کو چکر اٹھاتے وقت کسی نے نہ دیکھا اور نہ کسی نے اس سے کوئی سوال کیا۔ مگر کسی کو کیا پڑی تھی کہ بوڑھے سے استفسار کرتا؟ ایک چیتھڑے لٹکائے ہوئے بوڑھے کا کسی فضول اور ناکارہ چکر کو اٹھانا جو کسی کے کام کا نہ ہو ایسا واقعہ نہ تھا کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں!

مگر بوڑھا اس کو چھپا کر اپنے گھر لے گیا۔ گو اسے پکڑے جانے کا خوف دامن گیر تھا مگر پھر بھی اس کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا اور وہ اس کو اپنے گھر کس غرض کے لیے لے جا رہا تھا، یہ بوڑھے کو خود معلوم نہ تھا۔

دیکھنا اور ہاتھوں سے چھونا اس خواب سے زیادہ حقیقت رکھتا ہے جو فیکٹری کی گڑگڑاہٹ سے بھی زیادہ مدھم اور وہاں کی شور آفریں تاریکی سے زیادہ ہیبت ناک تھا۔

کئی دنوں تک لوہے کا چکر بوڑھے کے بستر میں پڑا رہا۔ کبھی کبھی وہ اسے بستر میں سے نکالتا اور اس کو دیکھتا رہتا۔ یہ بھدی چیز اسے بڑی تسکین بخشتی تھی۔ اس طرح وہ خواب جو ہر وقت اس کے دماغ پر

مسلط رہتا، زیادہ حقیقت نما ہو جاتا تھا۔

(۵)

ایک روز شام کے وقت جب پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں غیر معمولی خوشی سے چہک رہے تھے۔ بوڑھا اٹھا اور اس چکر کو لے کے باہر ٹہلنے کیلئے نکلا۔

کھانستے ہوئے وہ درختوں کے جھنڈ میں سے جنگل کو طے کر رہا تھا۔ سنجیدہ صورت اور سیاہ چھال والے درختوں کی خاموشی اس کے لیے بالکل نا قابل فہم تھی۔ جنگل کی خوشبوئیں کچھ عجیب سی تھیں۔ زمین پر رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑے اسے بہت عجیب وغریب معلوم ہو رہے تھے۔ گھاس پر پڑے ہوئے شبنم کے قطرے اسے ایسے معلوم ہوتے تھے، گویا وہ پریوں کی داستانوں سے متعلق ہیں۔ فضا میں نہ کارخانے کا شور تھا اور نہ مشینوں کی گڑگڑاہٹ بلکہ درختوں کے پیچھے ایک نہایت عجیب وغریب اور لطیف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بوڑھے کی سال خوردہ ٹانگیں پتوں کے دبیز قالین پر چل رہی تھیں اور زمین میں گڑی ہوئی پرانی جڑوں سے ٹھوکریں کھا رہی تھیں۔

اس نے ایک خشک ٹہنی اٹھائی اور اسے چکر میں پھنسا لیا۔

ایک پر سکون اور منور مرغزار اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس کی تازہ کٹی ہوئی گھاس کی پتیوں پر شبنم نے رنگا رنگ کے بے شمار نگینے جڑے ہوئے تھے۔

دفعتاً بوڑھے نے ٹہنی سے چکر کو گھمایا اور اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ چکر مرغزار کی سبز زمین پر بڑی آہستگی سے گھوم رہا تھا۔ خوشی سے بوڑھا بے اختیار مسکرا رہا تھا۔ وہ اس بچے کی طرح اپنے چکر کے تعاقب میں مصروف تھا۔ پھر اس نے اپنی ٹانگیں پھیلائیں چکر کو روکا اور چھڑی کو اس بچے کی طرح اوپر اٹھایا۔

اب اس نے محسوس کیا کہ وہ کم سن بچہ ہے۔ مسرور، نہایت مسرور! اور یہ کہ اس کی ماں اس کی طرف پر اشتیاق نظروں سے دیکھ کر مسکراتی ہوئی آ رہی ہے۔ ایک بچے کی طرح اس نے پہلے پہل تاریک جنگل میں نرم اور گیلی گھاس پر دوڑتے ہوئے سردی محسوس کی۔

اس کے جھریاں والے چہرے پر ڈاڑھی کے بال ہلے اور پوپلے منہ سے قہقہے کھانسی کے ساتھ مل کر بلند ہوئے۔

(۶)

اب علی الصبح جنگل میں جا کر چکر سے کھیلنا بوڑھے کا دستور ہو گیا۔ اس کھیل میں وہ اپنی واحد مسرت پاتا تھا۔

بعض اوقات اسے اندیشہ ہوتا کہ شاید کوئی راہ گزر اس کو دیکھ لے گا اور اس کی احمقانہ حرکت پر ہنسے گا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ شرم کا ناقابل برداشت احساس خود پر غالب پاتا۔ یہ احساس شرم اس کے لیے خوف کے مانند تھا۔ اس کی ٹانگیں کمزور اور بے حس سی ہو کر لڑکھڑانے لگیں۔ وہ بڑی احتیاط سے اپنا اطمینان کرنے کے لیے چاروں طرف دیکھتا کہ آیا کوئی اس کو دیکھ تو نہیں رہا۔

لیکن کوئی شخص بھی اس کو نہ دیکھ رہا ہوتا اور نہ کوئی اس کے قہقہے سن رہا ہوتا —— وہ جی بھر کر کھیل چکنے کے بعد اپنے گھر کی راہ لیتا۔ واپسی پر اس کے ہونٹ متبسم ہوتے۔

(۷)

بوڑھے کی حرکات کو کسی شخص نے بھی نہ دیکھا۔ چنانچہ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ وہ بڑے آرام و سکون میں کئی روز اپنا کھیل کھیلتا رہا۔ مگر ایک صبح جب کہ بہت اوس گری ہوئی تھی۔ بوڑھے کو سردی لگی اور مر گیا۔ کارخانے کے ہسپتال میں اجنبیوں کے درمیان مرتے وقت اس کے لبوں پر ایک پرسکون تبسم کھیل رہا تھا۔۔

اسے اب اس خیال سے تسکین حاصل ہو گئی تھی کہ وہ بھی بچہ رہ کر اپنی پیاری ماں کے ہمراہ تازہ گھاس پر بڑی مسرت سے کھیل چکا ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈرامے

ریچھ

افرادِ تمثیل

لے لینا ایوانوفنا پوپوف:	(ایک بیوہ اور صاحبِ جائداد)
گریگری سٹی پنیچ سمرنوف:	(متوسط عمر کا زمیندار)
لیوکا:	(مادام پوپوف کا بوڑھا نوکر)

منظر

مادام پوپوف کا کمرہ

مادام پوپوف (ماتمی لباس پہنے ایک تصویر پر نظریں جمائے) اور لیوکا (خادم)

لیوکا: مادام یہ درست نہیں ____ آپ اپنے ہاتھوں اپنی جان لے رہی ہیں ____ باورچن اور ماما دونوں جنگل میں بیر چننے کے لیے گئی ہیں۔ ہر ذی روح زندگی سے لطف اٹھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ معمولی سی بلی بھی جانتی ہے کہ کس طرح خوش وخرم رہا جا سکتا ہے ____ وہ اس وقت پرندے پکڑنے میں مشغول ہے اور آپ تمام دن بند کمرے میں قید رہتی ہیں جیسے کوئی راہبہ ہو ____ آپ کے لیے کسی چیز میں بھی لطف نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں! مگر ذرا خیال تو کیجیے۔ ایک سال سے کیا کم عرصہ ہوا ہوگا، جب سے آپ نے دہلیز کے باہر قدم تک نہیں رکھا!۔

مادام پوپوف: اور میں ہرگز گھر سے باہر نہ نکلوں گی ___ آخر کیوں نکلوں؟ میری زندگی ختم ہو چکی ہے۔ وہ قبر میں مدفون ہے! اور میں نے اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں دفن کر لیا ہے ___ ہم دونوں مر چکے ہیں۔

لیوکا: لو پھر وہی قصہ! میں اسے سننا پسند نہیں کرتا۔ نکولی رحلت کر چکا ہے اور یہ اٹل بات تھی ___ خدا کی مرضی میں کسی کو کیا دخل ___ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے! ___ آپ نے ماتم کیا اور بس یہی کافی ہونا چاہیے ___ یہ ماتمی لباس اور رونا دھونا تا عمر قائم نہیں رہ سکتا ___ میں اپنی بوڑھی عورت کو مٹی دے چکا ہوں ___ میں نے غم کیا اور ایک ماہ کے قریب اس کی جدائی میں روتا رہا ___ اس قدر ماتم اس کے لیے کافی تھا اور اگر میں تمام عمر گریہ وزاری میں گزارتا تو وہ بوڑھی عورت اتنے ماتم کے قابل نہ تھی۔ (آہ بھرتا ہے) آپ اپنے پڑوسیوں کو بھول گئی ہیں۔ ملاقاتیوں سے ملنا ترک کر دیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو بجا ہے کہ ہم چمگادڑوں کے مانند ہیں ___ ہم دن کی روشنی کو نہیں دیکھتے ___ چوہوں نے میرے کپڑوں کو کتر ڈالا ہے ___ اس طرح تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے گرد و نواع میں کوئی اچھا ملنے والا شخص ہے ہی نہیں حالانکہ تمام قصبہ شرفاء سے بھرا ہے ___ ہمارے پڑوس ہی میں ایک رجمنٹ ہے۔ دکھیا آنکھوں کے لیے ایک روح پرور نظارہ! خیمے میں ہر جمعے کے روز رقص ہوتا ہے اور باجہ تو ہر روز ہی بجتا ہے ___ آہ! میری عزیز مادام! آپ جوان ہیں اور خوبصورت بھی ___ گلاب کے پھول کی طرح حسین ___ آپ کو صرف زندہ رہنا اور زندگی سے لطف اٹھانا ہی سزاوار ہے ___ حسن تادیر قائم نہیں رہ سکتا ___ یہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ دس سال کے بعد شاید آپ طاؤس کے مانند خوش ہونا چاہیں مگر یہ وقت نصیب نہ ہوگا.........

مادام پوپوف: میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ آئندہ مجھ سے ایسی گفتگو نہ کیا کرو! تمہیں معلوم ہے کہ نکولی کی وفات کے بعد زندگی کی قدر و قیمت میری نگاہوں میں باقی نہیں رہی۔ تمہیں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میں زندہ ہوں مگر یہ صرف فریبِ نظر ہے! میں قسم کھا چکی ہوں کہ یہ سیاہ لباس میرے تن سے ہرگز جدا نہ ہوگا اور نہ میری نظریں بیرونی دنیا کا مطالعہ کریں گی ___ کیا سنتے ہو؟ خدا کرے کہ اس کی روح میری محبت کا مشاہدہ کر رہی ہو! ___ ہاں! اور میں جانتی ہوں کہ یہ بات تم سے پوشیدہ نہیں ___ وہ اکثر میرے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتا تھا ___ ظالم

اور ____ حتیٰ کہ بے وفا تھا! مگر میں آخری لمحے تک وفا کے دامن کو نہ چھوڑوں گی اور اسے بتا دوں گی کہ میں اپنی محبت میں کہاں تک ثابت قدم ہوں ____ قبر کی تاریک چاردیواری میں بھی وہ اس حقیقت سے غافل نہیں رہے گا کہ میں ہمیشہ وہی رہی جو اس کی موت سے قبل تھی۔

لیوکا: اس قسم کی گفتگو کرنے سے یہی بہتر ہے کہ آپ باغ میں چہل قدمی کے لیے چلی جائیں۔ یا ٹوبی اور جائنٹ کو گاڑی میں جوت کر اپنے پڑوسیوں سے مل آئیں ____

مادام پوپوف: (رونے لگ جاتی ہے)

لیوکا: میری عزیز مادام کیا ہوا؟ ____

مادام پوپوف: وہ ٹوبی کا بہت مشتاق تھا! جب کبھی وہ باہر جاتا تو اسی گھوڑے کی سواری کیا کرتا تھا ____ آہ! وہ کیسا خوب صورت سوار تھا ____ اس کی انگلیوں میں کس غضب کی رعنائی تھی۔ جب وہ گھوڑے کی لگام کو اپنے پورے زور کے ساتھ کھینچا کرتا تھا ____ کیا تمھیں یاد ہے۔ ٹوبی! ٹوبی! ____ گاڑی بان سے کہہ دینا کہ آج اسے ایک سیر دانہ زیادہ دیا جائے۔

لیوکا: بہت خوب مادام (زور سے گھنٹی بجتی ہے)

مادام پوپوف: (چونک پڑتی ہے) دیکھو کون ہے؟ کہہ دینا میں کسی سے ملاقات نہیں کیا کرتی۔

لیوکا: بہت اچھا مادام (باہر چلا جاتا ہے)

مادام پوپوف: (تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے) نکولس! تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کس طرح جب میں معاف کر سکتی ہوں ____ میری محبت صرف اسی صورت میں مر سکتی ہے کہ جب میرا دل پہلو میں حرکت کرنا بند کر دے (روتے ہوئے ہنس دیتی ہے) اور کیا تم شرمندہ نہیں ہو؟ میں ایک نیک لڑکی ہوں ____ ایک باوفا بیوی۔ میں نے اپنے آپ کو قید کر لیا ہے اور تمہاری محبت میں تادمِ آخر ثابت قدم رہوں گی اور تم ____ کیا شرمندہ نہیں ہو۔ تم گلگلے؟ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ بیسیوں مرتبہ مجھ سے لڑے جھگڑے۔ مجھے چھوڑ کر ہفتوں باہر رہے ____

(لیوکا گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

لیوکا: مادام آپ سے کوئی صاحب ملنے آئے ہیں ____ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

مادام پوپوف: مگر کیا تم نے اس سے کہا نہیں کہ میں نے اپنے خاوند کی وفات کے بعد ہر ملاقاتی سے ملنا ترک کر دیا ہے؟

لیوکا: میں نے ان سے کہا۔ مگر وہ سنتے ہی نہیں کہتے ہیں کہ گفتگو اشد ضروری ہے۔

مادام پوپوف: میں کسی سے نہیں ____ مل ____ سکتی!

لیوکا: میں نے یہی الفاظ اس سے کہے تھے مگر ____ وہ تو ایک مکمل شیطان معلوم ہوتا ہے۔ گالیاں بکتا ہوا وہ کمرے میں گھس آیا ہے ____ اور اب کمرۂ طعام میں موجود ہے۔

مادام پوپوف: (تنگ آ کر) اچھا! اسے کمرے میں بھیج دو۔ کس قدر غیر مہذبانہ فعل ہے!

(لیوکا چلا جاتا ہے)

مادام پوپوف: یہ لوگ کس قدر تنگ کرنے والے ہیں! آخر انہیں مجھ سے مطلب؟ وہ میرے آرام میں کیوں مخل ہوتے ہیں (آہ بھرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھے واقعی کسی خانقاہ میں دن گزارنے پڑیں گے ____ (سوچتی ہے) ہاں! ____ خانقاہ میں.......

(لیوکا سمرنوف سمیت داخل ہوتا ہے)

سمرنوف: (داخل ہوتے وقت لیوکا سے) اوندھی کھوپڑی تو بہت باتونی معلوم ہوتا ہے! گدھا کہیں کا! (مادام پوپوف کو دیکھ کر وقار سے) مادام! میں آپ سے متعارف ہونے کا فخر حاصل کرتا ہوں ____ گریگری ستی پنچ سمرنوف زمیندار اور سابق فوجی لفٹنٹ ____ میں ایک نہایت ضروری معاملے کے سلسلے میں آپ کو تکلیف دینے پر مجبور ہوں۔

مادام پوپوف: (ہاتھ پیش نہ کرتے ہوئے) میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔

سمرنوف: آپ کے مرحوم شوہر میرے ملنے والے تھے۔ ان کی طرف دو بلوں کے سلسلے میں میرے بارہ ہزار روبل نکلتے ہیں۔ چونکہ مجھے کل ساہوکارہ بنک میں سود کی ایک رقم داخل کرانا ہے اس لیے میں آپ کو یہ تکلیف دینے پر مجبور ہوں کہ وہ روپیہ مجھے آج عنایت کر دیا جائے۔

مادام پوپوف: بارہ ہزار! ____ میرے خاوند نے آپ سے یہ روپیہ کس غرض کے لیے قرض لیا تھا؟۔

سمرنوف: گھوڑوں کا دانہ خریدا تھا۔

مادام پوپوف: (آہ بھرتے ہوئے لیوکا سے) لیوکا! بھولنا مت! آج ٹوبی کو ایک سیر زائد دانہ ملے (لیوکا چلا جاتا ہے۔ سمرنوف سے) اگر نکولی کے ذمے آپ کے کچھ روپے ہیں تو میں یقیناً وہ ادا کر دوں گی ____ مگر آج مجھے معاف فرمائیے۔ میرے پاس فی الحال اتنی رقم موجود نہیں۔ خانساماں پرسوں تک شہر سے واپس آ جائے گا۔ میں اس سے کہہ دوں گی کہ آپ کا روپیہ ادا

کردے۔ مگر اس وقت سے پہلے میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی ____ اس کے علاوہ آج میرے خاوند کو وفات پائے پورے سات ماہ ہوئے ہیں اور میں اس وقت اس حالت میں نہیں ہوں کہ روپے کے معاملے میں کسی قسم کی گفتگو کر سکوں۔

سمرنوف: اور میں اس حالت میں ہوں کہ اگر کل روپیہ ادا نہ ہو سکا تو مجھے اپنے دماغ میں پستول کی گولی اتارنا پڑے گی ____ وہ میری ساری جائداد فروخت کر دیں گے۔

مادام پوپوف: پرسوں آپ کو روپیہ مل جائے گا۔

سمرنوف: میں روپیہ پرسوں نہیں بلکہ آج چاہتا ہوں۔

مادام پوپوف: اگر میرے پاس روپیہ موجود نہ ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں؟

سمرنوف: اس کے معنی ہوئے کہ آپ ادا نہیں کر سکتیں؟

مادام پوپوف: نہیں!

سمرنوف: ہوں! کیا آپ کا آخری جواب یہی ہے؟

مادام پوپوف: جی ہاں!

سمرنوف: آخری؟ ____ بالکل آخری؟

مادام پوپوف: بالکل آخری!

سمرنوف: بہت بہت شکریہ۔ مجھے یہ بات یاد رہے گی۔ (شانوں کو جنبش دیتا ہے) اور پھر مجھ سے یہ توقع ہے کہ میں خاموش رہوں! ابھی ابھی محکمہ آبکاری کے افسر نے مجھ سے دریافت کیا تھا ''گریگری تم ہر وقت خشم آلود کیوں رہتے ہو؟'' اپنی جان کی قسم! یہ غصہ کیونکر ضبط ہو سکتا ہے؟ ____ مجھے روپوں کی اشد ضرورت ہے۔ میں اسی جستجو میں پرسوں دن چڑھنے سے پہلے گھر سے روانہ ہوتا ہوں اور ہر قرض دار کے گھر پر دستک دیتا ہوں۔ مگر کچھ وصول نہیں ہوتا۔ اب ذلیل کتے کی مانند تھک کر چور ہو گیا ہوں۔ یوں خدا معلوم رات کہاں بسر کی تھی ____ ایک یہودی کے شراب خانے میں وودکا کے پیپے کے ساتھ .... آخر یہاں پہنچتا ہوں۔ یعنی گھر سے پورے پچاس میل دور۔ یہ امید لیے کہ مجھے روپیہ مل جائے گا۔ مگر یہاں دماغی توازن درست نہ ہونے کا عذر پیش کیا جاتا ہے ____! آخر میں اپنی طبیعت پر کس طرح قابو پا سکتا ہوں؟

مادام پوپوف: مجھے یاد ہے کہ میں آپ سے ایک مرتبہ صاف طور پر کہہ چکی ہوں کہ خانساماں کی واپسی پر

آپ کو روپیہ ادا کر دیا جائے گا۔

سمرنوف: میں آپ سے گفتگو کرنے آیا ہوں نہ کہ خانساماں سے!____ مجھے اس شیطان____ بے ادبی معاف____ مجھے آپ کے خانساماں سے کیا غرض؟

مادام پوپوف: معاف فرمائیے جناب میں اس قسم کے الفاظ اور لب و لہجے کی عادی نہیں ہوں____ میں آپ سے گفتگو کرنا نہیں چاہتی (جلدی سے باہر چلی جاتی ہے)

سمرنوف: اپنی جان کی قسم! دماغی توازن! اس کے خاوند کو مرے سات مہینے ہو چکے ہیں____ مگر آیا مجھے سود ادا کرنا ہے یا نہیں؟____ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارا خاوند مر چکا ہے۔ تم غم کی حالت میں ہو، اور اسی طرح کی دیگر فضولیات میں گرفتار ہو۔ تمہارا خانساماں کہیں گیا ہوا ہے۔ جہنم میں جائے!____ مگر میں کیا کروں؟____ کسی غبارے پر سوار ہو کر قرض خواہوں سے بھاگ جاؤں؟ یا دیوار سے سر پھوڑ کر مر جاؤں؟ میں گرزڈوف کے ہاں گیا____ گھر پر نہیں ہے۔ یاروشی وخ چھپا ہوا تھا۔ کرئیسن کے ساتھ جھگڑا ہوا اور مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ مازوٹوف بیمار تھا اور اس کی طبیعت ناساز ہے! ان تمام کم بختوں میں سے کسی نے بھی ایک پھوٹی کوڑی تک ادا نہیں کی صرف اس لیے کہ میں ان سے نرمی کے ساتھ پیش آتا ہوں____ اس لیے کہ میں بے وقوف ہوں، گیا گزرا بوڑھا! میں نے ان کے ساتھ بہت مہذبانہ اور نرم سلوک کیا ہے۔ مگر ٹھہرو تو سہی میں تمہیں بتا دوں گا۔ کیا کر سکتا ہوں۔ تم اب مجھے بے وقوف نہیں بنا سکو گے! میں یہاں اس وقت تک چمٹا رہوں گا جب تک کہ یہ مجھے روپیہ ادا نہ کر دے____ اف! آج یہ میری طبیعت کس قدر جوش کھا رہی ہے____ غصے کی انتہا یہ ہے کہ سانس مشکل سے چل رہا ہے____ اف! لعنت! میں تو ابھی سے اپنے آپ کو بیمار محسوس کر رہا ہوں۔ (چلاتا ہے) ارے کوئی ہے؟

(لیوکا آتا ہے)

لوکا: کیا ہے؟

سمرنوف: تھوڑا سا پانی یا شراب لاؤ۔

(لیوکا چلا جاتا ہے)

سمرنوف: یہ بھی خوب منطق ہے! ایک شخص کو روپے کی سخت ضرورت ہے____ اس کے پاس پھوٹی

کوڑی تک موجود نہیں اور یہ صرف اس لیے ادا نہیں کرسکتی کہ اس وقت اس حالت میں نہیں ہے کہ روپے کے معاملے میں گفت وشنید کرسکے! ____ عورتوں کی منطق کی نمایاں مثال! یہی وجہ ہے کہ میں عورتوں سے گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا اور نہ میں نے آج تک پسند کیا ہے۔
میں تو کسی آتش گیر مادے کے پیپے پر بیٹھنے کو عورت کے ساتھ گفتگو کرنے پر ترجیح دوں گا! اُف! میں سرتاپا غصہ بن رہا ہوں ____ اس حوا کی بیٹی نے مجھے کس قدر خشم انگیز کردیا ہے! بس جب کبھی اس قسم کی شاعرانہ ہستی دور سے بھی دیکھ پاتا ہوں تو میری ٹانگیں غصے کی وجہ سے کانپنا شروع کردیتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ پکار اٹھوں "مدد"، "مدد"!

(لیوکا داخل ہوتا ہے اور اسے پانی کا گلاس دیتا ہے)

لیوکا: مادام کی طبیعت ناساز ہے اور انہوں نے ملاقاتیوں سے ملنا بند کررکھا ہے۔
سمرنوف: بھاگ جاؤ!

(لیوکا چلا جاتا ہے)

سمرنوف: طبیعت ناساز ہے اور ملاقاتیوں سے ملنا بند کررکھا ہے! بہت خوب نہ ملو ____ میں اس وقت تک یہیں رہوں گا۔ جب تک تم مجھے روپیہ ادا نہ کروگی ____ اگر تمہاری طبیعت ایک ہفتے تک درست ہوگئی تو ایک ہفتہ ہی میں یہاں قیام کروں گا۔ اگر تم ایک سال بیمار رہوگی تو ایک سال تک ہی میں یہاں ٹھہرا رہوں گا ____ مجھے اپنا روپیہ واپس ملنا چاہیے۔ میری اچھی خاتون! تمہارے گالوں کے ننھے گڑھے اور یہ ماتمی لباس مجھے متاثر نہیں کرسکتے! ہم سب ان گڑھوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں! (کھڑکی کے پاس جاکر چلاتا ہے) سیمیون! گھوڑوں کو باہر لے جاؤ۔ ہم آج نہیں جا رہے۔ اصطبل والوں سے کہہ دینا کہ ان کو دانہ کھلا
دیا جائے۔ ارے! تم نے بائیں ہاتھ کے گھوڑے کی پھر باگ میں ٹانگ پھنس جانے دی ہے ____ وحشی کہیں کے! (بڑبڑاتے ہوئے) خیر! اب درست ہے (کھڑکی کے پاس سے چلا آتا ہے) فضا کس قدر خراب ہے! گرمی ناقابل برداشت ہے اور کوئی شخص کوڑی تک ادا نہیں کرتا۔ کل رات سخت بے چینی میں کاٹی ہے اور اب یہ ماتمی عورت خرابی طبیعت کا بہانہ کررہی ہے! ____ سر میں شدت کا درد ہے ____ کیا ووڈکا ملے گا؟ ____ شاید مل جائے (بآواز بلند پکارتا ہے) کوئی ہے؟

(لیوکا داخل ہوتا ہے)

لیوکا: کیا ہے؟

سمرنوف: وودکا کا ایک گلاس لاؤ (لیوکا باہر چلا جاتا ہے) اُف! (بیٹھ کر اپنے کپڑوں کا امتحان کرتا ہے) عجیب ہیئت بنی ہے! سر سے پیر تک غبار سے اٹا ہوں۔ کیچڑ سے بھرا ہوا بوٹ۔ بالوں میں کنگھی نہیں منہ نل سے نہیں دھویا۔ واسکٹ پر تنکے پڑے ہیں! اس خاتون نے شاید یہی خیال کیا ہوگا کہ کوئی راہزن ہے (جمائی لیتا ہے) ____ اس حالت میں ملاقاتی کمرے میں داخل ہونا تہذیب کے سراسر خلاف ہے ____ مگر اس میں کیا حرج ہے، میں ملاقاتی نہیں ہوں ____ ایک قرض خواہ کے لیے ہر لباس مناسب ہے۔

(لیوکا داخل ہوتا ہے)

لیوکا: (گلاس دیتے ہوئے) جناب آپ آزادی سے کام لے رہے ہیں۔

سمرنوف: (غصے میں) کیا؟

لیوکا: کچھ بھی نہیں، میں صرف..............

سمرنوف: کس سے گفتگو کر رہے ہو؟ چپ رہو اب!

لیوکا: (اپنے آپ سے) یہ ضرور کوئی نہ کوئی آفت ہے۔ غالباً کوئی آندھی لے آئی ہے اسے۔

سمرنوف: اُف! کتنا غضب ناک ہو رہا ہوں! معلوم ہوتا ہے کہ تمام دنیا کو سرمہ بنا دینا چاہتا ہوں ____ طبیعت واقعی خراب ہو رہی ہے ____ (پکارتا ہے) کوئی ہے؟

(مادام پوپوف نگاہیں نیچی کیے داخل ہوتی ہے)

مادام پوپوف: جناب تخلیہ میں رہنے کے باعث میرے کان بہت عرصے سے انسانی آواز کے عادی نہیں اور یہ شور برداشت نہیں کر سکتے۔ میں آپ سے نہایت مودبانہ گزارش کرتی ہوں کہ میرے آرام میں مخل نہ ہوجیئے۔

سمرنوف: میرا روپیہ ادا کر دیجیے میں چلا جاؤں گا۔

مادام پوپوف: میں واضح الفاظ میں کہہ چکی ہوں کہ میرے پاس اس وقت روپیہ موجود نہیں۔ پرسوں تک انتظار کیجیے۔

سمرنوف: میں بھی آپ سے واضح الفاظ میں عرض کر چکا ہوں کہ مجھے روپیہ کی ضرورت ہے ــــــ پرسوں نہیں بلکہ آج، اگر آپ آج روپے نہ دیں گی تو کل مجھے اپنے آپ کو پھانسی پر لٹکانا پڑے گا۔

مادام پوپوف: مگر میں کیا کرسکتی ہوں جب کہ میرے پاس روپیہ موجود ہی نہیں؟ عجیب مصیبت ہے!

سمرنوف: تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ مجھے اس وقت روپیہ ادا نہیں کرسکتیں......... نہیں کرسکتیں؟

مادام پوپوف: نہیں ــــــ

سمرنوف: اس صورت میں یہیں ٹھہروں گا اور اس وقت تک ٹھہرا رہوں گا جب تک مجھے اپنی رقم وصول نہ ہو جائے (بیٹھ جاتا ہے) روپیہ پرسوں ادا کیا جائے! بہت خوب! میں پرسوں تک یہیں بیٹھا رہوں گا.......... اسی طرح جما رہوں گا۔ (پھدک کر پھر بیٹھ جاتا ہے) کیا میں اپنا سود کل ادا کرنے پر مجبور نہیں ہوں؟ یا آپ نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں؟

مادام پوپوف: جناب میں استدعا کرتی ہوں کہ اس طرح شور نہ مچایئے یہ اصطبل نہیں ہے۔

سمرنوف: میں اصطبل کے متعلق آپ سے سوال نہیں کر رہا میں پوچھ رہا ہوں ــــــ کیا میں کل اپنا سود ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟

مادام پوپوف: آپ عورتوں کے ساتھ مہذبانہ گفتگو کرنا نہیں جانتے۔

سمرنوف: میں عورتوں کے ساتھ مہذب گفتگو کرنا جانتا ہوں۔

مادام پوپوف: نہیں تم نہیں جانتے۔ تم غیر مہذب اور ناشائستہ انسان ہو اچھے لوگ عورتوں کے ساتھ اس قسم کی گفتگو نہیں کیا کرتے۔

سمرنوف: اوہو۔ یہ تو خوب ہے! ہاں یہ تو بتایئے کہ میں آپ سے کس طرز کی گفتگو کروں؟ فرانسیسی یا کسی اور زبان میں (زیادہ غضب ناک ہو کر اور ذرا لکنت سے) مادام! میں کس قدر خوش ہوں کہ آپ مجھے روپیہ ادا نہیں کر رہیں۔ تکلیف دہی کے لیے معافی کا طالب ہوں! آج کیسا پیارا دن ہے؟ اور یہ ماتمی لباس آپ کے جسم پر کتنا بھلا دکھائی دے رہا ہے (ادب سے جھکتا ہے)

مادام پوپوف: یہ بہت غیر مناسب اور وحشیانہ گفتگو ہے۔

سمرنوف: (تمسخر اڑاتے ہوئے) غیر مناسب اور وحشیانہ! میں عورتوں سے اچھی طرح گفتگو کرنا نہیں جانتا ــــــ مادام! مجھے ان چڑیوں سے کہیں زیادہ عورتوں سے سابقہ پڑا ہے جو آپ نے اب تک دیکھی ہیں۔ میں عورتوں کے سلسلے میں تین لڑائیاں لڑ چکا ہوں۔ ہاں! کبھی وہ دن تھے کہ میں

بالکل بے وقوف اور ناسمجھ تھا____ جذباتی اور شہد کی طرح شیریں۔ بات بات پر جھکا کرتا تھا ____ دامِ الفت میں گرفتار ہوا اور رنج و آلام سہے۔ چاند کی معکوس روشنی دیکھ کر آہیں بھریں____ میں نے وارفتگی سے محبت کی۔ ہر پہلو سے ثابت قدم رہا۔ لعنت ہو مجھ پر! ____ نیل کنٹھ کی طرح صنف لطیف کے حقوق پر نغمہ آرائی کرتا رہا۔ اپنی نصف دولت اس نازک جذبے کی نذر کر دی____ مگر اب____ نہیں مہربانی! اب تم مجھے اپنے دام میں نہیں پھانس سکتی ہو۔ میں کافی سبق حاصل کر چکا ہوں! کالی بھویں، مدبھری آنکھیں، لب لعلیں، چاہِ غبغب، چاندنی، سرگوشیاں، خوف زدہ سانس____ میں اب ان چیزوں کے لیے تانبے کا ایک پیسہ تک نہیں دے سکتا۔ مادام! آپ کو علیحدہ کرتے ہوئے، تمام عورتیں خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھی فطرتی طور پر جلد پھر جانے والی، باتونی، اذیت رساں، دروغ گو، حقیر، ادنیٰ، اور بے رحم ہوتی ہیں____ ان کی منطق سخت اشتعال انگیز ہوتی ہے اور اس صنف کے بارے میں (اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتا ہے) میری صاف گوئی معاف! اس فلسفی کو جو زنانہ لباس میں ملبوس ہو چڑیاں بھی سبق پڑھا سکتی ہیں! آدمی شاعرانہ ہستی کو دیکھتا ہے____ سر تا پا سپید ململ میں لپٹی ہوئی، ایک فرشتہ، دیوی، مجسمہ محبت، اور اگر اس کی روح میں جھانک کر دیکھے تو وہ ایک حقیر مگر مچھ سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی (ایک کرسی کا سہارا لیتا ہے۔ کرسی ٹوٹ جاتی ہے) مگر سب سے زیادہ مشتعل کرنے والی چیز یہ ہے کہ یہ مگر مچھ کسی وجہ سے خیال کرتا ہے کہ اس کی خود مختاری اور اجارہ داری ہی محبت کا جذبہ نازک ہے! لیکن، لعنت ہو مجھ پر!____ آپ مجھے اس کیل پر الٹا لٹکا کر پھانسی دے سکتی ہیں۔ اگر کوئی عورت سوائے اپنے پالتو کتے کے کسی اور کی محبت میں ثابت قدم رہی ہو! محبت کے دوران میں شکوہ و شکایت کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی____ آپ بدقسمتی سے عورت ہیں اور اس لیے عورت کی فطرت کا مطالعہ آپ اپنے آپ سے کرتی ہیں، ایمان داری سے بتایئے کہ کیا آپ نے ابھی تک کوئی ایسی عورت دیکھی ہے جو وفا شعار، ثابت قدم اور صاف دل ہو؟____ آپ ایسی مثال نہیں پیش کر سکتیں۔ ایک سینگوں والی بلی آسانی سے مل سکتی ہے مگر وفادار عورت ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی!

مادام پوپوف: تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پھر محبت میں کون ثابت قدم رہتا ہے۔ مرد تو رہ نہیں سکتے۔

سمرنوف: یقیناً مرد!

مادام پوپوف: مرد! (ہنستی ہے) مرد، محبت میں سچے اور ثابت قدم! ____ یہ تو بالکل نئی بات ہے (غصے میں) آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس قسم کا فیصلہ مرتب کریں؟ مرد سچے اور ثابت قدم! ____ اگر اسی کے متعلق گفتگو کرنی ہے تو میرا خاوند ان تمام مردوں سے جو میرے ملنے والے تھے نسبتاً بہتر تھا ____ میں اس سے بہت محبت کیا کرتی تھی۔ ایسی محبت جو ایک نوجوان اور پاک باز عورت کرسکتی ہے۔ میں نے اپنی جوانی اس کی نذر کردی۔ زندگی، مسرت، دولت سب کچھ حوالے کردیا۔ وہ میرے جسم کی روح تھا۔ ایک بت تھا جس کی میں پجارن بن کر رہی ____ اور یہ مرد جو اوروں سے بہتر تھا قدم قدم پر مجھے نہایت شرمناک طریقے پر دھوکا دیتا۔ اس کی موت کے بعد مجھے میز کا ایک خانہ عشقیہ خطوط سے بھرا ہوا ملا۔ اور جب وہ زندہ تھا! ____ (اس کی یاد کس قدر دہشت خیز ہے) وہ مجھے ہفتوں کے لیے اکیلا چھوڑ جایا کرتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ بہت سی عورتوں سے اظہارِ عشق کرتا اور مجھ سے دغا کرتا تھا۔ میرے روپے کو برباد کرتا اور میرے احساسات کا مضحکہ اڑاتا تھا ____ مگر باوجود ان سب باتوں کے میری محبت میں کوئی فرق نہ آنے پایا ____ اور اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ میں اب بھی ویسی ہی ثابت قدم اور وفا کیش ہوں۔ میں نے ان چار دیواروں کے اندر اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے قید کرلیا ہے اور اس ماتمی لباس کو میں اپنے تن سے ہرگز جدا نہ ہونے دوں گی۔

سمرنوف: (حقارت سے ہنستے ہوئے) ماتمی لباس! نہ معلوم آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے جیسے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں کہ یہ سیاہ لباس پہن کر چار دیواری میں مقید رہنے سے آپ کا کیا مطلب ہے ! ____ واقعی بڑا پُراسرار ہے ____ اور رومان انگیز! ____ اگر کوئی نوجوان مبتدی شاعر آپ کے گھر کے پاس سے گزرے گا تو وہ کھڑکیوں کی طرف دیکھ کر یہ کہے گا "یہاں وہ پُراسرار عورت رہتی ہے، جس نے اپنے خاوند کی محبت میں اپنے آپ کو گھر میں قید کر رکھا ہے۔" ____ میں ان ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔

مادام پوپوف: (شرم سے سرخ ہوتے ہوئے) کیا؟ تم یہ کہنے کی کیوں کر جرات کرسکتے ہو؟

سمرنوف: آپ نے اپنے آپ کو زندہ دفن تو کرلیا ہے۔ مگر چہرے پر غازہ لگانا نہیں بھولیں!

مادام پوپوف: اس قسم کی نازیبا گفتگو کی تم کیونکر جرات کرسکتے ہو؟

سمرنوف: ازراہِ عنایت شور نہ مچایئے ____ میں خانساماں نہیں ہوں! مجھے حق گوئی سے کام لینے دیجیے

۔میں عورت نہیں ہوں۔اس لیے کھری کھری بات کہنے کا عادی ہوں ____ شور نہ مچایئے گا اب !

مادام پوپوف: میں خاموش ہوں۔یہ تمہیں ہو جو اس طرح چلا رہے ہو ____ خدا کے لیے اب تم جاؤ۔

سمرنوف: روپیہ ادا کر دیجیے تو میں ابھی چلا جاتا ہوں۔

مادام پوپوف: میں ہرگز نہیں دوں گی۔

سمرنوف: مگر آپ کو دینا ہوگا!

مادام پوپوف: تمہاری اسی ضد پر میں ایک کوڑی تک بھی ادا نہ کروں گی ____ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔

سمرنوف: معاف کرنا۔تم میری بیاہتا یا منسوبہ نہیں ہو اس لیے اس قسم کا جھگڑا مت کرو (بیٹھ جاتا ہے) مجھے یہ گفتگو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

مادام پوپوف: (غیر مہذبانہ الفاظ سن کر حیران ہوتے ہوئے) تم بیٹھ رہے ہو؟

سمرنوف: ہاں! ہاں!

مادام پوپوف: میں درخواست کرتی ہوں۔تم یہاں سے چلے جاؤ۔

سمرنوف: روپیہ ادا کر دو (ایک طرف ہو کر) میں کس قدر غضب ناک ہو رہا ہوں۔

مادام پوپوف: میں ناشائستہ لوگوں کی گفتگو سننا پسند نہیں کرتی۔ازراہِ عنایت یہاں سے چلے جاؤ (ذرا ٹھہر کر) کیا نہیں جاؤ گے ____ نہیں جاؤ گے؟

سمرنوف: نہیں!

مادام پوپوف: نہیں؟

سمرنوف: نہیں!

مادام پوپوف: بہت اچھا ٹھہرو (گھنٹی بجاتی ہے)

(لیوکا داخل ہوتا ہے)

مادام پوپوف: لیوکا! اس شخص کو دروازہ دکھا دو۔

لیوکا: (سمرنوف کے قریب جاتا ہے) جناب! جب آپ سے کہا گیا ہے تو تشریف کیوں نہیں لے جاتے ۔یہاں ٹھہرے رہنے میں کوئی فائدہ نہیں ....

سمرنوف: (کرسی پرسے کود کر) زبان کو لگام دو! جانتے ہو کس سے گفتگو کر رہے ہو؟....... قیمہ بنادوں گا۔ خیال رہے!

لیوکا: (اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھتا ہے) خداوند! (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) آہ! میں بیمار ہو رہا ہوں! بیمار ہو رہا ہوں! سانس مشکل سے چل رہا ہے!

مادام پوپوف: ڈاشا کہاں ہے؟____ ڈاشا! (پکارتی ہے) ڈاشا! پیلیگیا! ڈاشا (گھنٹی بجاتی ہے)

لیوکا: اُف!____ وہ بیر چننے گئی ہیں____ گھر میں کوئی بھی موجود نہیں____ طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے، پانی!

مادام پوپوف: برائے مہربانی یہاں سے چلے جائیے۔

سمرنوف: ذرا نرم گفتاری سے کام لیجیے۔

مادام پوپوف: (مٹھیاں بھینچتے ہوئے اور ایڑیوں کو زمین پر مار کر) تم ریچھ ہو!____ ایک وحشی ریچھ! بکواسی! دیو!

سمرنوف: کیا؟ کیا کہا؟

مادام پوپوف: کہتی ہوں تم ریچھ ہو____ دیو ہو!

سمرنوف: (کھڑے ہوتے ہوئے) معاف کرنا، تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ میری اس طرح ہتک کرو؟

مادام پوپوف: ہاں! میں تمہاری ہتک کر رہی ہوں____ پھر کیا؟ کیا یہ سمجھ رہے ہو میں تم سے خائف ہوں؟

سمرنوف: اور کیا تمہارے خیال میں ایک شاعرانہ چیز ہوتے ہوئے تمہیں ہر شخص کی بے عزتی کرنے کا حق حاصل ہے؟____ دعوتِ مبارزت قبول ہو!

لیوکا: میرے اللہ!____ پانی!! پانی!!

سمرنوف: پستول!

مادام پوپوف: اگر تم مضبوط ہاتھوں کے مالک ہو اور سانڈ کی طرح ڈکار سکتے ہو تو کیا تمہارا خیال ہے میں ڈر جاؤں گی؟

سمرنوف: مبارزت کے ذریعے سے اس چیز کا فیصلہ ہو گا! مجھے اس کی کچھ پروا نہیں کہ تم عورت ہو____ ایک کمزور حریف!

مادام پوپوف: (سمرنوف کی آواز کو دباتے ہوئے) ریچھ! ریچھ!

سمرنوف: اب وہ وقت نہیں رہا کہ صرف مرد ہی ہتک کے لیے سزا بھگتیں۔ اگر مساوات قائم ہونی ہے تو ابھی سے ہوگی۔ لعنت ہو سب پر! تمہیں دعوتِ مبارزت قبول کرنا ہوگی۔

مادام پوپوف: ڈوئل چاہتے ہو؟ بہت خوشی سے۔

سمرنوف: ابھی اسی لمحے۔

مادام پوپوف: اسی لمحے۔ میرے خاوند کے پاس پستول تھے......... میں ابھی لاتی ہوں (باہر جاتی ہے اور جلدی سے واپس چلی آتی ہے)........... میں کس قدر خوش ہوں گی جب پستول کی آہنی گولی تمہارے بھدے دماغ سے پار ہوگی۔ لعنت ہو تم پر۔ (چلی جاتی ہے)

سمرنوف: میں اسے پرندے کی طرح آسانی سے گولی کا نشانہ بنادوں گا۔ دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں، جذباتی اور رومانی انسان نہیں ____ عورتوں کے غمزے اور ادائیں میری نظروں میں کچھ معنی نہیں رکھتیں۔

لیوکا: میرے اچھے صاحب! (گھٹنوں کے بل کھڑے ہوکر) خدا کے لیے اس بوڑھے آدمی پر رحم کیجیے۔ یہاں سے تشریف لے جائیے۔ میں پہلے ہی سے خوف کے مارے سرد ہوا جارہا ہوں اور اب آپ لڑ رہے ہیں۔

سمرنوف: (لیوکا کی بات پر کان نہ دھرتے ہوئے) ڈوئل! واقعی یہ مساوات ہے! اسی سے تو انصاف کی آزادی کا پتہ چلتا ہے۔ میں اسے گولی کا نشانہ بنادوں گا۔ مگر کتنی بہادر عورت ہے۔ (اسے لعن طعن کرتا ہے) کہہ رہی تھی "لعنت ہو تم پر! تمہارے بھدے دماغ میں گولی اتاردوں گی!"......... کیسی عورت ہے، اس کے گال سرخ ہو رہے تھے آنکھیں چمک رہی تھیں............ اس نے مقابلہ منظور کرلیا، اپنی عزت کی قسم، آج سے قبل ایسی عورت کبھی دیکھنے میں نہیں آئی!..............

لیوکا: اچھے صاحب! تشریف لے جائیے۔ میں آپ کے لیے دعا کیا کروں گا۔

سمرنوف: وہ واقعی عورت ہے، مجھے یہ جرات بہت پسند ہے! سر سے پیر تک عورت! جذبات کا شمہ بھر بھی موجود نہیں بلکہ سراپا شعلہ ہے۔ آتش گیر مادہ، آتش بازی کا ایک چکر! ____ اس عورت کو ہلاک کرنے کے بعد مجھے واقعی افسوس ہوگا۔

لیوکا: (روتا ہے) جناب! یہاں سے چلے جائیے۔

سمرنوف: یہ عورت مجھے پسند ہے۔ واقعی بہت پسند ہے، گو اس کے گالوں میں گڑھے ہیں، مگر پھر بھی وہ مجھے بہت بھاتی ہے۔ میں اسے تمام قرض بخش دوں گا۔ میرا غصہ کافور ہو گیا ہے ____ خوب عورت ہے!

(مادام پوپوف دو پستول لیے داخل ہوتی ہے)

مادام پوپوف: یہ رہے پستول....... مگر قبل اس کے کہ ہم ایک دوسرے پر گولیاں چلائیں مجھے سکھا دو کہ پستول کس طرح چلاتے ہیں ____ میں نے عمر بھر پستول کو چھوا تک نہیں۔

لیوکا: خدا رحم کرے! میں جا کر گاڑی والے اور باغبان کو ڈھونڈتا ہوں ____ نہ معلوم یہ تکلیف کی آندھی کہاں سے نمودار ہو گئی؟ (چلا جاتا ہے)

سمرنوف: (پستولوں کا امتحان کرتے ہوئے) پستول بہت قسم کے ہوتے ہیں ____ یہ سمتھ کمپنی کے تیار کردہ ہیں ____ بہت اچھے ہیں........ کوئی سو سو روبل کے قریب قیمت ہو گی ____ دیکھیے پستول کو اس طرح پکڑیئے گا (اپنے آپ سے) کیسی حسین آنکھیں ہیں، کیسی حسین آنکھیں ہیں ____ ساحرہ ہے ____۔

مادام پوپوف: کیا اس طرح؟

سمرنوف: بالکل درست....... اب لبلبی کو اوپر اٹھایئے......... اس طرح نشانہ باندھیے........ سر کو ہلکی سی جنبش دیجیے۔ ہاتھ کو لمبا لے جایئے ____ ٹھیک ہے...... پھر اس ننھی سی چیز کو دبا دیجیے اور بس۔ مگر خیال رہے کہ لبلبی دباتے وقت پریشانی غلبہ نہ پائے اور نشانہ بڑے اطمینان سے لیا جائے ہاتھ ہرگز ہرگز نہ کانپے۔

مادام پوپوف: بہت اچھا ____ مگر یہاں اس کمرے میں لڑنا درست نہیں۔ آؤ باہر باغ میں چلیں۔

سمرنوف: چلو مگر میں تو صرف ہوا میں گولی چلاؤں گا۔

مادام پوپوف: وہ کیوں؟

سمرنوف: اس لیے ____ اس لیے ____ کہ یہ میری مرضی ہے۔

مادام پوپوف: اب ڈر رہے ہو؟ ہاہا! نہیں جناب! اب میں حیل و حجت نہیں سنوں گی۔ مہربانی کر کے چلیے ____ میں اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتی جب تک آپ کے سر میں گولی نہ اتر جائے۔ اس

سر میں جس سے مجھے سخت نفرت ہے۔ کیا واقعی ٹال رہے ہو؟

سمرنوف: واقعی!

مادام پوپوف: سراسر جھوٹ! ____ مگر تم لڑنے پر آمادہ کیوں نہیں ہو؟

سمرنوف: اس لیے........اس لیے.......... کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔

مادام پوپوف: (زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ) مجھے پسند کرتا ہے۔ یہ کہنے کی جرات کرتا ہے۔ (دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تم جا سکتے ہو۔

سمرنوف: (خاموشی سے پستول ہاتھ سے رکھ دیتا ہے۔ ٹوپی اٹھا کر چلنے لگتا ہے، مگر دروازے کے قریب ٹھہر جاتا ہے۔ نصف لحہ تک وہ ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھتے ہیں ____ مادام پوپوف کی طرف جا کر) کیا آپ ابھی تک ناراض ہیں؟ ____ مگر آپ جانتی ہیں ____ آہ! میں اپنا مفہوم کس طرح ادا کروں؟ دیکھیے حقیقت یہ ہے ____ یعنی معاملہ یوں ہے ____ دیگر الفاظ میں (روتا ہے) مگر یہ میرا قصور نہیں ہے کہ میں تمیں پسند کرتا ہوں (کرسی کا سہارا لیتا ہے کرسی ٹوٹ جاتی ہے) لعنت! تمہارا آرائشی سامان کس قدر نازک ہے۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں؟ ____ سمجھتی ہو؟ ____ تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔

مادام پوپوف: دور ہو جاؤ! مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔

سمرنوف: میرے معبود! کیسی نادر عورت ہے، کم از کم آج تک میری نظر سے اس قسم کی عورت نہیں گزری ____ میں برباد ہو گیا ہوں۔ تباہ ہو گیا ہوں! ____ اس چوہے کی مانند ہوں جو پنجرے میں گرفتار کر لیا گیا ہو۔

مادام پوپوف: بھاگ جاؤ، ورنہ گولی چلا دوں گی۔

سمرنوف: چلا دو! تم اس مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتی ہو جو ان درخشاں آنکھوں کے سامنے مرنے سے ایک شخص کو نصیب ہو سکتی ہے ____ ان مخملی ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستول سے ہلاک ہونا! ......دیوانہ ہو گیا ہوں۔ سوچ کر ابھی ابھی فیصلہ کر لو، کیونکہ اگر میں ایک دفعہ یہاں سے چلا گیا تو پھر ملاقات بہت مشکل ہے! ____ فیصلہ کرو نا ____ میں اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ شریف آدمی ہوں۔ دس ہزار روبل ماہوار معقول آمدنی بھی ہے ____ نشانے میں اتنا ماہر ہوں کہ سکہ ہوا میں اچھال کر دو ٹکڑے کر سکتا ہوں ____ میرے اصطبل میں اچھے سے اچھے گھوڑے

موجود ہیں ____ کیا میری بیوی بننا قبول کرتی ہو؟

مادام پوپوف: (حقارت سے پستول کو اٹھاتے ہوئے) ڈوئل! ہمیں فیصلہ کر لینا چاہیے۔

سمرنوف: میں دیوانہ ہو گیا ہوں ____ کچھ سمجھ میں نہیں آتا (پکارتا ہے) کوئی ہے! پانی!

مادام پوپوف: (چلاتی ہے) کہہ رہی ہوں ابھی فیصلہ ہونا چاہیے۔

سمرنوف: میں پاگل بن گیا ہوں۔ ایک لڑکے کی طرح محبت میں گرفتار ہوں ____ بیوقوف کی مانند! (اس کا ہاتھ پکڑتا ہے، وہ چلاتی ہے) میں تم سے محبت کرتا ہوں (گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر) ایسی محبت جو میں نے آج سے پہلے کسی سے نہیں کی ____ بارہ عورتوں کو ٹھکرا چکا ہوں اور نو مجھے ٹھکرا چکی ہیں۔ مگر اب بالکل موم ہوا جا رہا ہوں ____ کھیر کے مانند نرم۔ گھٹنوں کے بل گر کر تمہیں اپنا دل پیش کر رہا ہوں ____ اس قدر غیر مردانہ فعل ہے۔ میں نے مدت سے کسی سے دل نہیں لگایا۔ اس لیے کہ میں حلف اٹھا چکا تھا، مگر یہاں شکست ہوئی جاتی ہے ____ دل پیشِ خدمت ہے۔ بتاؤ۔ ہاں! یا نہیں؟ ____ بہت اچھا نہ سہی (اٹھ کر تیزی سے دروازے کی جانب بڑھتا ہے) اچھا۔

مادام پوپوف: ٹھہرو!

سمرنوف: (ٹھہر کر) کیوں؟

مادام پوپوف: کچھ نہیں ____ جاؤ! مگر خیر ٹھہرو تو ____ نہیں نہیں، جاؤ! میں تم سے متنفر ہوں! ____ نہیں! مت جاؤ! ____ آہ! اگر تمہیں صرف اتنا معلوم ہو کہ میں کس قدر خشم ناک ہوں! (پستول میز پر پھینک دیتی ہے) انگلیاں اس خوفناک چیز کے پکڑنے سے بے حس ہو گئی ہیں (اپنے رومال کو غصے میں پھاڑتی ہے) کھڑے کیوں ہو؟ ____ جاؤ!

سمرنوف: خدا حافظ!

مادام پوپوف: ہاں، ہاں، جاؤ! (بآواز بلند پکارتی ہے) کہاں جا رہے ہو؟ ٹھہرو تو ____ نہیں تم جا سکتے ہو ____ آہ طبیعت کس قدر غصے سے بھری ہے۔ نزدیک مت آنا! میرے نزدیک مت آنا!

سمرنوف: (اس کی طرف جاتے ہوئے) میں اپنے آپ سے کتنا خفا ہوں۔ سکول کے لڑکے کے مانند محبت میں گرفتار ہوں ____ گھٹنوں کے بل گرا تھا ____ یہ خیال مجھے سرد کر دیتا ہے

____ تم سے اس طرح محبت کرتا ہوں جیسے میں واقعی دامِ الفت میں گرفتار ہونا چاہتا تھا! کل مجھے سود کی رقم ادا کرنی ہے ____ گھاس کا موسم شروع ہے اور ان سب چیزوں سے پہلے تمہاری محبت نمودار ہو گئی ہے ____ (اس کی کمر میں بازو ڈالتا ہے) میں اپنے آپ کو ہرگز معاف نہ کروں گا!

مادام پوپوف: (چلاّ کر) چلے جاؤ! اپنے بازو ہٹالو! ____ میں تم سے سخت متنفر ہوں ____ تمہیں دعوت مبارزت ____ قبول کرنا ____ ہوگی (ایک لمبا بوسہ)

(لیوکا کلہاڑی سے مسلح، باغبان کدال پکڑے، گاڑی بان لوہے کا پنجہ تھامے اور مزدور لاٹھیاں اٹھائے داخل ہوتے ہیں)

لیوکا: (دونوں کو بغلگیر دیکھ کر) میرے معبود!!

(ایک وقفہ)

مادام پوپوف: (آنکھیں جھکا کر) لیوکا! اصطبل میں کہہ دینا کہ ٹوبی کو ایک سیر زائد دانہ نہ دیا جائے۔

(پردہ)

☆☆☆☆☆

حاشیہ: ۱: روسی شراب

نسبت

(ایک ایکٹ کا مزاحیہ ڈراما)

افرادِ تمثیل

سٹیپن سٹیپنوخ چبوکوف ———— ایک زمیندار

نٹالیا سٹیپنوفنا ———— اس کی لڑکی (۲۵ سال)

ایفان وسیلوی درخ لوموف ———— چبوکوف کا ہمسایہ زمیندار (ضعفِ قلب میں مبتلا)

تعارف

انیسویں صدی کے آخری چند سالوں تک روس میں کوئی قابلِ ذکر تمثیل نگار موجود نہیں تھا۔ اگر اس زمانے میں چند ڈرامے لکھے بھی گئے تو وہ فنی حیثیت سے بہت کمزور ہیں۔ دراصل اس وقت کے ڈرامانویسوں نے صرف لوگوں کے تفنن طبع کے لئے انسانی زندگی کی کچھ نقلیں رقم کی ہیں جن میں ڈرامائی عناصر کو بالکل دخل نہیں ہے۔

سب سے پہلے لیمن ساف نامی ایک شخص نے چند المیہ ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد سمرد کاف متعدد مزاحیہ والمیہ ڈرامے ضبط تحریر میں لایا مگر وہ فنی اعتبار سے پر از اسقام ہیں۔ اس کے بعد روس کے مایہ ناز شاعر پشکن نے شیکسپئیر کے افکار سے متاثر ہو کر ایک تمثیل لکھی۔ گو قابل مصنف نے اپنے کرداروں کی نفسیات کا بیان کمال فن کاری سے کیا ہے مگر پھر بھی اس کی وہ تصنیف تمثیل نہیں کہلا سکتی۔ وہ ایک تمثیلی نظم ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پشکن ایک اعلیٰ درجے کا تمثیل نگار نہیں بلکہ ایک مستند غنائی شاعر تھا۔ پشکن کے بعد اوسٹروسکی نے

ڈرامے میں حقیقت نگاری کا عنصر داخل کر دیا۔ دراصل حقیقت نما ڈراموں کو روس میں مروج کرنے کا سہرا اُسی کے سر ہے۔ مگر اس نے اپنے بعد کوئی قابل جانشین نہ چھوڑا جو اس کی متعارف صنف کو بامِ رفعت پر پہنچا سکتا۔ اوسٹروسکی کے بعد جو تمثیل نگار بھی پیدا ہوئے وہ بالکل نااہل تھے چنانچہ تمثیل نگاری روس کے مفکر اعظم طالسطائی کے ظہور تک دبی رہی۔

کاؤنٹ لیو طالسطائی نے متعدد کتابیں اور بے شمار مضامین لکھے جو ادبِ حاضرہ میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ اس نے چند بلند پایہ ڈرامے بھی سپردِ قلم کیے جو حلقہ ادب میں بہت مقبول ہوئے۔

طالسطائی کے تین ڈرامے سٹیج ہو چکے ہیں۔ اُس کا نصب العین کسانوں کی قابل رحم حالت کی عکاسی کرنا اور انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنا ہے۔

روسی ڈرامے میں پہلا انقلاب چیخوف کی پہلی تمثیل ''سی گل'' سے پیدا ہوا۔

چیخوف شاید تمثیل نگاری کی طرف کبھی توجہ نہ کرتا اگر وہ ایک پراز اسقام ڈرامے کو نہ دیکھتا۔ چیخوف اس ڈرامے کے عیوب کو برداشت نہ کر سکا۔ آخر اس تکدر نے اس کی عنانِ توجہ تمثیل نگاری کی طرف مبذول کر دی اور اس نے کچھ عرصے کے بعد ''آن دی ہائی روڈ'' نامی ایک ڈراما سپرد قلم کیا مگر وہ چند وجوہ کی بنا پر سٹیج نہ ہو سکا۔ چیخوف نے ہمت نہ ہاری اور جلد ہی ''ایوانوف'' کے عنوان سے ایک ڈراما سٹیج کے لیے پیش کیا۔

گو ''ایوانوف'' کو سٹیج پر کافی مقبولیت حاصل ہوئی مگر در حقیقت یہ تمثیل جملہ خوبیوں کی حامل نہ تھی۔ یہ صرف چیخوف کی ابتدا تھی۔

اپنے ڈرامے کی مقبولیت دیکھ کر چیخوف نے فوراً ہی ایک اور تمثیل لکھنا شروع کر دی مگر اُس کے متعلق حوصلہ شکن تبصرے دیکھ کر اُس نے اُسے وہیں کا وہیں رہنے دیا اور کچھ عرصے کے لیے متین و سنجیدہ تمثیل نگاری سے کنارہ کش ہو کر چند ایک ایکٹ کی کامیڈیاں لکھیں جن میں ''ریچھ'' اور ''نسبت'' بہت مشہور ہیں۔

یہ ایک ایکٹ کے ڈرامے چیخوف کے مخصوص مزاحیہ رنگ اور ظرافت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ابھی تک مختلف سٹیجوں پر کھیلے جا رہے ہیں۔

۱۸۹۶ء میں چیخوف نے ایک بار پھر سنجیدہ تمثیل نگاری کی طرف توجہ دی اور ایک ڈراما ''سی

گل'' کے نام سے لکھا اس کے بعد ''انکل وینیا''، ''چیری اور چرڈ'' اور ''تھری سسٹرز'' شائع ہوئے اور سٹیج پر خوب چمکے۔

۴- جولائی ۱۹۰۴ء کو اس باکمال انسان نے موضع بیڈن ویلر میں وفات پائی اور ماسکو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ (مترجم)

(منظر: چبوکوف کے مکان کا ملاقاتی کمرہ۔ چبوکوف اور لوموف، موخرالذکر شام کا لباس پہنے داخل ہوتا ہے)

چبوکوف: (استقبال کے لیے اٹھ کر) آنکھیں کسے دیکھ رہی ہیں؟ آہا! یہ تو لوموف صاحب ہیں۔ زہے نصیب (ہاتھ ملاتا ہے) میری جان یہ ملاقات تو واقعی حیرت خیز ہے....... کہو کیسے ہو؟

لوموف: نوازش! فرمائیے آپ تو بخیریت ہیں؟

چبوکوف: شکر ہے! تمہاری دعا سے اچھی گزر رہی ہے۔ بیٹھو نا!——یہ کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ تم اپنے ہمسائیوں کو بھول جاتے ہو —— مگر عزیز من اس تکلف کے کیا معنی؟ نیا کوٹ، سفید دستانے اور علیٰ ہذالقیاس! کیا کسی سے ملنے جا رہے ہو میری جان؟

لوموف: نہیں، میں صرف آپ ہی سے ملنے آیا ہوں۔

چبوکوف: تو پھر اس نئے کوٹ کے کیا معنی میرے ساحر؟——عید کا دن تھوڑا ہی ہے آج!

لوموف: دیکھیے معاملہ یوں ہے۔ میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اس سے قبل میں نے بارہا آپ سے مدد طلب کی ہے اور آپ نے ہمیشہ——معاف فرمائیے میں کچھ گھبرا سا گیا ہوں۔ تھوڑا سا پانی پلا دیجیے۔ (پانی پیتا ہے)

چبوکوف: (اپنے آپ سے) ضرور قرض مانگنے آیا ہو گا مگر میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں گا۔ (لوموف سے مخاطب ہو کر) ہاں ہاں کہو؟

لوموف: بات یہ ہے معزز سٹیپیو وخ نہیں! نہیں سٹیپن مغرز وخ ——دیکھیے، میں کس قدر گھبرا گیا ہوں۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ آپ کے سوا میری اور کوئی مدد نہیں کر سکتا گو میں اس کا حقدار نہیں ہوں اور جرأت نہیں کر سکتا کہ آپ سے مدد طلب کروں۔

چبوکوف: اب بات کو بڑھاتے مت جاؤ پیارے، کہو اصل مطلب کیا ہے؟

لوموف: لیجیے ابھی کہتا ہوں۔ ابھی!——— بات یہ ہے کہ میں آپ کی لڑکی نتالیا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

چبوکوف: (خوش ہو کر) تم شریر لڑکے! کہو نا اسے پھر! میں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں کرتا۔

لوموف: میں آپ کی لڑکی کے ساتھ عقد کرنے کا فخر ....

چبوکوف: (بات کاٹ کر) میرے عزیز! میں بہت خوش ہوا ہوں اور علیٰ ہذا القیاس۔ ہاں بہت خوش اور علیٰ ہذا القیاس! (بغلگیر ہوتا ہے اور اُسے چومتا ہے) میں تو اس سعید ساعت کا ایک زمانے سے منتظر تھا۔ یہ میری دلی خواہش تھی (ایک آنسو بہاتا ہے) اور میں نے تمھیں ہمیشہ اپنے بچے کی طرح محبت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ خدا تم دونوں کو خوش و خرم رکھے اور علیٰ ہذا القیاس۔ میری یہ دلی تمنا رہی ہے......... آخر میں یہاں بانس کی طرح کیوں گڑ گیا ہوں؟ خوشی نے مجھے دیوانہ سا بنا دیا ہے۔ میں نتاشا کو بلاتا ہوں اور علیٰ ہذا القیاس!

لوموف: معزز سٹیپن آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا وہ مجھے قبول کر لے گی؟

چبوکوف: تم ایسا حسین ہو اور وہ انکار کر دے! وہ تو پہلے ہی بلی کی مانند محبت میں گرفتار ہونا چاہتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس......... ابھی آیا (چلا جاتا ہے)

لوموف: مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ سر سے پیر تک کانپ رہا ہوں گویا کسی کڑے امتحان کا سامنا ہے۔ سب سے بڑی بات دل کو مضبوط بنانا ہے۔ اگر کوئی شخص بہت عرصے تک جھجکتا رہے۔ معاملے کو طول دیتا جائے۔ حقیقی محبت کا منتظر رہے تو یقینی امر ہے کہ وہ عمر بھر کنوارا رہے گا——— ارر! واقعی سردی محسوس ہو رہی ہے۔ نتالیا خانہ داری سے اچھی طرح واقف ہے۔ شکل بھی بری نہیں۔ تعلیم یافتہ ہے۔ اس سے زیادہ میں اور کیا چاہتا ہوں؟——— مگر دماغ میں یہ کھٹ کھٹ کیسی ہو رہی ہے۔ میں سخت گھبرا گیا ہوں (پانی پیتا ہے) شادی ضرور ہونی چاہیے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ میری عمر پینتیس برس کی ہے۔ کافی عمر ہے! اس کے علاوہ مجھے منظم اور باقاعدہ زندگی کی ضرورت ہے...... میں ضعفِ قلب کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ طبیعت بہت جلد بگڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر لب اس وقت لرز رہے ہیں اور داہنی آنکھ پھڑک رہی ہے...... مگر سب سے زیادہ تکلیف تو سوتے وقت ہوتی ہے۔ بس بستر پر لیٹو، ذرا آنکھ لگے تو سر، شانوں اور پسلیوں میں شدت کا درد شروع ہو جاتا ہے...... میں بستر پر دیوانوں کی طرح کروٹیں لیتا ہوں۔ تمام

شب یہی سلسلہ جاری رہتا ہے!.........

(نٹالیا داخل ہوتی ہے)

نٹالیا: آہا! یہ تو تم ہو! ابا کہہ رہے تھے کہ کوئی شخص ہل خریدنے آیا ہے۔ کہو کیا حال ہے؟

لوموف: شکر ہے! فرمایئے آپ کی طبیعت تو اچھی ہے؟

نٹالیا: کیا وجہ ہے کہ تم اتنا عرصہ ہم سے ملنے نہیں آئے؟ بیٹھو نا! (بیٹھ جاتے ہیں) کھانا وانا تو کھاؤ گے؟

لوموف: نوازش! میں ابھی کھا کر ہی آرہا ہوں۔

نٹالیا: سگریٹ تو پیو؟—— یہ رہی دیا سلائی—— بہت پیارا دن ہے مگر کل بارش کی وجہ سے زمین پر کوئی آدمی کام نہیں کر سکا۔ تم لوگوں نے گھاس کے کئے گٹھے تیار کر لیے ہیں؟ ذرا خیال کرو نا کہ میں نے جلدی میں تمام کھیت سے گھاس کٹوا ڈالی اور اب کفِ افسوس ملتی ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے گھاس ضرور گل سڑ جائے گی—— مگر یہ کیا؟ میری آنکھیں نیا کوٹ دیکھ رہی ہیں! خوب ہے! کہیں ناچ وغیرہ میں تو شامل نہیں ہو رہے ہو اس کے علاوہ تم آج بہت بھلے معلوم ہو رہے ہو........... آخر اس تکلف کے کیا معنی؟

لوموف: (گھبرائے ہوئے) محترمہ نٹالیا بات یوں ہے.... یعنی حقیقت یہ ہے، میں نے آپ سے یہ درخواست کرنے کا تہیہ کر لیا ہے کہ آپ میری بات کو بغور سنیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ضرور حیران ہوں گی اور خفا بھی مگر میں........ کس قدر سردی ہے!

نٹالیا: کہو کیا ہے؟ (ایک وقفہ) ہاں؟

لوموف: میں اختصار سے کام لینے کی سعی کروں گا آپ شاید اس امر سے غافل نہیں کہ میں بچپن ہی سے آپ کے خاندان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میری مرحوم چچی اور اس کا خاوند جن سے مجھے یہ جائداد ورثے میں ملی ہے آپ کے باپ اور آپ کی مرحوم والدہ کو بہت عزت کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ چبوکوف اور لوموف خاندانوں میں ہمیشہ سے خوشگوار تعلقات قائم رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا میری زمین آپ کی زمین کے بالکل قریب واقع ہے۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ میرے ولوفی نامی مرغزار آپ کے کھیت کی باڑ کے عین ساتھ ہی ملحق ہیں۔

نٹالیا: قطع کلام معاف۔ تم نے کہا ہے "میرے ولوفی نامی مرغزار——" .... مگر وہ کیا تمہارے ہیں؟

لوموف: ہاں ہاں!

نٹالیا: خوب! وہ مرغزار ہمارے ہیں نہ کہ تمہارے!

لوموف: محترمہ نٹالیا! آپ غلطی پر ہیں وہ میری ہی ملکیت ہیں۔

نٹالیا: یہ بھی ایک ہی کہی۔ اچھا یہ تو بتاؤ وہ تمہارے ہوئے کس طرح؟

لوموف: وہ میرے کس طرح ہوئے؟ میں ان مرغزاروں کا ذکر کر رہا ہوں جو آپ کے کھیت کے عین ساتھ واقع ہیں۔

نٹالیا: بالکل درست، وہی مرغزار تو ہماری ملکیت ہیں۔

لوموف: نہیں آپ غلطی پر ہیں محترمہ نٹالیا! وہ میرے ہیں۔

نٹالیا: کہنے سے پیشتر سوچ لو۔ کیا وہ ایک عرصے سے تمہاری ملکیت رہے ہیں؟

لوموف: ایک عرصہ کہنے سے آپ کا مطلب؟ جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے وہ ہمیشہ ہمارے قبضے میں ہی رہے ہیں۔

نٹالیا: نہیں تم غلطی پر ہو۔

لوموف: مگر اس کے ثبوت کے لیے عدالتی کاغذات موجود ہیں محترمہ نٹالیا! کسی زمانے میں ان مرغزاروں کا تنازع ضرور تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے مگر اب ہر فرد بشر کو معلوم ہے کہ وہ میرے ہیں اور اس میں کسی جھگڑے کی گنجائش ہی نہیں۔ ذرا خیال تو کیجیے...... میری چچی کے دادا نے یہ زمین آپ کے والد کے دادا کے ہاں کام کرنے والے کسانوں کو ایک غیر معین عرصے کے لیے بغیر کسی کرایہ کے دے رکھی تھی۔ چالیس سال تک یہ زمین اُن کسانوں کے پاس رہی۔ چنانچہ وہ اسے اپنی ہی ملکیت سمجھنے لگے مگر جب غلاموں کی آزادی کے بعد فیصلہ ہوا تو..........

نٹالیا: تمہارا یہ قول غلط ہے! میرا دادا اور اس کا باپ دونوں اپنی زمین کو دلدل تک خیال کرتے رہے ہیں۔ اس لیے یقینی طور پر ولوفی نامی مرغزار ہمارے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے متعلق جھگڑا کرنے کی گنجائش ہی کہاں ہے۔ یہ گفتگو واقعی بہت تکلیف دہ ہے۔

لوموف: نٹالیا سٹیپنوفنا میں آپ کو کاغذات دکھا سکتا ہوں۔

نٹالیا: نہیں تم صرف مذاق سے یا ستانے کے لیے ایسا کہہ رہے ہو...... اچھا مذاق ہے۔ ہم ایک زمین پر تین سو سال تک قابض رہتے ہیں اور یک لخت ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمین ہماری نہیں!

معاف کرنا مگر میں واقعی اپنی سماعت پر یقین نہیں کر رہی .... مجھے مرغزاروں کی کوئی پروا نہیں۔ وہ پندرہ ایکڑوں سے کیا زیادہ ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی قیمت بھی تین سو روبل کے قریب ہے۔ مجھے اگر غصہ ہے تو اس ناانصافی پر۔ تمہارے جی میں جو آئے کہو مگر میں یہ ناانصافی برداشت نہیں کر سکتی!

لوموف: ذرا سنیئے تو سہی۔ میں درخواست کرتا ہوں۔ آپ کے والد کے دادا جیسا کہ میں اس سے قبل بیان کرنے کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ میری چچی کے لیے اینٹیں بنایا کرتے تھے۔ میری چچی کی والدہ نے یہ چاہتے ہوئے کہ اُن کے لیے جواب میں کچھ کیا جائے ....

نٹالیا: دادا، دادی، چچی ——— اس گفتگو کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مرغزار ہمارے ہیں اور بس!

لوموف: وہ میرے ہیں۔

نٹالیا: وہ ہمارے ہیں۔ اگر تم دو دن تک بھی بحث کرتے رہو اور ایسے پندرہ بڑے کوٹ پہن کر آؤ تو بھی وہ ہمارے ہیں۔ ہمارے، ہمارے!....... میں تمہاری چیز پر قابض ہونا نہیں چاہتی مگر اس کے ساتھ ہی اپنی مملوکہ چیز بھی ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتی۔ اب تم اسے جس طرح چاہو سمجھ لو!

لوموف: مجھے اس زمین کا کوئی خیال نہیں ہے مگر یہ تو اصول کی بات ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں اسے آپ کی خدمت میں تحفتاً پیش کر سکتا ہوں۔

نٹالیا: زمین میری ہے اس لیے میں تحفے کے طور پر پیش کر سکتی ہوں۔ مگر یہ کس قدر تعجب خیز ہے۔ اب تک ہم تمہیں اپنا اچھا ہمسایہ تصور کرتے رہے ہیں۔ بلکہ ایک دوست۔ پچھلے سال ہم نے تمہیں اپنی دانہ نکالنے کی مشین مستعار دی تھی اور اس طرح ہم اپنا کام نومبر تک ختم نہ کر سکے اور اب تم ہو کہ ہمارے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہو جیسے ہم جنگلی ہوں۔ زمین کا تحفہ پیش کرو گے! معاف کرنا یہ ہمسائیگی نہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ طرزِ عمل بہت گستاخانہ ہے..........

لوموف: تو پھر گویا میں غاصب ہوا؟ مادام میں نے آج تک کسی غیر کی زمین نہیں چھینی اور نہ میں کسی کو اجازت دے سکتا ہوں کہ وہ میرے متعلق اس قسم کے الزام تراشے .... (صراحی کے پاس جا کر پانی پیتا ہے) ولوفی نامی مرغزار میرے ہیں۔

نٹالیا: بالکل غلط، وہ ہمارے ہیں!

لوموف: وہ میرے ہیں!

نٹالیا: یہ غلط ہے۔ میں اسے ثابت کردوں گی۔ میں آج ہی وہاں گھسیارے بھیج دیتی ہوں کہ وہ اس زمین کی گھاس کاٹنا شروع کردیں۔

لوموف: کیا؟

نٹالیا: ہمارے مزدور آج وہاں ہوں گے۔

لوموف: میں انہیں دھکے دے کر باہر نکال دوں گا۔

نٹالیا: یہ جرأت!

لوموف: (دل کے مقام پر ہاتھ رکھتا ہے) ولوفی نامی مرغزار میرے ہیں۔ سمجھتی ہو؟ میرے!

نٹالیا: ازراہِ عنایت شور مت مچاؤ! اگر چاہو تو یہ شور اور غصے کا اظہار اپنے مکان پر کر سکتے ہو مگر میں درخواست کرتی ہوں کہ یہاں حدودِ اخلاق سے تجاوز نہ کرو۔

لوموف: مادام! اگر میں دل کی اس ملعون دھڑکن اور کنپٹیوں کی کھڑکھڑاہٹ میں مبتلا نہ ہوتا تو میں آپ سے بہت مختلف طریق پر گفتگو کرتا۔ (چلاتا ہے) ولوفی نامی مرغزار میرے ہیں!

نٹالیا: ہمارے!

لوموف: میرے!

نٹالیا: میرے!

[چبوکوف داخل ہوتا ہے]

چبوکوف: یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم لوگوں نے؟

نٹالیا: ابا ذرا آپ اس شخص پر واضح کردیں کہ ولوفی نامی مرغزار کس کی ملکیت ہیں۔ ہماری یا اس کی؟

چبوکوف: (لوموف سے) میرے بچے مرغزار ہمارے ہیں۔

لوموف: مگر سٹیپن سٹیپیوورخ وہ آپ کے کس طرح ہوئے۔ ذرا آپ غور تو کیجیے۔ میری چچی کی دادی نے آپ کے دادا کے کسانوں کو زمین بغیر کسی کرایہ کے دے رکھی تھی۔ کسان چالیس سال تک اس زمین کو استعمال کرتے رہے اور اس طرح اسے اپنی ملک سمجھنے لگے مگر جب یہ فیصلہ ہوا..........

چبوکوف: ٹھہرو۔ عزیز من...... تم بھول گئے ہو۔ کسان اس وجہ سے تمہاری دادی کو کرایہ نہیں ادا کرتے تھے کہ زمین کی ملکیت کا تنازع تھا اور علیٰ ہذا القیاس......... اور اب شہر کا ہر کتا جانتا ہے

کہ وہ ہمارے ہیں۔ شاید تم نے نقشہ نہیں دیکھا۔

لوموف: میں یہ ثابت کر دوں گا کہ وہ میرے ہیں۔

چبوکوف: میرے بچے تم یہ کبھی نہیں کر سکتے۔

لوموف: نہیں میں ضرور ثابت کروں گا۔

چبوکوف: مگر یہ شور کیوں میری جان؟ تم شور مچانے سے کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ میں تمہاری چیز پر قابض ہونا نہیں چاہتا اور نہ اپنی مملوکہ شے ہاتھ سے کھونا چاہتا ہوں اور میں ایسا کروں بھی کیوں؟ اگر تم ان مرغزاروں کے متعلق کوئی جھگڑا کرنا چاہتے ہو تو میں انہیں تمہیں دینے کی بجائے کسانوں کے حوالے کر دوں گا اور میں کروں گا بھی یہی! اور علی ہذا القیاس۔

لوموف: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کسی غیر کی چیز کو دوسرے کے حوالے کر دینے کا کیا حق حاصل ہے؟

چبوکوف: حق ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے علاوہ میں تخاطب کے اس لہجے کو سننے کا عادی نہیں ہوں اور علی ہذا القیاس۔ میں تم سے عمر میں دوگنا بڑا ہوں اس لیے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ جوش کے بغیر گفتگو کرو۔

لوموف: کیوں؟ تم تو مجھے ایک بیوقوف سمجھ کر مضحکہ اڑا رہے ہو! میری زمین کو اپنی ملکیت بتاتے ہو اور پھر مجھ سے یہ توقع کہ میں جوش میں نہ آؤں اور تمہارے ساتھ اچھی طرح گفتگو کروں! سٹیپن یہ طرزِ عمل اچھے ہمسایوں کا سا نہیں۔ تم ہمسایہ نہیں ہو بلکہ غاصب!

چبوکوف: کیا؟ کیا کہا؟

نٹالیا: ابا گھاس کاٹنے کے لیے ان مرغزاروں پر ابھی اپنے آدمی بھیج دو۔

چبوکوف: (لوموف سے) جناب آپ نے کیا کہا تھا؟

نٹالیا: ولوفی نامی مرغزار ہمارے ہیں اور میں انہیں ہرگز جدا نہیں کر سکتی۔ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں۔

لوموف: دیکھا جائے گا۔ میں عدالت میں ثابت کر دوں گا کہ وہ میرے ہیں۔

چبوکوف: عدالت میں؟ جناب آپ عدالت میں بخوشی جا سکتے ہیں اور علی ہذا القیاس...... تم تو عدالت میں جانے کے لیے صرف ایک موقع کی تلاش میں ہو...... حقیر پیشہ! تمہارا خاندان کا خاندان مقدمہ بازی کا مشتاق تھا۔ ہر ایک فرد!

لوموف: از رہ عنایت میرے خاندان کی ہتک مت کرو۔ لوموف خاندان ہمیشہ ایماندار رہا ہے اور ان میں سے کسی ایک نے بھی تمہارے چچا کی طرح روپیہ غبن کرنے کے سلسلے میں عدالت کا منہ نہیں دیکھا ہے۔

چبوکوف: تم لوموف تو سب کے سب پاگل تھے!

نٹالیا: ہر ایک.......... ہر ایک!

چبوکوف: تمہارا دادا مانا ہوا شرابی تھا اور تمہاری چچی منٹاسیا ایک مستری کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور اسی طرح کئی اور مثالیں ہیں۔

لوموف: اور تمہاری ماں کبڑی تھی (دل پکڑ کر)...... پہلو میں سخت درد ہو رہا ہے!........ سر میں خون دوڑا آیا ہے....... میرے مرشد!......... پانی!

چبوکوف: تمہارا باپ پیٹو اور قمار باز تھا۔

نٹالیا: اور تمہاری چچی ایسی اور کوئی جھگڑالو عورت نہ تھی۔

لوموف: بائیں ٹانگ سوگئی ہے...... اور تم دغا باز ہو!........ آہ میرا دل!....... اور یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں کہ الیکشن کے بعد تم....... آنکھوں کے سامنے شرارے اڑ رہے ہیں.......... میری ٹوپی کہاں ہے؟

نٹالیا: یہ کمینہ پن! بے ایمانی! تکلیف دہ!

چبوکوف: اور تم خود افترا پرداز، دغا باز اور شریر ہو۔ ہاں شریر!

لوموف: یہ رہی میری ٹوپی........ ہائے میرا دل!...... کس راستے سے باہر جاؤں؟ دروازہ کدھر ہے؟ آہ! میں مر رہا ہوں۔ ٹانگ بیکار ہوگئی ہے (دروازے کی طرف جاتا ہے)

چبوکوف: (اس کو جاتے دیکھ کر کہتا ہے) خبردار پھر کبھی میرے دروازے پر قدم نہ رکھنا۔

نٹالیا: جاؤ عدالت میں جاؤ! دیکھا جائے گا!

[لوموف لڑکھڑاتا ہوا باہر چلا جاتا ہے)

نٹالیا: بیہودہ! اب اچھے ہمسایوں پر کیونکر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟

چبوکوف: کمینہ ذلیل!

نٹالیا: دوسروں کی زمین غصب کرتا ہے اور پھر انہیں گالیاں دیتا ہے۔

چبوکوف: اوراس بدھو، آنکھ کے روگ نے اس منہ سے عقد کرنے کی اجازت طلب کی تھی؟ ذرا خیال تو کرو عقد کرتا ہے۔

نٹالیا: کیسا عقد؟

چبوکوف: اجی وہ تم سے نسبت کرنے کا طلبگار تھا نا!

نٹالیا: نسبت؟ مجھ سے؟ مگر تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟

چبوکوف: اور یہ نیا کوٹ اسی لیے پہن کر آیا تھا! ذلیل! بونا!

نٹالیا: مجھ سے نسبت! آہ! (ایک کرسی پر گر کر رونا شروع کر دیتی ہے) اسے واپس بلاؤ! اسے واپس بلاؤ! آہ! اسے واپس بلاؤ!

چبوکوف: کسے واپس بلاؤں؟

نٹالیا: جلدی کرو۔ جلدی کرو! میں بے ہوش ہو رہی ہوں، اُسے واپس بلاؤ! (غش کھاتی ہے)

چبوکوف: یہ کیا۔ کیا معاملہ ہے؟ (اپنا سر پکڑتا ہے) یہ بھی زندگی ہے! میں گولی مار کر خودکشی کرلوں گا یا اپنا گلا گھونٹ کر مر جاؤں گا اور علی ہذا القیاس۔

نٹالیا: میں مر رہی ہوں اُسے جلد واپس بلاؤ!

چبوکوف: اف! ابھی جاتا ہوں۔ چلاؤ مت (دوڑتا ہے)

نٹالیا: (اکیلی بڑبڑاتی ہے) یہ ہم نے کیا کیا! اُسے جلد واپس لاؤ! جلد واپس لاؤ!

چبوکوف: (دوڑتا ہوا اندر آتا ہے) وہ ابھی آتا ہے اور علی ہذا القیاس۔ لعنت ہو اس پر! اف! تم خود ہی اُس سے گفتگو کرنا۔ میں کچھ نہ کہوں گا..........

نٹالیا: اُسے واپس بلاؤ!

چبوکوف: (بلند آواز میں) میں کہتا ہوں وہ آرہا ہے! آہ میرے اللہ ایک نوجوان لڑکی کا باپ ہونا بھی کیسی مصیبت ہے! میں اپنا گلا کاٹ ڈالوں گا۔ واقعی گلا کاٹ ڈالوں گا! ہم نے اس شخص کو گالیاں دی ہیں۔ شرمندہ کیا ہے۔ ٹھوکر مار کر باہر نکال دیا ہے——— یہ سب تمہارے کرتوت ہیں۔ تمہارے کرتوت!

نٹالیا: نہیں یہ تمہارا قصور ہے!

چبوکوف: اچھا یہ میرا قصور ہے (لوموف دروازے کے قریب ظاہر ہوتا ہے) اچھا اب تم خود ہی اس سے

گفتگو کرو (چلا جاتا ہے)

[لوموف پریشانی کی حالت میں داخل ہوتا ہے]

لوموف: دل کس قدر تیزی سے دھڑک رہا ہے! ٹانگ سو رہی ہے۔ پہلو میں درد ہے.........

نٹالیا: معاف کر دینا۔ ہم نے بہت جلدی کی ہے۔ ولوفی نامی مرغزار واقعی تمہارے ہیں۔

لوموف: دل خوفناک طریق پر دھڑک رہا ہے ...... مرغزار میرے ہیں ...... دونوں آنکھیں

...... پھڑک رہی ہیں۔

نٹالیا: ہاں۔ تمہارے ہی ہیں۔ بیٹھ جاؤ نا! (دونوں بیٹھ جاتے ہیں) ہم غلطی پر تھے۔

لوموف: میں اصول کی بات کر رہا تھا........ مجھے زمین کی چنداں پروا نہیں مگر اصول کا ضرور پابند

ہوں.............

نٹالیا: بالکل درست......... آؤ اب کوئی اور بات کریں۔

لوموف: خصوصاً میرے پاس ثبوت موجود ہے۔ میری چچی کی دادی نے تمہارے باپ کے دادا کے

کسانوں کو____

نٹالیا: بس۔ بس اب یہاں تک ہی کافی ہے ...... (اپنے آپ سے) معلوم نہیں اب گفتگو کس طرح

شروع کروں (لوموف سے) شکار کو کب جا رہے ہو؟

لوموف: فصل کے بعد پرندوں کا شکار کھیلنے کا ارادہ ہے۔ محترمہ نٹالیا اور ہاں کیا آپ نے سنا نہیں؟

ذرا تو خیال کیجیے کہ یہ امر میرے لیے کس قدر بدقسمتی کا موجب ہے۔ میرا ٹریکر جسے آپ شاید جانتی ہیں

لنگڑا ہو گیا ہے۔

نٹالیا: بہت افسوس ہے! مگر یہ ہوا کس طرح؟

لوموف: معلوم نہیں...... جوڑ وغیرہ ہل گیا ہوگا اپنی جگہ سے یا شاید کسی اور کتے نے کاٹ کھایا ہو......

(آہ بھرتا ہے) میرا سب سے اچھا کتا! اس روپے کے ذکر کو تو چھوڑیے جو میں نے اس پر خرچ کیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اسے مرنوف سے ایک سو پچیس روبل میں خریدا تھا۔

نٹالیا: یہ بہت زیادہ قیمت تھی ایفان!

لوموف: مگر میری نظر میں تو سودا بہت سستا تھا۔ وہ بہت عمدہ کتا ہے۔

نٹالیا: ابا نے اپنا بیکر پچاسی روبل میں خریدا تھا اور بیکر تمہارے ٹریکر سے کہیں اچھا ہے۔

لوموف: بیکر، ٹریکر سے اچھا! کیسی عجیب بات ہے (ہنستا ہے) بیکر، ٹریکر سے اچھا ہے!

نتالیا: ہاں، ہاں وہ بہتر ہے۔ یہ سچ ہے کہ بیکر ابھی کم عمر ہے اور پورا جوان نہیں ——— مگر مستعدی کے لحاظ سے والن چِشکی کے پاس بھی اس کے مقابلے کا کوئی کتا موجود نہیں ہے۔

لوموف: معاف کیجیے، مگر آپ بھول رہی ہیں کہ آپ کے کتے کا جبڑا چپٹا ہے اور چپٹے جبڑے والا کتا کسی لحاظ سے بھی شکار کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔

نتالیا: چپٹا جبڑا! یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے ایسا سنا ہے۔

لوموف: میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کا نیچے کا جبڑا اوپر والے سے بہت چھوٹا ہے۔

نتالیا: مگر تم نے پیمائش کی ہے کیا؟

لوموف: ہاں، وہ دوڑ کے لیے بہت موزوں ہے اس میں کوئی شک نہیں، مگر شکار میں اچھا ثابت نہیں ہو سکتا۔

نتالیا: اول تو ہمارا بیکر اصیل ہے، ہارنس اور چزل کا بچہ مگر تم تو یہ بھی بتا نہیں سکتے کہ تمہارا دھبے دار کتا کس ذات سے ہے......... اس کے علاوہ وہ کسی مریل گھوڑے کے مانند بوڑھا اور بدصورت ہے۔

لوموف: وہ بوڑھا ہے مگر میں تو اسے تمہارے ایسے بیس بیکروں کے عوض بھی ہرگز جدا نہیں کروں گا..... اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ ٹریکر ایک کتا ہے اور بیکر..... اس کے متعلق تو کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ہر شکاری کے پاس تمہارے ایسے بیسیوں بیکر موجود ہیں۔ اس کی قیمت پچیس روبل ٹھیک ہے۔

نتالیا: آج تو تم پر غلط فہمی کا بھوت سوار ہے ایفان۔ پہلے تم مرغزاروں کو اپنی ملکیت بناتے ہو اور پھر یہ کہتے ہو کہ تمہارا ٹریکر ہمارے بیکر سے اچھا ہے۔ میں کسی شخص کی بے سوچی سمجھی گفتگو کو پسند نہیں کرتی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا بیکر تمہارے ایک سو...... فضول ٹریکروں سے بدرجہا بہتر ہے تو پھر اس کے خلاف کہنے کا مطلب؟

لوموف: نتالیا! مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے بیوقوف یا اندھا سمجھ رہی ہو۔ مان لو کہ تمہارا بیکر چپٹے جبڑے والا ہے۔

نتالیا: یہ درست نہیں!

لوموف: یہ درست ہے۔

نتالیا: (چلا کر) یہ غلط ہے!

لوموف: مگر آپ چلا کیوں رہی ہیں مادام؟

نٹالیا: تم فضول باتیں کیوں کر رہے ہو؟ یہ بہت تکلیف دہ ہے! تمہارا اٹریکر تو اس وقت تک گولی کا نشانہ بن جانا چاہیے تھا——اور تم اسے بیکر کے مقابلے میں پیش کر رہے ہو؟

لوموف: معاف کیجیے اب میں اس بحث کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔

نٹالیا: میں نے دیکھا ہے کہ مرد عموماً شکار کے متعلق گفتگو کرتے ہیں حالانکہ ان کو کچھ علم ہی نہیں ہوتا۔

لوموف: مادام! از راہ عنایت خاموش رہیے گا۔ میرا دل پھٹا جا رہا ہے (چلا کر) خاموش رہو!

نٹالیا: میں اس وقت تک خاموش نہیں رہوں گی جب تک تم یہ مان نہ لو کہ بیکر تمہارے ٹریکر سے ہزار درجے بہتر ہے۔

لوموف: ہزار درجے فضول! تمہارے بیکر پر طاعون! ہائے میری کنپٹیاں .... میری آنکھیں...... شانہ......

نٹالیا: تمہارے ناکارہ ٹریکر کے لیے طاعون کی کیا ضرورت ہے....... وہ پہلے ہی مردہ کے برابر ہے۔

لوموف: (روتے ہوئے) خاموش! میرا دل پھٹ رہا ہے!

نٹالیا: میں چپ نہیں ہوں گی۔

[چبوکوف داخل ہوتا ہے]

چبوکوف: (اندر داخل ہوتے ہوئے) اب کیا معاملہ ہے؟

نٹالیا: ابا سچ سچ کہو کون سا کتا اچھا ہے۔ ہمارا بیکر یا اس کا ٹریکر؟

لوموف: سٹیپن میں آپ سے صرف ایک بات دریافت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کیا آپ کے بیکر کا جبڑا اچپٹا نہیں ہے؟ بس! ہاں یا نہیں؟

چبوکوف: اگر ہو تو کیا؟ یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بہر حال صوبے بھر میں ہمارے بیکر سے بڑھ کر اور کوئی کتا نہیں ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔

لوموف: لیکن میرا ٹریکر سب سے اچھا ہے۔ کیوں نہیں؟ ایمانداری سے کہیے!

چبوکوف: جوش میں مت آؤ میری جان، تمہارے ٹریکر میں واقعی چند صفات موجود ہیں...... وہ اچھی نسل کا ہے، ٹانگیں خوب ہیں۔ اچھا پلا ہوا ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔ مگر عزیز من اس میں دو بہت بڑے نقص ہیں۔ وہ بوڑھا ہے اور اس کی ناک بہت بدنما ہے۔

لوموف: معاف کیجیے میں ضعف قلب کے دورے میں مبتلا ہوں .... ہمیں حقائق دیکھنے چاہئیں........ اگر آپ یاد فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مارو سکن کے ہاں میرے ٹریکر نے کاؤنٹ کے سونگر کا پورا مقابلہ کیا تھا جب کہ آپ کا بیکر وہاں سے نصف میل کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

چبوکوف: اس لیے کہ کاؤنٹ کے شکاری نے اُسے چابک سے پیچھے ہٹا دیا تھا۔

لوموف: اور وہ اس کا حقدار بھی تھا۔ باقی تمام کتے تو لومڑی کا پیچھا کر رہے تھے اور بیکر نے ایک بھیڑ کو دبوچ لیا۔

چبوکوف: یہ غلط ہے! .... پیارے میں گرم مزاج ہوں اس لیے گفتگو کو یہیں بند کر دو۔ اُس نے اُسے چابک سے مارا تھا اس لیے کہ ہر شخص ایک دوسرے کے کتے سے حسد کیا کرتا ہے...... ہاں وہ سب حاسد ہیں اور جناب آپ بھی اس الزام سے بری نہیں۔ مثال کے طور پر جونہی تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا کتا تمہارے ٹریکر سے بہتر ہے تو تم یہ اور وہ سنانا شروع کر دیتے ہو اور علی ہذا القیاس مجھے معلوم ہے!

لوموف: یہ مجھے بھی معلوم ہے۔

چبوکوف: (چڑاتے ہوئے) ''یہ مجھے بھی معلوم ہے'' اور تمہیں کیا معلوم ہے؟

لوموف: ضعفِ قلب! .... میری ٹانگ بے حس ہو رہی ہے۔ میں ....

نٹالیا: (اس کی نقل اتارتے ہوئے) ''ضعفِ قلب!'' اچھے شکاری ہو! تمہیں تو لومڑی کا شکار کرنے کے بجائے باورچی خانے میں چولھے کے پاس بیٹھا رہنا چاہیے۔ ضعفِ قلب!

چبوکوف: ہاں تم اچھے شکاری ہو۔ واقعی بہت اچھے! زین پر سوار ہونے کے بجائے تمہیں ضعفِ قلب کے ساتھ اپنے گھر پر ہی ٹھہرنا چاہیے۔ تمہارے لیے شکار کھیلنا یا نہ کھیلنا ایک ہی بات ہے۔ تم تو دوسروں کے کتوں پر جھگڑا مول لیتے ہو۔ میں گرم مزاج ہوں۔ ہمیں گفتگو یہیں بند کر دینی چاہیے۔ تم بالکل شکاری نہیں ہو! اور علی ہذا القیاس۔

لوموف: اور تم ـــــ تم شکاری ہو؟ تم تو شکار کھیلنے صرف اس لیے جاتے ہو کہ کوئی فتنہ کھڑا کیا جائے اور کاؤنٹ کے ساتھ یاری گانٹھو........ ہائے میرا دل!...... تم فتنہ پرداز ہو!

چبوکوف: کیا؟ میں فتنہ پرداز؟ (چلا کر) زبان کو لگام دو!

لوموف: فتنہ پرداز!

چبوکوف: بزدل! کمینہ!

لوموف: بوڑھا چوہا! افترا پرداز!

چبوکوف: زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ بٹیر کی طرح گولی سے اڑا دوں گا۔ جاہل کہیں کا!

لوموف: ہر شخص جانتا ہے......... آہ، میرا دل!......... کہ تمہاری بیوی تمہیں پیٹا کرتی تھی.......

ہائے میری ٹانگ....... میری پیشانی...... آنکھیں..... میں گر پڑوں گا! گر پڑوں گا!

چبوکوف: اور تم اپنے گھر کی منتظمہ سے لرزاں ہو!

لوموف: آہ، آہ، آہ! میرا دل پھٹ گیا۔ شانہ بے حس ہو گیا ہے ـــــ میرے شانے کو کیا ہو گیا ہے؟

میں مر رہا ہوں (ایک کرسی پر گر پڑتا ہے) ڈاکٹر!

چبوکوف: کمینہ بزدل! جاہل! میں بے ہوش ہو رہا ہوں! (پانی پیتا ہے) بے ہوش!

نتالیا: تم بھی اچھے شکاری ہو! تمہیں گھوڑے پر سوار ہونا نہیں آتا (اپنے باپ سے) ابا اسے کیا ہو گیا ہے؟

ابا! ذرا ادھر دیکھو ابا (چیخ مارتی ہے) ایفان! وہ مر گیا ہے!

چبوکوف: میں غش کھایا چاہتا ہوں! سانس نہیں آتا! ذرا ہوا چھوڑو!

نتالیا: وہ مر گیا ہے (لوموف کو آستین سے پکڑ کر ہلاتی ہے) ایفان! ایفان! ہائے ہم نے کیا کر دیا! وہ مر گیا ہے! کرسی پر گر پڑتی ہے، ڈاکٹر! ڈاکٹر! (غش کھاتی ہے)

چبوکوف: اف! یہ کیا؟ کیا چاہتی ہو تم؟

نتالیا: (روتی آواز میں) وہ مر گیا ہے! مر گیا ہے!

چبوکوف: کون مر گیا ہے؟ (لوموف کی طرف دیکھ کر) واقعی مر گیا ہے! میرے مرشد! پانی، ڈاکٹر! (پانی کا گلاس لوموف کے لبوں کے ساتھ لگا کر) پیو....... نہیں، وہ نہیں پیتا۔ تو پھر وہ واقعی مر گیا ہے اور علی ہذا القیاس۔ یہ دیکھنا میرے نصیب میں لکھا تھا! میں اپنے دماغ کو گولی سے کیوں نہیں اڑا دیتا؟ اپنا گلا کیوں نہیں کاٹ لیتا؟ آخر میں انتظار کس چیز کا کر رہا ہوں؟ مجھے چاقو دو! پستول دو! (لوموف حرکت کرتا ہے) سنبھل رہا ہے....... تھوڑا سا پانی پی لو۔ بس ٹھیک ہے۔

لوموف: شعلے ـــــ چکر ـــــ میں کہاں ہوں؟

چبوکوف: تم جلدی سے شادی کر لو ـــــــ اور جہنم میں جاؤ! وہ رضامند ہے (لوموف اور اپنی بیٹی کا ہاتھ ملا دیتا ہے) وہ تمہیں منظور کرتی ہے اور علی ہذا القیاس۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔

صرف مجھے امن سے زندگی گزارنے دو۔

لوموف: ہیں؟ کیا؟ (اُٹھ کر) کون؟

چبوکوف: وہ تمہیں منظور کرتی ہے۔ خیر! اب ایک دوسرے کا بوسہ لو اور .... جہنم میں جاؤ! اور علی ہذاالقیاس۔

نٹالیا: (رونی آواز میں) وہ زندہ ہے! ہاں ہاں مجھے منظور ہے۔

چبوکوف: بوسہ لو!

لوموف: کس کا؟ (نٹالیا کا بوسہ لیتا ہے) میں بہت خوش ہوں! معاف کرنا بات کیا ہے؟ ہاں، میں سمجھا! ضعفِ قلب .... چکر ...... نٹالیا میں خوش ہوں (اس کا ہاتھ چومتا ہے) میری ٹانگ سو رہی ہے!

نٹالیا: میں .... مین بھی خوش ہوں۔

چبوکوف: میرے دل سے یہ بات اتری! اُف!

نٹالیا: مگر .... تمہیں پھر بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمہارا ٹریکر ہمارے بیکر سے اچھا نہیں ہے۔

لوموف: وہ اچھا ہے!

نٹالیا: بُرا ہے!

چبوکوف: یہ ہے گھر کی مسرت کا آغاز! شمپین

لوموف: وہ بہتر ہے!

نٹالیا: وہ نہیں ہے! نہیں ہے! نہیں ہے!

چبوکوف: (ان دونوں کے شور کو دبانے کی خاطر) شمپین، شمپین!

(پردہ)

☆☆☆☆☆

تماشا گاہِ نفس

اس تمثیل کے مصنف نکولائے ایوری نوف کی بہت کم تصانیف انگریزی میں منتقل ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے افکار ہندوستان کی حدود میں ابھی تک داخل نہیں ہوئے۔ ایوری نوف، جیسا کہ مسٹر کرسٹوفر سینٹ جان (مترجم تماشا گاہِ نفس) اپنے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں ''گو نوجوان ہے اور خود کو ابھی مبتدی خیال کرتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ فنِ تمثیل نگاری میں دستگاہِ وافی رکھتا ہے۔ اُس کی ذکاوتِ طبع قابلِ رشک ہے۔'' ـــــــ مترجم کی یہ رائے بڑی حد تک درست ہے۔ ''تماشا گاہِ نفس'' ایوری نوف کی جدت پسند ذکاوت طبع کا شاہد ہے۔ گو آغاز میں یہ تمثیل خشک ہے مگر اس میں کلام نہیں کہ مصنف نے نہایت فن کاری سے اپنے پیش نظر مقصد کو نبھایا ہے۔ یہ ڈراما ہمیں چیخوف کے مشہور مطائبات ''نسبت''[1] اور ''ریچھ''[2] کی یاد دلاتا ہے۔ یعنی اس میں چیخوف ـــــــ ''نسبت'' والے چیخوف کا رنگ جھلکیاں دکھاتا ہے۔

شروع شروع میں جب ''تماشا گاہِ نفس'' طبع ہو کر عوام کے سامنے آیا تو اکثر یورپی نقادوں نے اسے سٹیج کے ناقابل قرار دیا مگر اب یہ ڈراما انگریزی سٹیج پر نہایت کامیابی سے کھیلا جا چکا ہے۔

اگر قارئین نے ایوری نوف کی اس تمثیل کو پسند کیا تو ہم کوشش کریں گے کہ اس کے دیگر افکار فراہم کرنے کے بعد انہیں اردو کے لباس میں پیش کریں۔ (مترجم)

افرادِ تمثیل:

۱۔ پروفیسر
۲۔ (۱ رُوح کا ناطق وجود (Rational entity of the Soul)
۳۔ (۲ رُوح کا جذباتی وجود (Emotional entity of the Soul)
۴۔ (۳ رُوح کا صمدی وجود (Sublimal entity of the Soul)
۵۔ ب ۱ بیوی کے متعلق (۱ کا خیال
۶۔ ب ۲ بیوی کے متعلق (۲ کا خیال
۷۔ ر ۱ رقاصہ کے متعلق (۱ کا خیال
۸۔ ر ۲ رقاصہ کے متعلق (۲ کا خیال
۹۔ قلی

تمام واردات روح کے اندر صرف ایک لمحے کے عرصے میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔

تمہید

(پروفیسر سٹیج کے ایک بازو سے نمودار ہوتا ہے اور تختہء سیاہ کے سامنے ٹھہر کر حاضرین کو آداب بجا لاتا ہے۔ پھر چاک کی ڈلی پکڑ کر اپنا لیکچر شروع کر دیتا ہے)

پروفیسر: حضرات! آج سے کچھ ہفتے پیشتر ''تماشا گاہِ نفس'' کے غیر معروف مصنف میرے پاس اپنی اس تمثیل کا مسودہ لائے جو ابھی آپ کے سامنے سٹیج ہونے والی ہے۔ اُس وقت اس کے عنوان نے میری توجہ کو کچھ زیادہ جذب نہ کیا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ تمثیل بھی دیگر ہیجانی ڈراموں ایسی ہوگی جو عام طور پر ہماری سٹیج کو مرغوب ہیں ——— مگر اس کے اولیں مطالعے ہی سے مجھے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار تعجب ہوا کہ ''تماشا گاہِ نفس'' فی الواقع ایک سائنٹیفک پارۂ صنعت ہے جو نفسیاتی علمِ موجودات (Psycho physiology) کے جدید انکشافات و نظریات کے دوش بدوش کھڑا نظر آتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہوگا ونڈٹ، فرائیڈ، تھیوفل ری بت اور دیگر سائنس دان حضرات کی تحقیقات نے قطعی طور پر یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ رُوح غیر منقسم نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ کئی ذاتوں کا مجموعہ ہے جو فطرت میں ایک دوسرے سے متخالف ہیں۔ مثال کے طورر پر اگر (۱ مجھے

فرض کرلیا جائے (وہ تختہ ءسیاہ پر لکھتا ہے)

ل = (۱ + (۲ + (۳ = آدمی

اس کے یہ معنی ہوئے کہ روح تین وجودوں یعنی (۱، (۲، (۳ کا اجتماع ہے۔ (۱ ناطق وجود ہے۔ دوسرے الفاظ میں ادراک، (۲ جذباتی وجود ہے جسے ہم احساس بھی کہتے ہیں۔ (۳ نفسی یا سرمدی ذات ہے ——— میرے خیال میں اب یہ واضح ہوگیا ہے ——— یہ تین ''ذاتیں'' مل کر ''تمام وجود'' کو بناتی ہیں۔

(وہ یہ لکھتا ہے:- (۱ + (۲ + (۳ = تمام آدمی)

آپ غالباً مجھ سے یہ دریافت فرمائیں گے کہ یہ ہر سہ جزوی عناصر جن سے ''آدمیت'' کی تکمیل ہوتی ہے انسانی جسم کے کس حصے میں واقع ہیں۔ زمانہ ءقدیم کی روایت کے مطابق یہ جگر میں واقع ہیں۔

مگر ''تماشا گاہِ نفس'' کے مصنف کا خیال ہے جو میرے خیال میں بڑی حد تک درست ہے کہ رُوح سینے کے اُس حصے کے اندر نہاں ہے جہاں لوگ، اس وقت جب انہیں اپنے ایمان ویقین کی تاکید مقصود ہوتی ہے، ہاتھ مار کر عموماً اس قسم کے جملے کہا کرتے ہیں: ''میری روح کو سخت تکلیف پہنچی ہے'' یا ''میری روح کو بہت مسرت حاصل ہوئی ہے'' یا ''میری روح آتش غیظ میں جل رہی ہے۔'' ——— چنانچہ انسانی روح کا منظر ہمارے خیال میں کچھ اس طرح کا ہوسکتا ہے:-

(وہ مختلف رنگ کے چاک کی ڈلیوں سے تختہ ءسیاہ پر ایک نقشہ بناتا ہے اور اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے)

معزز حاضرین! یہ نقشہ، جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں ایک بڑے دل کے مشابہ ہے۔ یہ ایک منٹ میں ۵۵ سے ۱۲۵ مرتبہ تک دھڑکتا ہے اور دونوں پھیپھڑوں کے درمیان واقع ہے جو ایک منٹ میں چودہ یا پندرہ دفعہ سانس لیتے ہیں ——— اس جگہ آپ رگوں کا ایک جال سا بُنا دیکھ رہے ہیں۔ رگوں کے یہ تاگے زرد رنگ کے ہیں۔ انہیں ہم ٹیلیفون فرض کریں گے ——— الغرض یہ ہے وہ منظر جہاں یہ ڈراما کھیلا جائے گا۔ مگر حضرات! سائنس نہ صرف کسی چیز کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے بلکہ ہمیں جمعیت خاطر بھی بخشتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ ''مجھ سے احمقانہ حرکت سرزد ہوگئی ہے۔'' بلکہ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اُن تین ''ذاتوں'' میں سے اس

احمقانہ حرکت کا کون ذمہ دار ہے۔ اگر غلطی کا ذمہ دار (۲یعنی جذباتی وجود ہے تو کوئی تر دد کی بات نہیں۔ اگر نفسی یعنی صمدی وجود قابلِ الزام ہے تو بھی معاملے کو زیادہ اہمیت نہ دینی چاہیے لیکن اگر ناطق وجود سے اس غلطی کا ارتکاب ہوا ہے تو معاملہ واقعی بہت اہم ہے —— اب میں اپنا بیان یہاں بند کرتا ہوں مجھے اُمید ہے کہ آپ کی ناقدانہ نگاہیں مصنف کی اس قابلِ قدر تمثیل کے متعلق اچھی رائے مرتب کریں گی۔

(پروفیسر چلا جاتا ہے)

[تختہء سیاہ سٹیج سے ہٹا لیا جاتا ہے۔ پردہ اُٹھتا ہے، رُوح کا اندرونی حصہ ظاہر ہوتا ہے (جس کا نقشہ پروفیسر نے تختہء سیاہ پر کھینچا تھا) تین ''ذاتیں'' نمودار ہوتی ہیں جو شکل وشباہت میں ایک دوسری سے بہت مطابقت رکھتی ہیں۔ تینوں نے سیاہ کپڑے پہن رکھے ہیں مگر ان کی قطع میں فرق ہوتا ہے۔ (۱ ایک لمبے چغے میں، (۲ آرٹسٹ کی پوشاک پہنے اور سرخ ٹائی لگائے ہوتا ہے اور (۳ سالخوردہ، سفری لباس میں ہوتا ہے۔ اُن کے سراپا میں بھی یہ تخالف ہوتا ہے:- (۱ کے چہرے سے سنجیدگی ومتانت ٹپکتی ہے، وہ چشمہ لگائے ہوتا ہے۔ اُس کے بال نیم سفید اور نیم سیاہ ہوتے ہیں —— (۲ کی طبیعت میں چستی اور چالاکی پائی جاتی ہے۔ اُس کی حرکات میں تیزی اور جوانی ہوتی ہے۔ اُس کے لب بھرے ہوئے اور سُرخ ہوتے ہیں۔ (۳ چہرے پر سیاہ نقاب ڈالے ہوتا ہے۔ وہ پس منظر میں خستہ و ماندہ مسافر کی طرح اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا ہے]

(۲: (ٹیلیفون پکڑ کر) ہلو! کیا؟...... میری بات نہیں سُن رہے ہو؟ میں کافی بلند آواز سے بول رہا ہوں —— کیا؟ —— تمہارے کانوں میں گونج پیدا ہو رہی ہے؟ —— یہ صرف تمہارے اعصاب کی کمزوری کا باعث ہے —— لو اب سنو —— برانڈی، کیا سُن رہے ہو نا؟ —— برانڈی!

(۱: یہ واضح رہے کہ تم اُسے تیسری بوتل خالی کرنے پر صرف اس لیے آمادہ کر رہے ہو کہ تمہیں کسی نہ کسی طرح اپنا وقت کاٹنا ہے —— بے چارہ دل! دیکھو تو وہ کس طرح دھڑک رہا ہے۔

(۲: تم تو اسے ہمیشہ غشی کی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو —— یہ بھی عجیب زندگی ہے!

(۱: اگر حضرتِ دل اسی رفتار سے دھڑکتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ عنقریب خاموش ہو جائیں

گے۔

۲: پھر کیا ہے؟ ——— آخر کسی نہ کسی روز اُسے خاموش ہونا ہے۔

۱: یہ تو تم میرے الفاظ دُہرا رہے ہو۔

۲: کیوں نہ دہراؤں؟ بعض اوقات تم عقل کی بات بھی کہہ دیا کرتے ہو۔

۱: دیکھو، اعصاب کو نہ چھیڑو۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ

[ہر بار جب اعصاب کو چھیڑا جاتا ہے تو ان میں سے ایک جھنکار کی سی آواز پیدا ہوتی ہے]

۲: (خشم آلود ہو کر) کہہ چکے ہو ——— کس سے کہہ چکے ہو؟ تم نے کس حق کی بنا پر کہا ہے؟ ——— وہ کون ہوتا ہے جو نوکروں کی طرح مجھ سے احکام منوائے؟ ——— میں شاعر ہوں! ——— محبت، جذبات ———یہ ہوں میں! میرے بغیر یہ دُنیا مٹی کا ایک ڈھیر ہوتی ——— ایک قبرستان!! ——— دنیا کی موجودات کی جذبات کے بغیر کچھ بھی حقیقت نہ ہوتی۔

۱: تم جاہلوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔

۲: یہ درست ہے مگر بتاؤ تو اگر ہم مے نوشی کرتے ہیں تو یہ کس کا قصور ہے؟

۱: تمہارا تو ہو نہیں سکتا جو ہر وقت شراب، شراب کی رٹ لگائے رکھتا ہے؟

۲: اگر میں شراب کی خواہش کرتا ہوں تو کیا یہ خواہش، مجبوری کا نتیجہ نہیں ہے؟...... کیا اس کا باعث تمہاری صحبت نہیں ہے۔ جس میں ہم لوگوں کے لیے سوائے اپنا گلا گھونٹ لینے کے اور کچھ نہیں رکھا ہے؟

۱: دیکھو میاں، ذرا انصاف سے کام لو۔ یہ تمھیں بہ خوبی معلوم ہے کہ اُس بے چارے کی بد بختیوں کا میں ذمہ دار نہیں ہوں بلکہ خود تم ہو ——— ہاں تم جذباتی نفس! ——— تم خودغرض مند ہو ——— ایک تباہ شدہ انسان!! ——— کیا تم نے کبھی مطالعے میں دلچسپی لی ہے؟ کیا تم نے کبھی خوداری اور عقل کا کام کرنے کی کوشش کی ہے؟ کیا تم نے کبھی اخلاقی بلندی کے مسئلے پر غور کیا ہے؟

۲: تم محض فضیلت فروش ہو ——— ایک خشک کتابی کیڑے!

۱: میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔

۲: میں بھی تم سے اسی قدر متنفر ہوں۔

[۲ اعصاب پر زور سے ہاتھ مارتا ہے]

۱: ہاتھ ہٹالو ——— تم میرے اعصاب کو نہیں چھو سکتے۔

۲: تمھیں یہ کہنے کا کیونکر حق حاصل ہے؟ ——— یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ اعصاب ہم دونوں کی یکساں ملکیت ہیں ——— میں اپنے اعصاب کو ہاتھ لگا رہا ہوں نہ کہ تمہارے اعصاب کو ——— ہم دونوں کے اعصاب قریب قریب ہونے سے تم ایک عنایت مجھ پر ضرور کرتے ہو کہ میرے اعصاب بھی اکثر اوقات بالکل مردہ ہو جاتے ہیں اور میں بیل کی طرح بیوقوف بن جاتا ہوں ——— اُسی قدر بے وقوف جس قدر کہ تم خود ہو ——— تم مجھے اُن کو چھونے سے باز نہیں رکھ سکتے ہو۔ میں اُن میں تناؤ اور کشیدگی پسند کرتا ہوں۔ اس طرح وہ اپالو کا تنبورا بن جاتے ہیں جس پر میں محبت اور آزادی کا راگ الاپ سکتا ہوں۔ (وہ اعصاب کو چھیڑتا ہے۔ دل زیادہ تیزی سے دھڑکنا شروع کر دیتا ہے) ——— برانڈی!

۱: (۲ کے ہاتھ سے ٹیلیفون چھین کر) شربت!

۲: (ٹیلیفون اپنے قبضے میں لے کر) برانڈی!

۱: (۲ سے پھر ٹیلیفون چھین کر) شربت! ——— کیا سن نہیں رہے؟ ——— کیا؟ ——— ختم ہو گیا ہے؟ ——— تو پھر بھاگ کر عطار کی دکان پر جاؤ! شربت ——— گلاس بھر کے! (ٹیلیفون چھوڑ دیتا ہے۔ دونوں سٹیج پر اِدھر اُدھر چلنے کے بعد پھر ہم کلام ہوتے ہیں) اب طبیعت میں سکون آیا کیا؟

۲: تم کون ہو؟

۱: خود دیکھ لو۔

(دونوں تحت الشعور وجود (Subconscious Entity) کے قریب جاتے ہیں، چند لمحے خاموشی طاری رہتی ہے)

۲: یہ کون ہے؟

۱: سکوتِ اعظم! ——— ہمیشہ کی طرح خاموش۔ اس کے سکون میں خلل نہ ڈالو۔ اگر تم نے ایسی حرکت کی تو خیال رہے یہ تمہارے ہی حق میں بری ثابت ہوگی (ٹیلیفون پکڑ کر) کیا تم پی چکے ہو؟

——— اچھا، تو اب میں کوشش کرتا ہوں کہ اسے راہ راست پر لاؤں۔ مگر قصہ یہ ہے کہ میں ابھی تک اصل معاملے کو اچھی طرح سمجھنے نہیں پایا........ ایک عورت کی ذکاوت نے تمھیں مسحور کر لیا ہے .... یہی ہے نا؟ .... مگر اتنی سی چیز کے لیے اپنی عورت اور بچوں کو ٹھکرا دینا .... معاف کرنا، مگر یہ کوئی حل نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم کثیرالازواجی کا دامن تھام لیں جو دراصل جنگلیوں کا مطمحِ نظر ہے۔ یعنی ٹانگ اور کمر کی ساخت پر غور کرنا اور ایک غیر فانی معبد کے حسنِ تعمیر کو نظر انداز کر دینا——— میرا مطلب رُوح سے ہے........

۲: ہوں......... تمہارے عقاید و خیالات کی مجھے کیا پروا ہے........ وہ خوبصورت ہے——— پھر اس بحث کی ضرورت؟

۱: وحشی حیوان یقیناً نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتا ہے مگر انسان........ جسے احساس کی منطق سے آشنا ہونا سزاوار ہے .... (ٹیلیفون کا رُخ کرتا ہے)

۲: توبہ! تم کس قدر پاگل اور احمق ہو......... تم ایسے روکھے اور خشک مزاج ساتھی کی صحبت میں مجھے کس قدر اذیت سہنا پڑتی ہے۔

۱: آج سے قبل تم ایسی باتیں نہیں کیا کرتے تھے!

۲: تم سچ کہہ رہے ہو، جب ہم دونوں ایک ساتھ خوش اسلوبی سے کام کیا کرتے تھے تو میں واقعی تم سے محبت کرتا تھا——— میں تمہاری وہ خدمات ہرگز فراموش نہیں کر سکتا جو تم نے میرے لیے اس وقت سرانجام دی تھیں جب کہ میں ایلینے کی محبت میں گھلا جا رہا تھا۔ اس محتاط لڑکی کو پھانسنے اور اس کے والدین کو آمادہ کرنے میں تم نے واقعی بہت مدد دی....... اس وقت تم نے خوب جوہر دکھائے۔ مگر اب کچھ عرصے سے تم نہ صرف کم عقل ہوتے جا رہے ہو بلکہ زنگ آلود استرے کے مانند کند ہو گئے ہو۔

۱: اس نوازش کا شکریہ! میں واقعی حسّاس نہیں ہوں مگر مجھے یہ بخوبی معلوم ہے کہ اس رائے کے مرتب کرنے میں برانڈی کا بیش از بیش حصہ ہے۔

۲: آہ میرے اللہ! وہ کس قدر حسین ہے!!——— تم یہ ضرور بھول گئے ہو کہ وہ حسین ہے ——— ہاں، مجھے معلوم ہے کہ وہ قہوہ خانے کی ایک معمولی رقاصہ ہے مگر اس سے کیا مطلب؟ ——— تم اُس کے حسین چہرے اور گداز جسم کو پیشِ نظر نہیں رکھ رہے ہو........ آؤ میں تمہیں

یہ حسینہ دکھاؤں۔ (سٹیج کے داہنے بازو سے ''ر(ا'' کو بلاتا ہے)، گا!۔۔۔۔۔ اسی انداز سے گا جیسے تو کل، پرسوں، پچھلے ہفتے ۔۔۔۔۔ گذشتہ اتوار کو گائی تھی ۔۔۔۔۔ گا! ۔۔۔۔۔ دیکھ میں التجا کر رہا ہوں ((ا سے مخاطب ہو کر جو اُس عورت کا سایہ دیکھ کر اس کی طرف۔ پشت کر لیتا ہے) آہ! تم اس میں میرا ساتھ کیوں نہیں دیتے۔

(''رقاصہ (ا'' ۔۔۔۔۔ وہ گاتی ہے اور دل کی دھڑکن کی تال کے ساتھ رقص کرتی ہے جو فرطِ مسرت کے باعث زور زور سے دھڑک رہا ہے)

کیا یہ تم ہو؟
کیا یہ تم ہو؟
کیا تم وہی شکیل نوجوان ہو ۔۔۔۔۔
جو کل شب میری آغوش کے قریب تھا ۔۔۔۔۔
ٹرین کی تاریکی میں میرے اس قدر نزدیک تھا۔
میں اس وقت تمہیں دیکھ نہ سکی تھی ۔۔۔۔۔
ٹرین میں بہت اندھیرا تھا!
مگر تمہارے دیدار کے لیے میری نظریں بیتاب ہیں
کیا تم وہی ہو؟
کیا تم وہی ہو؟
جسے میرے شیریں بوسوں نے
محبت کا دیوانہ بنا دیا ہے!
کل شب ٹرین میں،
میرے پاس ایک نوجوان بیٹھا تھا،
میں اس کی طرف دیکھنے کے لیے مُڑی
اسی وقت روشنی گل ہو گئی،
میرے دیوانے ہم سفر نے اپنے آپ کو میری گود میں گرا دیا۔
میں نے اُسے پُر از شوق بوسے دیے، چھاتی سے بھینچ لیا ۔۔۔۔۔ مگر اُس دن سے

میں اس کی تلاش میں پھرا کی ہوں

میں ہر راہ گزر کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں —— پوچھتی ہوں

کیا تم ہی وہ ہو؟

کیا تم ہی وہ ہو؟

کیا وہ نوجوان تم ہی ہو، جو کل شب میری آغوش کے قریب تھا؟

ٹرین کی تاریکی میں میرے اس قدر نزدیک تھا۔''

۲: (مسحور ہو کر) آہ، وجدانِ محبت! —— تمام کائنات اس سُرور، اس کیف کے آگے ہیچ ہے!! یہ باہیں، یہ پیر! —— میرے خدا اس بھری دنیا میں ایسا کون سا قالین ہے جوان پیروں کے لیے اپنا سینہ پیش کر سکتا ہے؟........ وہ اس قدر دلفریب ہیں کہ میری آنکھوں میں آنسو لے آتے ہیں........ مجھ پر ناچو! میرے اندر ناچو! اور ناچتی رہو........ (اُس کے پیروں اور ہاتھوں سے لپٹ کر پیار کرتا ہے)

۱: یہ دیوانگی ہے، جہالت ہے!! اسے چھوڑ دو —— یہ محض تخیل کی کارفرمائیاں ہیں۔ وہ فی الواقع ایسی نہیں جیسی تم سمجھ رہے ہو۔ تم غازہ لگے ہوئے چہرے کو چوم رہے ہو، مصنوعی بالوں سے پیار کر رہے ہو —— اُس کی عمر چالیس سے کیا کم ہوگی۔ جو کچھ بھی تم دیکھ رہے ہو محض فریبِ نظر ہے۔ اُسے دیکھنا ہے تو حقیقت کا مشاہدہ کرو (۱ کی گفتگو شروع ہونے پر رقاصہ نمبر ایک غائب ہو جاتی ہے۔ ۱ رقاصہ نمبر ۲ کو بلاتا ہے جس کی شکل بڑھاپے کی وجہ سے بدنما ہو رہی ہے) دیکھو، اگر تم حقیقت دیکھنا چاہتے ہو تو اسے ایک نظر ہی دیکھو! —— اُن ملکوتی پیروں کی طرف نگاہ کرو —— وہ کتنے کھردرے اور سخت ہیں! شاندار سر دیکھو —— کہاں گئے اس کی زلفوں کے وہ پیچ و خم! (رقاصہ کے سر سے اُس کے مصنوعی بال اُتار کر اس کے گنجے سر کی نمائش کراتا ہے) دانتوں کی یہ ستاروں ایسی لڑیاں نکال دو! (رقاصہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے مصنوعی دانت منہ سے نکال دیتی ہے) —— اب گاؤ!

(وہ ناک میں نہایت ہی کن سُرے لہجے میں گاتی ہے اور اس طرح پاؤں اُٹھا کر ناچتی ہے جیسے کسی عمر رسیدہ گھوڑی کو قصاب خانے کی طرف لے جایا جا رہا ہو)

۲: نہیں نہیں، یہ حقیقت نہیں ہے —— یہ اصلیت نہیں ہے (رقاصہ نمبر ۲ سے مخاطب ہو

کر) ''بھاگ جاؤ، نظروں سے غائب ہو جاؤ''، (اسے زبردستی دھکے دے کر بھگانا چاہتا ہے)

ا: کیا خفا ہو گئے ـــــ تو پھر تمہیں اپنی غلطی کا اعتراف ہے نا؟

۲: مجھے کسی چیز کا اعتراف نہیں ہے۔ تم نے ضرور کوئی نہ کوئی چالاکی کی ہے ـــــ

ا: تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ جس عورت پر تم اس بُری طرح سے لٹو ہوئے جا رہے ہو وہ اُس عورت کی جوتیاں صاف کرنے کے قابل بھی نہیں ہے، جسے تم دھوکا دینا اور ٹھکرا دینا چاہتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر اس کی وجہ؟ (وہ سٹیج کے داہنے بازو سے ''بیوی نمبر ایک' ب ۱ کو بلاتا ہے۔ وہ بچے کو کھلا رہی ہے) شاید اس لیے کہ اُس کا سلوک تمہارے ساتھ ہمیشہ اچھا رہا ہے؟ ـــــ یا اس لیے کہ اُس نے تمہارے بچے کو پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے؟ ـــــ مجھے تسلیم ہے کہ وہ تمہاری قہوہ خانے کی رقاصہ کی طرح گا نہیں سکتی مگر سنو! اگر تمہارے کان پاک آواز کو سُن سکتے ہیں تو وہ لوری سُنو، جو تمہارے بچے کو سلانے کی خاطر دی جا رہی ہے۔ آہ! وہ متواتر تین راتوں سے اس طرح گاتی رہی ہے ـــــ راتیں جو تمہارے انتظار کی درد آفریں گھڑیاں گنتے اُس کی آنکھوں میں کٹی ہیں (ب ۱ مدھم آواز میں لوری گاتی ہے)

سو جا، میرے ننھے سو جا!\
میری جان، درد ابھی غائب ہو جائے گا\
صبر کر! ـــــ کیا کہہ رہا ہے؟\
''ابا! ـــــ میرے ابا کہاں ہیں''؟\
میرے لال، تیرے ابا ابھی تیرے پاس آ جائیں گے\
انہیں بہت کام کرنا پڑتا ہے، میرے پیارے!\
مگر وہ ابھی تیرے لیے ایک اچھا سا کھلونا لے کر آئیں گے۔\
لکڑی کا گھوڑا ـــــ کیا تو اُسے پسند نہیں کرے گا؟\
لے اب خوش ہو جا ـــــ لکڑی کا گھوڑا، تیری سواری کے لیے!\
سو جا! میرے ننھے سو جا!

۲: بس، بس، اب مذاق حد سے گزر چکا ہے۔ اس میں سچائی کا شائبہ تک موجود نہیں ـــــ یہ سب من گھڑت ہے۔ (وہ بڑے زور سے 'ب ۱'' کو دھکا دیتا ہے) جاؤ، جاؤ، یہاں سے دُور ہو

جاؤ ــــــ تمہارا یہ تصور حقیقت میں وہ رنگ روپ نہیں رکھتا جو تم ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اُس نے میری تمام زندگی کو مسموم بنا رکھا ہے۔ وہ شعریت سے خالی ہے۔ مسرت اور جذبات اُس میں ذرہ بھر موجود نہیں۔ وہ نثر کے مرادف ہے ــــــ بے لطف نثر کے مانند! ازلی گرہستن ــــــ یہ ہے حقیقت میں وہ عورت!

(وہ ''ب۲'' کو بلاتا ہے۔ ایک معمولی پھوہڑ عورت آتی ہے۔ اس کے پریشان بال نہایت بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے ہیں وہ ایک غلیظ کرتا پہنے ہوتی ہے جس پر چائے کے داغ پڑے ہوتے ہیں۔ یہ کُرتا چھاتی سے کھلا ہوتا ہے)

ب۲: (ترش روئی سے) یہ بھی عجیب زندگی ہے! ــــــ کاش میرے والدین کو صرف یہ خبر ہوتی کہ میں اس حیوان کے پلے بندھ کر کیسی عذاب بھری زندگی بسر کر رہی ہوں! مجھے تو یہ تعجب ہے کہ ایسے شرابی کو دفتر سے دھکے مار کر باہر کیوں نہیں نکال دیا جاتا ــــــ بغیر شراب پیے اس کا مجہول دماغ کام ہی نہیں کر سکتا ــــــ میرے اس خاوند نے میری گود میں بچے ڈال کر نہایت کرم فرمائی کی ہے، مگر آپ ہے کہ ان عورتوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے جو بچے جننے کے قابل نہیں ہیں اور اگر جنتی ہیں تو انہیں اپنے جسم کی دلکشی کی بھینٹ چڑھا دیتی ہیں۔ میرا آدمی فنونِ لطیفہ کا دلدادہ ہے، یعنی تھیٹر کا ــــــ تھیٹر بھی وہ جو ایک غلیظ قہوہ خانے میں واقع ہے۔ یہاں وہ عصمت باختہ عورتوں کے ساتھ، جن کے چہرے غازے کی تہوں کے نیچے چھپے ہوتے ہیں، کھلم کھلا شراب نوشی کر سکتا ہے ــــــ اُن عورتوں کے ساتھ، جن کو میں چھونا تک پسند نہیں کرتی۔ مجھے یقین ہے کہ کسی روز وہ گھر آئے گا اور اپنے بچوں کو زہر دے دے گا ــــــ ذلیل دہریہ، جو مقدس صلیب کے آگے جھکنے سے منکر ہے ــــــ گو اوّل درجے کا بے وقوف ہے مگر فلسفیانہ باتیں ضرور کرے گا! ــــــ جب دیکھو آزادی، شہری کے فرائض اور اسی قسم کی دیگر فضولیات کا راگ الاپتا رہتا ہے ــــ آزادی! ــــ آزادی! اس لیے کہ وہ اسے اور بھی حیوان بنا دے ــــــ ٹھہر تو سہی پہلے میں تو تجھے آزاد کر دوں۔

ا۲: درست، بالکل درست! یہ ہے اس ڈرامے کی اصل ہیروئن ــــــ یہی ہے وہ عورت جسے میں اُس ملکوتی ہستی کی خاطر چھوڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جس نے میری زندگی میں افسوں پھونک دیا ہے اور جو اس بھیانک دنیا میں میرے زندہ رہنے کا باعث ہے۔

[یہ کہتے ہوئے وہ ''رقاصہ نمبرا'' کو بلاتا ہے۔ وہ ناچتی ہے اور گاتی ہے اور ''ب۲'' کو سٹیج کے اندھیرے کونے میں دھکیلتی جاتی ہے مگر اسے بھی اب پیچھے ہٹنا پڑتا ہے چونکہ ''ب ا'' نفرت کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے]

ب ۱: (رقاصہ نمبرا سے) جاؤ، دیکھو میں التجا کر رہی ہوں، جاؤ۔ تمہارا یہاں کوئی حق نہیں ہے۔

ا۱: واقعی کوئی حق نہیں ہے، وہ درست کہتی ہے!

ب ۱: جب تم اُس سے محبت نہیں کرتی ہو، جب تم اس کے لیے چھوٹی سے چھوٹی قربانی نہیں کر سکتی ہو ـــــ جب تم اپنی زندگی میں ایسے کئی آدمیوں کی آشنا رہی ہو ـــــ تو اُسے چھوڑ دو ـــــ اگر تمہارے دل میں نسوانیت ابھی تک مردہ نہیں ہوئی تو خدا کے لیے اس کا خیال چھوڑ دو ـــــ مجھے اس کی محبت اور اس مدد کی ضرورت ہے۔ آہ! اُسے مجھ سے علیحدہ نہ کرو، اُسے اُن لوگوں سے چھیننے کی کوشش نہ کرو جنہیں وہ عزیز ہے............

ر ۱: (ہنسی اڑاتے ہوئے اُس کی بات کاٹ کر) میں اس قسم کی باتیں سننے کی عادی ہوں۔ میں انہیں بہت مرتبہ سُن چکی ہوں ـــــ یہ بالکل بے معنی ہیں۔

ب ۱: جاؤ، سُنتی ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں۔ جاؤ! مجھے اس طرح نہ دھکیلو۔

ر ۱: اچھا، خیر سے اب تم مجھے دھمکانے بھی لگی ہو! ـــــ کیا میں پوچھ سکتی ہوں یہ دھمکیاں کیوں؟ تم مجھ سے متنفر کیوں ہو؟ ـــــ کیا اس لیے کہ میری ٹانگیں خوبصورت ہیں اور میرا بدن گدرایا ہوا ہے ـــــ یا اس لیے کہ میرے الفاظ پرندوں کی طرح پرواز کرتے ہیں اور شیمپین کی بوتلوں کے ڈاٹ کی طرح اچھلتے ہیں؟

ا۲: شاباش! شاباش!!

ب ۱: تمہیں اگر خواہش ہے تو صرف اُس کی دولت کی، اے بازار میں بکنے والی لونڈی!

ر ۱: کیا کہا؟ میں بازار میں بکنے والی لونڈی ہوں، تو بتا تو کیا ہے؟ کیا اس شخص سے شادی کرتے وقت تو نے اپنے آپ کو اس کے ہاتھ فروخت نہیں کیا تھا؟ ـــــ اپنے الفاظ کو واپس لے ـــــ میں کہہ رہی ہوں فوراً واپس لے لو ورنہ.........

(وہ حملہ کرنے کے لیے ''ب ۱'' کی طرف بڑھتی ہے)

ب ۱: تمہیں یہاں سے جانا ہوگا! ـــــ تمہیں یہاں سے جانا ہوگا!!

[دونوں ایک دوسرے سے الجھ پڑتی ہیں اور لڑنا شروع کر دیتی ہیں۔ مضطرب دل اُن کی لڑائی کے دوران میں شور کے ساتھ دھڑکتا رہتا ہے۔ وہ دونوں تھوڑی دیر کے لیے سٹیج کے ایک تاریک کونے میں غائب رہ کر پھر ظاہر ہوتی ہیں۔ اب اُن کا غصہ زیادہ تیزی پر ہوتا ہے۔ "م ب ۱" دانتوں سے "رقاصہ نمبرا" کے بال پکڑے ہوتی ہے۔ مگر انجام کار میدان رقاصہ کے ہاتھ رہتا ہے۔ تھوڑی دیر کی مڈبھیڑ کے بعد سٹیج پر "م ب ۱"، "ر ۱" کے نیچے دبی ہوئی نظر آتی ہے۔ "م ب ۱" اپنے آپ کو چھڑا کر روتی ہوئی بھاگ جاتی ہے۔ "ل ۲" اور "ر ۱" ظفر مندانہ قہقہے بلند کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر "ل ۱" رقاصہ کے کانوں پر تھپڑ مارتا ہے جس پر وہ چابک کھائی ہوئی کتیا کی طرح چلاتی ہوئی سٹیج کی پشت کی طرف بھاگ جاتی ہے۔ یہ منظر "ل ۲" کو غصے سے دیوانہ بنا دیتا ہے وہ بپھرا ہوا بڑھتا ہے اور "ل ۱" کا گلا گھونٹ دیتا ہے ـــــ دل ایک لمحے کے لیے ساکت ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ اس کا دشمن مر گیا ہے "ل ۲" اپنے آپ کو رقاصہ کے قدموں پر گرا دیتا ہے]

ل ۲: آ، اے میری ملکہ آ! ـــــ پیاری اب تم میری ہو ـــــ صرف میری ہو، ہمیشہ کے لیے میری ہو ـــــ میری زندگی، میری مسرت، میری محبت! ـــــ آ، میرے پاس آ!!

ر ۱: نہیں، بیوقوف انسان نہیں! ـــــ آہ، نہیں!! یہ سب مذاق تھا۔ سب سے پہلے روپے، پھر محبت کا تذکرہ، مگر جیسا کہ میں دیکھ رہی ہوں یہاں روپے سے محبت زیادہ مقدار میں ہے ـــــ اور روپیہ آئے گا بھی کہاں سے؟ ـــــ نہیں، نہیں، نہیں! میں تیری نہیں ہو سکتی! ـــــ میرے بھولے عاشق یہ سب مذاق تھا.........

(وہ چلی جاتی ہے)

["ل ۲" مغموم و متعجب کھڑا رہتا ہے........ موسیقی کی دل خراش و پریشان کُن آواز کے ساتھ "م ب ۱" ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی مغموم آنکھوں سے "ل ۲" کی طرف دیکھتی ہے۔ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ آیا وہ اپنے بچے کو کھلا رہی ہے یا "ل ۲" کو لعن طعن کر رہی ہے]

ل ۲: (ٹیلیفون کو دیوانہ وار پکڑتے ہوئے) جلدی، بس اب جلدی کرو! سب معاملہ درہم برہم ہو چکا ہے۔ اب میرے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا ـــــ میں تباہی کے کنارے پہنچ چکا ہوں۔ میں التجا کرتا ہوں کہ اب جلدی کرو۔ پستول داہنے ہاتھ کی جیب میں ہے ـــــ جلدی، آہ جلدی کرو! مجھ پر یقین کرو بالکل تکلیف نہیں ہوگی ـــــ چوتھی اور پانچویں پسلی کے درمیان رکھ کر لبلبی دبا

دو؟ـــــــ کیا؟ـــــــ تم ڈرتے ہو؟ـــــــ مگر سوال ہے ڈر کس کا؟ـــــــ یہ تمام معاملہ صرف ایک لمحے میں ختم ہو جائے گاـــــــ لو اب جلدی کرو!

[تھوڑا سا توقف جس کے دوران میں ''۳'' دفعتاً جاگ کر اپنے گرد و پیش پریشان نظروں سے دیکھتا ہے۔ اسی اثنا میں ایک زبردست دھماکے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز روح کی گہرائیوں میں گونجتی ہے۔ دل میں ایک بڑا سا شگاف ہو جاتا ہے، جس سے خون کی دھار بہنا شروع ہو جاتی ہے۔ ''۲'' درد و کرب میں پیچ و تاب کھاتا ہوا دل کے خون میں غرق ہو جاتا ہے۔ دل ساکت ہو جاتا ہے۔ پھیپھڑے سانس لینا بند کر دیتے ہیں ـــــــ ایک وقفہ ـــــــ ''۳'' کانپتا ہے اور انگڑائی لیتا ہے۔ ایک قلی ہاتھ میں لالٹین پکڑے اندر داخل ہوتا ہے]

قلی: ''سب لوگوں کا گاؤں'' آ گیا ہے۔ حضور کو یہاں سے گاڑی تبدیل کرنی ہے۔

۳: شکریہ!ـــــــ مجھے گاڑی یہیں سے بدلنی ہے۔

[وہ ٹوپی پہن کر اور اپنا سفری بیگ پکڑ کر قلی کے ساتھ گاڑی سے اتر جاتا ہے]

(پردہ)

☆☆☆☆☆

حاشیہ:

۱، ۲: یہ دونوں ایک ایکٹ کے ڈرامے راقم ترجمہ کر چکا ہے۔

نظمیں:

روسی

1. پیاری ہے مجھے (ویلری برسوف)
2. بوسے سے انکار (میکوف)
3. طلوع (میکوف)
4. حقیقت (ٹالسٹائی)
5. راہبہ (لیفلیف)
6. آزادی (طومانسکی)
7. تمنا (سرمنطوف)
8. قیدی (لیئرمنطوف)
9. خنجر (لیئرمنطوف)
10. تمنا (پشکن)
11. تمنا (کریمیلیف)

پیاری ہے مجھے

تیری سنہری آنکھوں کی چمک پیاری ہے مجھے
جس نے میرے خیالات کی تاریک دنیا کو منور کر دیا
تبسم جو تیرے ہونٹوں پر کھیلتا ہے، پیارا ہے مجھے
جس نے مجھے شراب کی طرح آگ لگادی۔ میری شبِ سیاہ کے دامن کو تار تار کر دیا
تیرے بوسوں میں پنہاں سمِ قاتل، پیارا ہے مجھے!
تمام خیالات، تمام خواب تیرے بوسوں سے زہر آلود ہیں
کٹاری جو تیری ہم آغوشی میں گایا کرتی ہے ——— پیاری ہے مجھے!
میرے گزشتہ سالوں کو تو نے اسی اوزار سے کاٹ ڈالا ہے
تیری خوفناک محبت کی آگ۔ پیاری ہے مجھے!
میں نے اس کے شعلوں کو خوشی خوشی اپنے گرد لپیٹ لیا
تیری روح کی تاریکی، وہ بھی پیاری ہے مجھے!
اس لیے کہ اس کے بازو مجھ پر پھیلے ہوئے تھے
پیارا ہے وہ سب کچھ جو تو نے مجھے عطا کیا اور پیارا ہے وہ بھی جس سے تو نے انکار کر دیا
خوف اور غم دینے پر بھی، تو پیاری ہے مجھے!
اس لیے کہ میں تیری محبت میں خلد تک جا پہنچا

☆☆☆☆☆

بوسے سے انکار

میں تیرا بوسہ تو لے لوں سچے عاشق ——
مگر ڈر ہے، کہیں چاند سازش نہ کرے!
ننھے تارے بھی ہمیں دیکھ رہے ہیں ——
کہیں ان میں سے کوئی ٹوٹ کر نیلگوں سمندر میں نہ گر پڑے!
اور سب راز کہہ دے
سمندر اس راز سے چپّوؤں کو آگاہ کردے گا
اور چپّو یہ راز اُس ماہی گیر کے کانوں تک پہنچا دیں گے
ماہی گیر —— جس سے میری آئی کو محبت ہے
جب میری آئی کو اس کا پتا چل گیا
تو تمام قرب و جوار میں یہ بات عام ہو جائے گی!
کہ چاند کی روشنی میں باغ کے اندر ——
میں نے شوق سے تمہیں کس طرح چُوما!
جب سیب کا سیمیں درخت ——
ہم دونوں پر اپنی پتیاں نچھاور کر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

طلوع

ایوانِ قدرت پر دھندلی روشنی نمودار ہوئی
نسیم سحری نئی تازگی سے اٹھکیلیاں کرنے لگی ——
قدرت کی نیند ہلکی اور بیقرار ہوگئی
سورج نمودار ہو! —— رات کا آخری خواب پرواز کرگیا
رات بیدار ہوئی —— آنکھیں ملتی ہوئی
اور مسکرادی!

☆☆☆☆☆

حقیقت

اس پر کبھی یقین نہ کرنا!
اگر میں ہجومِ غم میں گنگناتا سُنا جاؤں ——— کہ
میری محبت ختم ہو چکی ہے
جب سمندر کی لہریں ساحل کو چُوم کر واپس جا رہی ہوں ——— تو
اس خیال کو ہرگز دل میں جگہ نہ دینا، کہ سمندر بے وفا ہے!
وہ پھر آئے گا اور ساحل سے اُسی طرح محبت کرے گا
سابقہ محبت کے نقوش کی یاد سے معمور،
میں اب بھی تیری یاد سے غافل نہیں!
میں پھر ایک دفعہ اپنی آزادی تیرے حوالے کر دوں گا!
جس طرح لہریں اپنے محبوب ساحل کی قدم بوسی کے لیے،
بہت دُور جا کر پھر واپس مڑ آتی ہیں

☆☆☆☆☆

راہبہ

نہیں! ـــــ نہیں! ـــــ میں یقین نہیں کر سکتا!

چھوڑ دو ـــــ بھول جاؤ!

روحانی راحت، ترکِ دُنیا اور دعاؤں کے ذکر کو

نہیں! ـــــ نہیں! ـــــ میں یقین نہیں کر سکتا!

کہ یہ لطیف جسم ـــــ

یہ سینہ ـــــ یہ گردن ـــــ یہ اعضا جن میں زندگی سانس لے رہی ہے

کسی خانقاہ کے اندھیرے غار میں قید ہو جائیں گے

تمہیں خود اس پر یقین نہیں!

تمہارے الفاظ، تمہاری نگاہیں چغلیاں کھا رہی ہیں

ارمان بھری آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں

☆☆☆☆☆

آزادی

کل دوپہر میں نے قفس کا دروازہ کھولا ـــــــ
اور قیدی کو رہا کر دیا
جنگل کی گود پھر مغنیہ سے بھر دی ـــــــ اور
مغنیہ کی گود اس کی کھوئی آزادی سے!
وہ بہت اونچی اڑی
دن کی روشنی میں آنکھوں سے اوجھل ہوگئی!
اُڑتے وقت گیت گاتی گئی، گاتی گئی!
گویا مجھے دعائیں دے رہی تھی

☆☆☆☆☆

تمنّا

میں تنہاسُو نے بازاروں میں سے گزرتا ہوں
دُھند میں پتھروں سے کوٹی ہوئی سڑک چمکتی ہے
رات خاموش ہے! —— خلایادِ خُدا میں محو ہے
ستارے آپس میں متکلم کرنوں کے ذریعے باتیں کرتے ہیں

آسمان پر ایک عظیم الشان جلال نورافشاں ہے
زمین لاجوردی روشنی میں لپٹی ہوئی سورہی ہے
میرے دل میں درد کیوں اٹھ رہا ہے؟ میں اس قدر مضطرب کیوں ہوں؟
مجھے کس کا انتظار ہے؟ —— میں آج رات کس کے غم میں پُھنکا جارہا ہوں؟

زندگی سے اب کسی چیز کی اُمید رکھنا عبث ہے
ماضی پر رونا لاحاصل!
میں صرف آرام وسکون کا متلاشی ہوں، درد کی دوا چاہتا ہوں
پھر میں تمام چیزوں کو بھول کر نیند میں آرام حاصل کرسکوں گا
وہ نیند نہیں جو قبر کی آغوش پیش کرتی ہے ——
میں سالہاسال تک اس طرح پڑا رہنا چاہتا ہوں

کہ میرے سینے میں قوتِ زندگی
نرم و نازک لہروں کے کھیلنے کی صورت میں بیدار ہو

کانوں میں شب و روز
ایک شیریں آواز محبت کا غیر مختتم گیت گائے
اور میرے اوپر سیاہ بلوط کی سبز ٹہنیاں
آپس میں سرگوشیاں کریں!

☆☆☆☆☆

فرانسیسی

☆ ہیوگو کے اشعار

۱۔ جلاوطنوں کا بحری گیت

۲۔ جلاوطنوں کی دُعا

۳۔ گیت

۴۔ خدا پر بھروسہ رکھو

☆ وِکٹر ہیوگو کی چند نظمیں

۵۔ اگر میرے اشعار کے پر ہوتے

۶۔ محبت

۷۔ لوری

۸۔ نقاب کشائی

۹۔ عوام کا تحمل

۱۰۔ آنسو (پال ورلین)

۱۱۔ ایک گیت (گوئٹے)

قیدی

زنداں کی کھڑکی کے پاس خاموش بیٹھا۔آہنی سلاخوں میں سے جھانک کر نیلے آسماں کا نظارہ کر رہا ہوں

سقف نیلوفری کے تلے آزاد پرندے سیاہ دھبوں کی صورت میں کھیل رہے ہیں

ان کی پرواز دیکھ کر میرے شرمسار دل میں ایک درد اٹھتا ہے

لیکن میرے گناہگار لب کبھی پابند دعا نہیں ہوتے ——— اور نہ کبھی میں اپنی محبوبہ کی تعریف میں کوئی گیت گاتا ہوں

یہاں صرف گزشتہ جنگوں اور پرانے معرکوں کا خیال آتا ہے

——— اپنی بھاری تلوار اور پرانی زرہ بکتر کا

اب میں سنگین زرہ بکتر میں تصویر یاس بنا بیٹھا ہوں

میرا ——— ایک سنگین کلاہ میں جکڑا ہوا ہے ——— نیزے اور تلوار کے حملے سے بچنے کیلیے

بغیر چابک اور ایڑ کے میرا گھوڑا جادۂ حیات پر گامزن ہے

وقت میرا گھوڑا ہے ——— برق رفتار و گریز پا اسپ!

یہ سردزنداں ہے، میرے آہنی کلاہ کی نقاب!

زنداں کی دیواریں میری سنگین زرہ بکتر! ———

آہنی دروازوں میں مقید منتظر ہوں

اے گریز پا وقت، اپنی رفتار تیز کر دے

اس نئی زرہ بکتر میں بے ہوش ہو رہا ہوں ——— دم گھٹا جا رہا ہے،

جب میں اس گھوڑے سے نیچے اتروں گا تو موت اس کی رکاب تھامے ہوگی ———

اور چہرے سے یہ نقاب اُٹھ جائے گی!!

☆☆☆☆☆

خنجر

مجھے تجھ سے محبت ہے ـــــ اے میرے آہنی خنجر!
اے میرے رفیق ـــــ سرد اور چمکیلے!
غمناک جدائی کے موقع پر
جب دستِ نازک نے تجھے بطور تحفہ پیش کیا
صرف اسی وقت خون کی سرخ بوندوں کی بجائے
تیری دھار پر چمکتا ہوا آنسو ـــــ الفت کا بے بہا موتی نظر آیا
مجھ پر جمی ہوئی شرمگیں آنکھیں
ایک پوشیدہ غم میں ڈوبی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں ـــــ
جیسے تیرا پھل شعلوں کی سرخ زبانوں سے کھیل رہا ہو ـــــ
وہ شعلے جو کبھی مغموم تاریکی سے نکل کر پھر بھڑک اٹھتے ہوں
محبت کے پیمان خاموش! ـــــ
غم آفریں زندگی کو خوشتر بنانے والے
ایک جہاں گرد کے لیے مشعلِ راہ!
روحانی قوت! ـــــ میں تجھے ہرگز دھوکا نہ دوں گا
بلکہ تیری طرح زندگی بسر کروں گا ـــــ اے میرے خنجر!!

☆☆☆☆☆

تمنّا

میں پُرشور بازاروں میں گھومتا ہوں
میں پُراز ہجوم معبدوں میں داخل ہوتا ہوں
میں نوجوانی کے خوابوں میں شریک ہوتا ہوں

میں کہتا ہوں، وقت بڑی سرعت سے گزر رہا ہے
ہمیں اس کا کچھ پتا نہیں چلتا —— جب تک ہم قبر میں نہ پہنچ جائیں
ہر ایک کے لیے وہ وقت قریب ہے ——

میں تنہا شاہِ بلوط کی طرف نگاہیں اٹھاتا ہوں ——
جنگل کے بوڑھے سردار کی طرف
اور خیال کرتا ہوں، وہ میری چہارروزہ زندگی میں زندہ رہے گا
میرے باپ کے وقت یہ زندہ تھا ——

میں بڑے پیار سے ننھے بچے کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہوں
اور چومتے ہوئے سوچتا ہوں —— . خدا حافظ!
میں اپنی جگہ تجھے دیے جا رہا ہوں
تم پھلو پھولو —— میرا وقت آ گیا!!

اس طرح، ہر روز، ہر لحہ —— میں غرقِ فکر رہتا ہوں

اپنے آنے والے انجام کے متعلق
قیاس لگاتا رہتا ہوں

آہ! قسمت کہاں پر مجھے موت کے حوالے کر دے گی؟
وطن سے باہر؟ میدانِ جنگ میں؟ سمندر کی گہرائیوں میں؟
یا ہمسایہ وادی، میرے سر دغبار کو اپنی آغوش میں لے لے گی؟

گو مجھے معلوم ہے کہ میرا کم حقیقت جسم، مُرجھا جائے گا
خواہ میری موت کسی جگہ واقع ہو
میں اپنے عزیز وطن کی مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہوں
یہ میری خواہش ہے

وہاں ——— . قبر کے دروازے پر
جوان زندگی کو کھیلنے دو!
بے پروا نیچر کو اپنے غیر فانی حسن سمیت مسکرانے دو!

☆☆☆☆☆

تمنّا

تپی ہوئی ہوا
شعلے اور شرر اُگل رہی ہے
ماندہ نیچر

مسحور نظر آتی ہے جیسے وہ سو رہی ہے
مخلوق، امید اور مسرت سے محروم
تھکاوٹ سے چُور چُور کھڑی ہے
سب منتظر ہیں ـــــ آسمان پر
رعد بدوش بادل چھا جاتے ہیں
لطیف بارش گرنا شروع ہوتی ہے

فضا ٹھنڈک اور خوشگواری اختیار کر لیتی ہے
وسیع نیچر سے ـــــ درد
خواب کی طرح پرواز کر جاتا ہے

آہ! اگر ہماری قوم کے مصائب
بارش کے ان چھینٹوں سے دُور ہو سکیں
یا ملت کے آنسوؤں کے طوفانی دھارے میں

☆☆☆☆☆

ہیوگو کے اشعار

فرانس کا مایہ ناز تمثیل نگار شاعر و مفکر وکٹر میری ہیوگو کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ اپنی لاثانی اور شہرۂ آفاق تصنیف ''مصیبت زدہ'' یعنی des miserables کی وجہ سے شہرت دوام حاصل کر چکا ہے۔

جس مسئلہ نے ہیوگو پر راتوں کی نیند حرام کر دی، جس قانون نے اس کے قلم کو اعجاز بخشا وہ سزائے موت کا خونی فتویٰ تھا۔ فرانسیسی کتاب قانون کے سیاہ ورق اور عوام کے غیر مختتم مصائب و نوائب سے متاثر ہو کر اس نے بہت سے اشعار لکھے اور بے شمار کتب تصنیف کیں جو نفسیاتی نقطہ نظر سے لاثانی تسلیم کی جاتی ہیں۔ ایسی تصانیف میں ''سرگزشت اسیر'' ہے اور ''نوترے دیم کا کبڑا'' نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

ہیوگو ناول نویس و تمثیل نگار ہونے کے علاوہ ایک فقید المثال شاعر بھی تھا۔ فرانس میں وہ پہلی مرتبہ ایک شاعر ہی کی حیثیت میں متعارف ہوا تھا جب کہ اس کی نظم نے اسے اقصائے مغرب میں مشہور کر دیا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں اس نے اپنی مختلف نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا، جس سے اس کی شہرت اکناف عالم میں پھیل گئی ——— ہیوگو کے اشعار طرز ادا کی دل آویزیوں اور موسیقی کو گوناگوں کیفیتوں کا مخزن ہیں۔ نظم میں قافیہ اور وزن کا التزام اس پر ختم ہے۔ الفاظ میں وہ لوچ اور ترنم ہے کہ روح بے اختیار وجد کرنے لگتی ہے۔ اس کے افکار در حقیقت ایک بین الملی المناک داستان ہیں جو قاری کے دماغ سے گزر کر اس کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔

ہیوگو کے قلم میں بلا کا اثر تھا اور وہ سیاسی معاملات میں بڑی دلیری سے حصہ لیا کرتا تھا، جس کی پاداش میں اسے بیس سال کے لیے جلا وطن کر دیا گیا۔ ایام جلا وطنی میں اس نے کئی ضخیم کتابیں سپرد قلم کیں، جو آج تک لوگوں کے لیے چراغ راہ کا کام دیتی ہیں۔

ہیوگو کی ایک دو کتابیں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔مگر اس کے اشعار کی طرف بہت کم احباب نے توجہ دی ہے حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کی شاعری کو ادب اردو سے متعارف کرایا جائے۔

میں نے ہیوگو کی ان نظموں کا جو اس نے ایام جلاوطنی میں لکھی تھیں اردو میں ترجمہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اس کی مرصع عبارت کی جملہ خوبیاں برقرار رہیں۔اگر آپ نے ان تراجم کو پسند فرمایا تو اشاعت آیندہ میں اس شاعر کے اور افکار پیش کرنے کی سعی کروں گا۔انشاءاللہ

جلاوطنوں کا بحری گیت

پیارے وطن الوداع!
لہریں ناچتی اور کودتی ہیں
پیارے وطن الوداع
نیلے آسمان!
الوداع ــــــ اے وہ سپید خطے جہاں رس بھرے انگور گرتے ہیں
سبز دیواروں پر سنہری خوشے دھوپ سینکتے ہیں
پیارے وطن الوداع!
میدان، وادی اور پہاڑی
پیارے وطن الوداع!
لہریں ناچتی اور کودتی ہیں
پیارے وطن الوداع!
نیلے آسمان!
الوداع ــــــ اس زرد جہاز سے ہمارا رشتہ ازدواج بندھ چکا ہے
مغموم آسمان تلے ہم تاریک لہروں پر ہل چلا رہے ہیں
پیارے وطن الوداع!

تو ہی ہماری آماجگاہ محبت ہے۔

پیارے وطن الوداع!

نیلے آسمان!

پیارے وطن الوداع!

لہریں ناچتی اور کودتی ہیں

پیارے وطن الوداع!

نیلے آسمان!

ہماری آنکھیں جن کے آنسو تمام چمک جذب کر لیتے ہیں

تاریک لہر کو کسی تاریک مقصد کے لیے چھوڑ دیتی ہیں

پیارے وطن الوداع!

ہمارے دلوں میں موت کے گجر کی آخری صدا ہے

پیارے وطن الوداع،

نیلے آسمان!

جلاوطنوں کی دُعا

آؤ دعا مانگیں ـــــــ آسمان کی طرف نگاہیں اٹھاؤ

اے خدا! تیری طرف ہماری نگاہیں اور بازو پھیلے ہوئے ہیں

تیرے پرستاروں کے آنسو اور ان کی زنجیریں

بہت غم افزا ہیں جو تیرا ''غم'' ہم کو عنایت کرتا ہے

ان لوگوں کو فخر ہے کہ وہ سراپا درد ہیں

آؤ ہم یہ سب کچھ جھیلیں ـــــــ جرم پرواز کر جائے گا

پرندے گزرتے ہیں ــــــ آہ ہماری جھونپڑیاں!
ہوائیں چلتی ہیں ــــــ آہ ہماری مائیں بہنیں
دن رات ماندہ زانوؤں کے بل دعائیں مانگتی ہیں
ہوائیں ہمارے مصائب ان کے گوش گزار کر دیتی ہیں
پرندے ہمارے دل کی محبت ان کی بصارت تک لے جاتے ہیں

ہمارے افکار تیری جانب بلند ہیں
اے خدا! تقدیر کا لکھا مٹا دے، ــــــ ہم ملتجی ہیں
فرانس کو اس کی عظمت رفتہ واپس بخش دے
جو شرمسار ہے! ہاں ہمیں ہلاک کر دے ــــــ ہم واژگوں بختوں کو
گرم دن صرف ہمیں سرد رات کی تکلیف کے حوالے کر دیتا ہے

آؤ ہم یہ سب کچھ جھیلیں ــــــ جرم پرواز کر جائے گا
پرندے گزرتے ہیں ــــــ آہ ہماری جھونپڑیاں!
ہوائیں چلتی ہیں ــــــ ہماری مائیں بہنیں
دن رات ماندہ زانوؤں کے بل دعائیں مانگتی ہیں
ہوائیں ہمارے مصائب ان کے گوش گزار کر دیتی ہیں
پرندے ہمارے دل کی محبت ان کی بصارت تک لے جاتے ہیں

جیسے ایک تیرانداز نشانے پر تیر لگاتا ہے
تند سورج اپنی آتشیں شعاعوں سے ہمیں چیرتا ہے
دن کی انتھک مشقت کے بعد ــــــ تاریک رات میں نیند سے محروم!
بخار ــــــ چمگادڑ جو دلدل سے پرواز بھرتا ہے
ہماری پیشانیوں پر خاموشی سے پھڑ پھڑاتا ہے

ہمیں اکڑا جاتا ہے ـــــــ

آؤ ہم یہ سب کچھ جھیلیں ـــــــ جرم پرواز کر جائے گا
پرندے گزرتے ہیں ـــــــ آہ ہماری جھونپڑیاں!
ہوائیں چلتی ہیں ـــــــ ہماری مائیں بہنیں
دن رات ماندہ زانوؤں کے بل دعائیں مانگتی ہیں
ہوائیں ہمارے مصائب ان کے گوش گزار کر دیتی ہیں
پرندے ہمارے دل کی محبت ان کی بصارت تک لے جاتے ہیں

پیاس! کم مقدار پانی ابلتا ہے
بھوک! ـــــــ سیاہ روٹی! کام! کام! ـــــــ اے ملعون کام!
کدال کی ہر ضرب کا جواب ایک وحشیانہ ہنسی کی صدا ہے
لو، زمین سے موت اگل آئی ہے

آؤ ہم یہ سب کچھ جھیلیں ـــــــ جرم پرواز کر جائے گا
پرندے گزرتے ہیں ـــــــ آہ ہماری جھونپڑیاں!
ہوائیں چلتی ہیں ـــــــ ہماری مائیں بہنیں
دن رات ماندہ زانوؤں کے بل دعائیں مانگتی ہیں
ہوائیں ہمارے مصائب ان کے گوش گزار کر دیتی ہیں
پرندے ہمارے دل کی محبت ان کی بصارت تک لے جاتے ہیں

کیا پروا ہے ـــــــ ہمیں کوئی رام نہیں کر سکتا
ہم دکھی ہیں ـــــــ مگر صابر
ہم خدا کا شکر بجا لاتے ہیں جس کے حضور میں ہماری دعا ـــــــ

شعلے کے مانند بھڑکتی ہے ـــــــ یہ آتش ہمارے مصائب کی عطا کردہ ہے
جب ہم جھیلنے کی قدرت رکھتے ہیں تو اذیت شرم نہیں رہتی

آؤ ہم یہ سب کچھ جھیلیں ـــــــ جرم پرواز کر جائے گا
پرندے گزرتے ہیں ـــــــ آہ ہماری جھونپڑیاں!
ہوائیں چلتی ہیں ـــــــ ہماری مائیں بہنیں
دن رات ماندہ زانوؤں کے بل دعائیں مانگتی ہیں
ہوائیں ہمارے مصائب ان کے گوش گزار کر دیتی ہیں
پرندے ہمارے دل کی محبت ان کی بصارت تک لے جاتے ہیں

دنیا میں جمہوریت زندہ رہے
رحمت ہو پراسرار شام پر
رحمت ہو ان مردہ لوگوں پر جو شیریں غفلت کے شکار ہوئے
رحمت ہو ناپیدا کنار سمندر پر
جو سسکیاں بھرتا ہے

آؤ ہم یہ سب کچھ جھیلیں ـــــــ جرم پرواز کر جائے گا
پرندے گزرتے ہیں ـــــــ آہ ہماری جھونپڑیاں!
ہوائیں چلتی ہیں ـــــــ ہماری مائیں بہنیں
دن رات ماندہ زانوؤں کے بل دعائیں مانگتی ہیں
ہوائیں ہمارے مصائب ان کے گوش گزار کر دیتی ہیں
پرندے ہمارے دل کی محبت ان کی بصارت تک لے جاتے ہیں

گیت

ایسا حسین لباس زیب تن کرنا ذرا تا خیر سے ہے
اے پھولوں کی ملکہ!
میدانوں سے گلاب اور خس کی جھاڑیاں لوٹ لی گئی ہیں
مگر یہ پرندے پھر وہاں نغمہ ریز ہیں
اس تابانی سے چمکنا ذرا تا خیر سے ہے
اے شام کے شفاف تارے!
طلوع رات کی ہر کرن کا تعاقب کر رہا ہے
مگر دن دور ہے
اس قدر پراز مسرت نظر آنا ذرا تا خیر سے ہے
اے میرے مجروح دل!
انبساط! ـــــ جب کہ تمام خوشی گزر چکی ہے
مگر موت شاد ماں ہے

خدا پر بھروسہ رکھو

ننھے بچے آج بھی بھروسہ رکھ! اور کل ـــــ !
گزشتہ دنوں پر ایمان لا ـــــ تاریکی گم ہو جائے گی
بھروسہ رکھ ـــــ اور ہر روز جب پہلی کرنیں طلوع کے سانس کو منور کرتی ہیں ـــــ
عبادت کے لیے جاگ
ہمارے گناہ ہمارے درد کے باعث ہیں
اے میرے بچے ـــــ !
شاید اگر تو کچھ دیر کیلیے اپنے زانوؤں پر گرا رہے

تو خدا طلوع اور تجھے اپنی رحمت میں لے کر
ہماری رات کو منور کر بنا دے

☆☆☆☆☆

وِکٹر ہیوگو کی چند نظمیں

ہیوگو کے اشعار طرزِ ادا کی دل آویزیوں اور موسیقی کی گونا گوں کیفیتوں کا مخزن ہیں۔ نظم میں قافیہ اور وزن کا التزام اُس پر ختم ہے۔ الفاظ میں وہ لوچ اور ترنم ہے کہ روح بے اختیار وجد کرنے لگتی ہے۔ اُس کے اشعار پڑھتے وقت قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ صفحہء قرطاس سے اُچھل کر اُس کے دِل میں اُتر گئے ہیں۔ مگر ہیوگو کی شاعری میں یہی ایک چیز نہیں۔ اُس کی شاعری اس سے بھی بہت بلند ہے۔ اُس کے جذبات وافکار میں پاکیزگی ہے، خلوص ہے، پائندگی ہے، رس ہے، گہرائیاں ہیں۔ وہ حُسن کو پاک نظروں سے دیکھتا ہے، محبت اُس کے نزدیک خدا کا قرب ہے——— یہی شاعری کی معراج کمال ہے اور اسی کمال نے اُسے اکنافِ عالم میں مشہور کر دیا۔ یہاں ہم قارئین کی خدمت میں اس باکمال غنائی شاعر کے کلام کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت اصل زبان کا لطف بڑی حد تک جاتا رہتا ہے مگر راقم نے مقدور بھر اُردو میں اصل کا اچھا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اگر میرے اشعار کے پَر ہوتے

میرا نازک وشیریں گیت
تیرے باغ میں اُڑ کر چلا جاتا ہے
اگر ابابیل کی طرح، جو اُڑتی ہے اور گاتی ہے———
ہاں! ابابیل کی طرح میرے راگ کے پر ہوتے

جب موسمِ گرما دُنیا سے رخصت ہو جاتا
تو میرے گیت تیرے درخشاں کاشانے کے گرد چکر کاٹتے
اگر میرے ناکام خیالات کی طرح
ہاں! تعبیر سے ناآشنا خوابوں کی طرح میرے راگ کے پر ہوتے

لوری

میں محافظ ہوں تیرا، کسی سے نہ ڈر، پھر سو جا!
فرشتے تیری بند پلکوں پر بوسوں کا مینہ برساتے ہیں
میں یہاں موجود ہوں کہ مبادا کوئی بُرا یا درد انگیز خواب تجھے مغموم کردے

تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیکھ کر طوفان گزر جاتا ہے
بادل چھٹ جاتے ہیں، ستارے نیلی قبا میں چمکتے ہیں
سنجیدہ رات، خوشگوار صبح میں تبدیل ہو جاتی ہے ——
تجھ سے پیار کرنے کے لیے

محبت

لوگ مجھ سے سوال کیا کرتے تھے —— ''محبت کیا ہے''؟
میں انہیں اپنی سمجھ کے مطابق مناسب جواب دے دیا کرتا تھا
مگر یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب میں خود محبت کے حقیقی معنوں سے بے خبر تھا
میرا دل برف کے مانند سرد تھا
اُس میں محبت کی ایک شعاع بھی نہ تھی

تجربات نے میرے پہلے خیال کو غلط ثابت کر دیا
آج میں خود لوگوں سے پوچھتا ہوں ——— ''محبت کیا چیز ہے؟''

میں ایک ایک سے دریافت کرتا ہوں ———
''میرے سینے میں یہ آگ کیوں سلگ رہی ہے؟
یہ کیسا ہاتھ ہے. جس کی نازک انگلیاں میرے کلیجے کو ہر وقت مسلتی رہتی ہیں؟
میں اندر ہی اندر کیوں پھنکا جا رہا ہوں؟
میرا دل شمع کی طرح کیوں پگھل رہا ہے''؟

میں جنوں کی حالت میں دریا کے کنارے چلا گیا ——— کہ شاید
اُس کی رقصاں لہروں کا نظارہ میرے قلبِ مضطرب کو تسکین دے سکے۔
ایک گوشے میں بیٹھا میں بڑبڑایا ——— ''محبت کیا چیز ہے؟''
ایک سال خوردہ بزرگ لاٹھی ٹیکتا ہوا اس طرف سے گزرا ———
اُس کا جسم کمزوری کے باعث لرز رہا تھا
اُس نے میری صدا سنی اور مسکرایا کر کہا
''محبت ایک فطری کمزوری ہے جو ہمیں اپنے ابوالآبا سے ورثے میں ملی ہے۔''

وہ چلا گیا ——— مگر اُس کا جواب مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ میں نے پھر بہ آوازِ بلند کہا
''محبت کیا چیز ہے؟''
ایک بوڑھی عورت کا ادھر سے گزر ہوا ——— اُس نے میری دردانگیز صدا سنی
اُس نے نمناک آنکھوں سے کہا
''محبت عہدِ شباب کا وہ شیریں خواب ہے جو منت کشِ تعبیر نہیں ——— خواب جس کی لذت
تمام عمر لوحِ دل سے محو نہیں ہوتی

یہ جواب بھی مجھے مطمئن نہ کر سکا
پھر وہی صدا میرے دل سے نکلی ـــــــ
''محبت کیا چیز ہے؟''
جواب میں ایک خوبصورت نوجوان یہ گاتا ہوا گزر گیا
''محبت قوت ہے، مسرت ہے، لذت ہے''

میں اپنے آوارہ خیالات کو یکجا کرنے نہ پایا تھا ـــــــ کہ ایک فلسفی میرے قریب آیا
وہ بغل میں ایک بھاری بھرکم کتاب دابے ہوئے تھا
بال بکھر رہے تھے ـــــــ اُس نے میری طرف غور سے دیکھا
میں نے اُس سے دریافت کیا ـــــــ ''محبت کیا چیز ہے؟''
اُس نے اپنی پیشانی کو شکن آلود کرتے ہوئے کہا
''محبت ـــــــ
محبت موت کی طرح انسانی قالب کی ماہیت تبدیل کر دینے والی چیز ہے۔''

اسی اثنا میں علمِ ہئیت کے ایک ماہر کا ادھر سے گزر ہوا
ہاتھ میں دُوربین تھی اور نگاہیں آسمان پر جم رہی تھیں ـــــــ میں نے پوچھا
''تمہارا ذہن آسمان تک کی خبر لاتا ہے، کیا تم یہ بتا سکتے ہو، محبت کیا چیز ہے؟''
بولا ''محبت وہ کشش ہے، جس کی وجہ سے ستارے آسمان پر اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔''

اس جواب سے بھی میں مطمئن نہ ہوا ـــــــ میں پھر اپنے خیال میں ڈوب گیا
اب پھر وہی سوال وردِ زبان تھا ـــــــ ''محبت کیا چیز ہے؟''
میری صدا ایک بچے نے سنی جو اپنی گیند اُچھالتا دوڑتا چلا آ رہا تھا
اُس نے جواب دیا ''محبت میری امی ہیں ـــــــ محبت میرے ابا ہیں ـــــــ ان
دونوں کے سوا اور کسی کے پاس محبت نہیں؟''

اس کم سن بچے کا جواب پُر معنی ضرور تھا مگر
محبت کے حقیقی معنی پھر بھی میری سمجھ میں نہ آئے
میں بار بار یہی پکارتا رہا ـــــــ ''محبت کیا چیز ہے؟'' ـــــــ ''محبت کیا چیز ہے؟''

شام کی تاریکی کاجل کی طرح برسنے لگی ـــــــ
پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں چلے گئے
دریا کا پانی ساکن ہوگیا ـــــــ لوگوں کی آمدورفت بند ہوگئی
لیکن میں بدستور وہیں بیٹھا اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا ـــــــ
''محبت کیا چیز ہے؟ ـــــــ محبت کیا چیز ہے؟''
یکایک میری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں ـــــــ
بادلوں میں سے کوئی جھانک کر کہہ رہا تھا
''محبت خدا ہے ـــــــ خدا محبت ہے!''
میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی ـــــــ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا
ہوش میں آنے پر میں نے لوگوں کو اپنے گرد گھیرا ڈالے ہوئے پایا ـــــــ
میں اُن سے کہہ رہا تھا
''محبت کرو اور خدا ہو جاؤ''

نقاب کشائی

اے موہوم سایو، تمہارے قاتل کون ہیں؟ ـــــــ بولو!
کس نے تمہارے سینے میں یہ مہلک خنجر گھونپ دیا ہے؟
اے زمانے کی سربلند ہستیو، اپنی مہرِ خاموشی توڑو!
اپنی تاریکی سے نکل کر حقیقت کی نقاب کشائی کرو!
تمہارا نام ـــــــ ؟

''مذہب''

اور تمہارا قاتل ـــــ ؟

''پادری''

تم تینوں، تمہارے نام؟

''سچائی، نیکی، ایمان ـــــ ''

تمہیں کس نے گرا کر موت کے حوالے کیا؟

''کلیسا نے''

اور تم اندھیرے میں کون ہو؟

''مجھے 'حقوق عوام' کے نام سے پکارتے ہیں''

اچھا بتاؤ تم کس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے؟

''حلفِ وفاداری کے ہاتھوں''

اور تم جو خون میں غرق ہو؟

''میرا نام 'عدل' تھا''

تمہیں کس نے ہلاک کیا؟

''منصف نے''

عوام کا تحمل

کتنی بار لوگوں نے کہا ہے ـــــ ''طاقت کیا ہے؟''

جو آج راج کرتا ہے کیا وہ کل تخت سے نہیں اتر جائے گا؟

ہر گھڑی عوام کے لیے نئی مصیبت کا پیغام لاتی ہے ـــــ مگر

وہ ایک عالی مزاج کی طرح ـــــ ظالم مگر عادل انجام کا انتظار کرتے ہیں

واقعات کی رفتار کا نتیجہ دیکھتے ہیں

اعتمادِ نفس نے انہیں قوتِ برداشت دے دی ہے
انتہائی طاقت رکھنے کے باوجود ہاتھ نہیں اٹھاتے ـــــــ
اپنی عطا کردہ طاقت سے مسلح ـــــــ
''فردِ واحد'' کو'' قوم'' کے خلاف بے سود کوشاں دیکھ کر ـــــــ
وہ اسے طاقت آزمائی کے لیے ڈھیل دے دیتے ہیں

آنسو

میرے دل میں آنسو ٹپک رہے ہیں
جیسے بارش ہو رہی ہو
یہ نقاہت سی کیا ہے
جو میرے دل میں رینگ رہی ہے؟

آہ! زمین اور چھتوں پر گرتی ہوئی
بارش کی نرم صدا!!
ماندہ دل کے لیے کتنا اثر رکھتی ہے!
آہ! بارش کی صدا!

آنسو بلاوجہ چھلکے جا رہے ہیں
اس دل میں جو خود بیدل ہے!
کیا یہ دغا نہیں ہے؟

دِل بلاوجہ محوِ گریہ وفغاں ہے
آہ! یہ کیسا عذاب ہے
کہ اس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی

ایک گیت

ہم آج ارضِ محبت میں ہیں!
کہاں چلیں؟
چلیں یا یہیں ٹھہرے رہیں ——
اور یا کشتی کھینا شروع کردیں، پیاری!

ہمارے ملاح عشق پیشہ نوجوان ہیں
ہمارے بادبان فاختاؤں کی چونچیں
ہمارے تختۂ جہاز زرِ خالص،
ہماری رسیاں جواں مرگ دوشیزہ کے بال،
ہم آج ارضِ محبت میں ہیں

ہم تمہیں کہاں لے چلیں، شیریں؟
اجنبیوں کے کھیتوں میں؟
اپنے وطن کے مرغزاروں میں؟
یا جہاں آتشیں پھول کھلتے ہیں

یا سپید کلیاں لہلہاتی ہیں؟
ہم آج ارضِ محبت میں ہیں!

☆☆☆☆☆

15 Adelphi Chamber
Clare Road
Bombay 8

نوادراتِ منٹو